زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی

...... پنجاب ......

ہرفرد اپنی ذات میں ایک معاشرہ ہے اور معاشرہ کسی بھی شعبے میں اہم اُمور سرانجام دینے والے فرد کو شخصیت سمجھتا ہے۔ جب شخصیت کا تنقیدی یا تقابلی جائزہ لیا جاتا ہے تو چند حقائق اور ترجیحات کو مدِنظر رکھنا ضروری ہوتا ہے کہ اس شخصیت نے کوئی ایسا کام سرانجام دیا ہے جس سے ملک اور قوم کا وقار بلند ہوا ہو۔ جی ہاں فخر زمان کا نام اعتماد اور فخر کے ساتھ لیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے اردو، انگریزی اور پنجابی زبان میں باوقار ادب تخلیق کرنے کے ساتھ پاکستان کے تمام نامور اہلِ قلم کو ساری دنیا میں متعارف کرانے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ وہ اس وقت بھی تن من دھن سے سرگرمِ عمل رہے جب اُن کی تین کتابوں پر بیک قلم جنبش پابندی لگا دی گئی اور یہ شاید پاکستان کی تاریخ کا واحد اور انوکھا واقعہ ہے کسی قلم کار کی تین کتابوں کو ایک ساتھ قابلِ گردن زدنی گردانا گیا ہو۔ اور یہ واقعہ بھی پاکستان کی تاریخ کا انوکھا اور نرالا واقعہ گردانا جائے گا کہ طویل پابندی کے بعد اعلیٰ عدلیہ نے طویل قانونی جنگ کے بعد ان کتابوں سے پابندی اٹھالی۔ اگر آپ فخر زمان اور اُن کی جدوجہد کو قریب سے جاننا چاہتے ہیں تو اُن کی تازہ کتاب ''پنجاب'' کا مطالعہ ضروری ہے کہ اس جدوجہد میں فخر زمان ہی نہیں پاکستان کا ادبی، سیاسی اور سماجی منظر نامہ موجود ہے۔

امجد علی بھٹی

اشاعت: ۲۰۱۶ء، قیمت: ۶۰۰ روپے، دستیابی: کلاسیک، دی مال، لاہور۔

...... نجم الحسن رضوی کے بہترین افسانے ......

آپ کی نہایت عمدہ کتاب ''انٹرنیٹ کیفے'' میں نے بڑے انہماک اور شوق سے پڑھی ہے۔ آپ کی بدولت اردو کہانی میں ایک نئے وقوعی ماحول اور اس کے عین مطابق ایک نہایت خوش گوار محاورے کا اثبات ہونے لگا ہے۔ آپ بہت اچھی کہانی لکھتے ہیں۔ واقعی بہت اچھی۔۔۔ جس کہانی کو بھی لیجیے آپ نے کہیں بھی اپنے آپ کو اُس پر حاوی نہیں ہونے دیا بلکہ کہانی کی Native Genius نے ہی اس میں دَم پھونکا ہے۔ اسی مفہوم میں نئے نقادوں کا اصرار بے جا نہیں کہ کہانیاں خود آپ ہی اپنے آپ کو لکھتی ہیں۔

جوگندر پال

یہ کتاب بجائے خود ایک تحفہ، ایک حیرت انگیز تخلیق لگی۔۔۔ کم از کم میری مطالعاتی حد تک یہ ایک بالکل نیا طلسم ہوش رُبا بن گئی ہے۔۔۔ اتنا جانتا ہوں کہ پڑھنے کو اُٹھائی تو ختم کیے چھوڑ نہ سکا۔

جمیل الدین عالی

اشاعت: ۲۰۱۶ء، قیمت: ۵۰۰ روپے، دستیابی: اکادمی بازیافت، اردو بازار، کراچی۔

...... آدھی شام ......

ڈاکٹر یوسف شاہد وسیع المطالعہ، کثیر الجہات تخلیقی اور تنقیدی رجحان رکھنے کے ساتھ متانت اور سنجیدگی جیسے اوصاف کا مظہر اور فلسفہ و منطق سے گہرا شغف رکھنے والی شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی منظومات کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ مجموعہ شاعری ہمارے تجسس کا باعث بنتا ہے کہ وہ خیال کو جامۂ الفاظ پہنانے پر پوری طرح قادر ہیں اور یہ وصفِ خاص کہ انتخابِ تراکیب میں ان کا ذوقِ جمال کار فرما دکھائی دیتا ہے جو ہمیں خوش کُن تحیّر میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ان کی آزاد نظموں میں تنوع اور ترفع اپنی جگہ قابلِ ذکر ہے لیکن وسعتِ نظر کی بدولت بیشتر نظمیں ان کے ذاتی تجربوں کی آئینہ دار ہیں، ان میں اسلامی تاریخ، قومی المیے اور ذاتی معاملات مہر و محبت کا فکر انگیز بیان جس میں اسلوب کی ندرت اور شعری صداقت کا چمن زار نظر کو فور وفور اور دلوں میں شبنم آسا ٹھنڈک پیدا کر کے ہمارے انفاس کو مہکا دیتا ہے۔ ان کی ہر نظم ایک مختصر افسانے کی طرح وحدتِ تاثر کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

حسن عسکری کاظمی

قیمت: ۲۵۰ روپے، دستیابی: Al-212، ویلنشیا ٹاؤن، لاہور۔

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۵،شمارہ:مئی،جون ۲۰۱۶ء

رابطہ:537/D-1 ،گلی نمبر18،ویسٹریج-III ،راولپنڈی،46000،پاکستان۔

فون:5462495,5490181-51-(92+)

فیکس:5550886-(92+)

موبائل:0558618-336-(92+)

ای۔میل:chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر:فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

سرِ ورق، پسِ ورق ------ شعیب حیدر زیدی
تزئین ------ عظمیٰ رشید
کمپوزنگ ------ تنویر الحق

☆

قرطاسِ اعزاز
طاہرہ اقبال
کے نام

''رنگ باتیں کریں''

محمودالحسن

(لاہور)

زندگی کی شب تاریک میں اپنی ہمت اور جہد سے اجالا کرنے والی طاہرہ اقبال ۲۰؍دسمبر ۱۹۶۰ء کو ضلع ساہیوال کی تحصیل چیچہ وطنی کے گاؤں میں پیدا ہوئیں۔ والد فیض اللہ خان زمیندار تھے۔ والدہ کا نام جمیلہ خاتون اور دو بھائیوں کی یہ اکلوتی بہن ہیں۔ آپ کی شادی ۱۹۹۲ء میں محمد اقبال اعوان سے ہوئی۔ اولاد میں صہیب مہروز (بیٹا) اور نریمان (بیٹی) اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ مڈل کے بعد تمام تعلیمی مدارج پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے طے کئے۔ ۱۹۸۳ء میں ایم اے اردو، اور ۱۹۸۵ء میں ایم اے اسلامیات کیا۔ ۱۹۸۶ء میں بی ایڈ کیا۔ ۲۰۰۷ء میں ''سعادت حسن منٹو کے افسانوں میں اسلوبیاتی تنوع'' کے عنوان سے مقالہ لکھ کر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ایم فل کی ڈگری حاصل کی۔ ازاں بعد ''پاکستانی اردو افسانہ تاریخی و سیاسی تناظر میں'' کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۸۷ء میں کریسنٹ کالج چیچہ وطنی سے تدریس کا آغاز کیا۔ پہلی بار کالج انہیں لیکچرار کی حیثیت سے دیکھنا نصیب ہوا۔ ۱۹۹۱ء سے گورنمنٹ کالج مدینہ ٹاؤن، فیصل آباد سے وابستہ ہیں۔ تدریس کے سوا قومی اخبارات میں کالم بھی لکھتی ہیں۔ یہ حوالے اپنی جگہ لیکن انہیں اپنی ذات کا سب سے معتبر و مستند حوالہ بطور فکشن نگار ہی لگتا ہے۔

افسانے

۱۔ سنگ بستہ، طاہرہ اقبال، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، اشاعت اوّل، ۱۹۹۹ء، دوم ۲۰۱۳ء

۲۔ گنجی بار، طاہرہ اقبال، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، اشاعت ۲۰۰۸ء

۳۔ ریخت، طاہرہ اقبال، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، اشاعت ۲۰۰۹ء

۴۔ زمیں رنگ، طاہرہ اقبال، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، اشاعت ۲۰۱۴ء بابائے اُردو مولوی عبدالحق (نیشنل ادبی ایوارڈ یافتہ)

۵۔ طاہرہ اقبال کے منتخب افسانے، عمیر منظر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی، اشاعت ۲۰۱۳ء

سفرنامہ

۱۔ نگیں گم گشتہ، طاہرہ اقبال، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، اشاعت ۲۰۱۲ء

ناول

۱۔ مٹی کی سانجھ، طاہرہ اقبال، اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، رئیس اعظم، اشاعت ۲۰۰۹ء

۲۔ گراں......زیرِ طبع

۳۔ نیلی بار......زیرِ طبع

تحقیق و تنقید
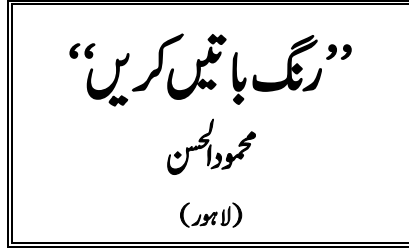
۱۔ منٹو کا اسلوب افسانوں کے حوالے سے، طاہرہ اقبال، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۲ء

۲۔ منٹو کا اسلوب افسانوں کے حوالے سے، طاہرہ اقبال، نئی دہلی: براؤن بک پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء

۳۔ پاکستانی اردو افسانہ سیاسی و تاریخی تناظر میں، طاہرہ اقبال، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۵ء

۴۔ کالم، حرف زار......زیرِ طبع

طاہرہ اقبال پر یونیورسٹیوں میں کیا گیا تحقیقی کام

۱۔ طاہرہ اقبال کے افسانوں میں دیہات کی پیش کش، تحقیقی مقالہ برائے ایم۔اے اُردو مقالہ نگار آصفہ ذوالفقار، نگران سعید احمد، جی سی یونیورسٹی فیصل آباد

۲۔ طاہرہ اقبال کے افسانوں میں عورت کا تصور ___ معاشرتی تناظر میں، تحقیقی مقالہ برائے ایم۔اے اُردو مقالہ نگار روبینہ فردوس، نگران ڈاکٹر روبینہ ترین، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان

۳۔ فہمیدہ ریاض، نیلم احمد بشیر اور طاہرہ اقبال کے افسانوں میں تانیثیت (تحقیقی و تنقیدی جائزہ) تحقیقی مقالہ برائے ایم۔فل اُردو مقالہ نگار فرح گل رائے، نگران جی سی یونیورسٹی فیصل آباد

۴۔ طاہرہ اقبال کی افسانوی نثر کا موضوعاتی اور اسلوبیاتی مطالعہ تحقیقی مقالہ برائے ایم۔فل اُردو مقالہ نگار محمد عابد بھٹی نگران پروفیسر لیاقت علی، دی اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاول پور

۵۔ طاہرہ اقبال کی ادبی خدمات، تحقیقی مقالہ برائے ایم۔فل اُردو مقالہ نگار آصفہ نسیم، نگران ڈاکٹر روبینہ ترین، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان

۶۔ طاہرہ اقبال کے افسانوں میں تہذیبی و ثقافتی عناصر، تحقیقی مقالہ برائے ایم۔فل اُردو مقالہ نگار محمد اشرف اعوان، یونیورسٹی آف سرگودھا

۷۔ علی گڑھ یونیورسٹی اور الہ آباد یونیورسٹی انڈیا میں میرے افسانوں پر کام کیا گیا ہے۔

۸۔ طاہرہ اقبال کے افسانوں میں نسوانی کرداروں کا نفسیاتی جائزہ، مقالہ نگار غلام رسول نگران ڈاکٹر عظمیٰ سلیم یونیورسٹی آف سرگودھا

۹۔ مٹی کی سانجھ کا فنی وفکری جائزہ، بی۔ایس اُردو سمن آباد کالج فار وویمن لاہور

۱۰۔ سنگ بستہ:فکری وفنی جائزہ،بی۔ایس اُردو سمن آباد کالج فار وویمن لاہور

۱۱۔ طاہرہ اقبال کے ناولٹس کا فکری و فنی جائزہ ،ایم فل علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

۱۲۔ طاہرہ اقبال کے افسانوں میں کردار نگاری،ایم فل نمل،اسلام آباد

۱۳۔ طاہرہ اقبال کا اسلوبِ بیان،ایم اے اُردو جی سی یونیورسٹی فیصل آباد

۱۴۔ ملکی و غیر ملکی یونیورسٹیوں میں پی ایچ ڈی اور ایم فل سطح پر افسانے پر ہونے والے مقالہ جات میں طاہرہ اقبال کا فن پر ابواب شامل ہیں۔

طاہرہ اقبال رہنمائی میں لکھے گئے مقالہ جات (ایم اے)

۱۔ شکیل اورنگ آبادی شخصیت وفن،مقالہ برائے ایم اے اُردو عمارہ

۲۔ مشتاق احمد یوسفی کی نثر میں ناسٹلجیا تحقیقی وتنقیدی مقالہ ایم۔اے اُردو رابعہ حمید،نگران طاہرہ اقبال

۳۔ ظفر اقبال کے شعری مجموعہ''اب تک'' کا تجزیاتی مطالعہ،مقالہ ایم۔اے اُردو صاعقہ عاکف نگران طاہرہ اقبال

ایم فل مقالہ جات

۱۔ اسد محمد خان کے افسانوں میں محروم طبقے کی عکاسی،بلقیس اختر، جی سی ڈبلیو یونیورسٹی فیصل آباد

۲۔ مستنصر حسین تارڑ کے ناولوں میں تاریخی عناصر،غلام زہرا

۳۔ رشید امجد کے افسانوں میں علامت نگاری،عشرت منظور

۴۔ وحید احمد،بطور نظم نگار،شائستہ قیصر

۵۔ مستنصر حسین تارڑ کے ناول خس وخاشاک زمانے ___ فکری وفنی جائزہ، نازیہ پروین

۶۔ حمید شاہد کے افسانوں کا فنی وفکری جائزہ

۷۔ یونس جاوید کے نسوانی کرداروں کا تجزیاتی مطالعہ

۸۔ سلیم آغا قزلباش کی فنی جہات

۹۔ افضل توصیف کی ادبی خدمات

۱۰۔ ظفر اقبال کے کالموں کی ادبی جہت

پی ایچ ڈی مقالہ جات

۱۔ وزیر آغا شناسی

۲۔ منشایاد کے فنِ افسانہ کا تجزیاتی مطالعہ

طاہرہ اقبال کے افسانوں کی تعداد ۳۰۰ سے زائد ہے اور مضامین کی تعداد بھی کم از کم ۵۰ ہے ۔ دو سال تک خبریں میں کالم نگاری کی اور تین سال روزنامہ جنگ میں کالم لکھے۔آج کل اُن کے کالم نئی بات میں ادبی صفحہ پر چھپ رہے ہیں۔طاہرہ نے تھوڑے عرصے کے لیے روزنامہ غریب فیصل آباد کے خواتین کے صفحہ کی بھی نگرانی کی۔اُن کے انٹرویوز روزنامہ پاکستان ،ایکسپریس اور نئی بات میں شائع ہو چکے ہیں۔شاعر بمبئی نے سپیشل نمبر بھی جاری کیا۔ان کا افسانوی مجموعہ''گنجی بار'' جی سی یونیورسٹی فیصل آباد میں ایم۔اے کے نصاب میں شامل رہا اور ان کی افسانوں کی کتاب''زمین رنگ'' کو پاکستان اکیڈمی ادبیات نے ۲۰۱۴ء کا بہترین کتاب کا قومی ادبی ایوارڈ بابائے اردو مولوی عبدالحق سے نوازا۔طاہرہ اقبال بہت سے ادبی سیمینارز اور کانفرنسز میں بھی شرکت کر چکی ہیں، جیسے سارک رائٹرز کانفرنس،منٹو کانفرنس وغیرہ۔

☆

''نیلی بار''

۔ناول کا ایک باب۔

طاہرہ اقبال

پولیٹیکل سائینس ڈیپارٹمنٹ کے سبھی سٹوڈنٹس کلاس میں انتہائی ریگولر ہو گئے تھے اتنے کہ دیگر شعبوں کے پروفیسروں کو یہ شکایت پیدا ہو چلی تھی کہ جب مس زارا فتح شیر کا پیریڈ شروع ہوتا ہے تو باقی کلاسیں خالی ہو جاتی ہیں۔ مس زارا فتح شیر اپنی دراز قامت میں مزید چھ انچ کی ہیل کا اضافہ کیے سروں کے اُوپر ہی اُوپر ملکہ مدھ مکھی سی جتھوں کو پیچھے اُڑائے لیے جاتی کہ قریبی ڈیپارٹمنٹس پر اُلّو پھر جاتا ہے۔

''سر! آپ بھی اپنا لیکچر تیار کر کے آیا کیجیے نا، سٹوڈنٹ تو لائق اُستاد کے لیکچر میں ہی جمع ہونا پسند کریں گے نا۔''

زارا فتح شیر کو انھی اساتذہ کا کولیگ ہونے کا اعزاز حاصل ہو چکا تھا جن کی کبھی وہ سٹوڈنٹ رہی تھی۔

''کاش لیکچر تیار کرتے وقت ہمیں بھی ایسی چمپئی رنگت، ایسی دراز قامت، ایسی برینڈڈ پوشاک، ایسی امپورٹڈ کار اور اُس پر مستزاد یورپ کی کسی اعلیٰ یونیورسٹی سے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری بھی میسر ہوتی!''

خوشامدی طنزیہ جملے اُڑاتے زارا کی سجائی ضیافت میں سب شریک ہو جاتے، کوفتے کباب چارٹ پکوڑے اس ڈیپارٹمنٹ میں کینٹین والا لڑکا آ تا جاتا رہتا۔

پولیٹیکل سائینس ڈیپارٹمنٹ کی سمت جانے والے رستوں کے دونوں اطراف طالب علموں کے ٹھٹھ جیسے ہار پھول اُٹھائے کسی مہمانِ خصوصی کا استقبال کرنے کو جمع ہوئے ہوں۔ قریبی کالجوں کے لڑکے بھی اپنی کلاسیں مس کر کے پولیٹیکل سائینس ڈیپارٹمنٹ کی بھیلی پر منڈلاتے رہتے۔ کوئی ٹانگ پھنسائے، کوئی پر دھنسائے ذرا ذرا اُڑان بھرتے، دھنسے پروں کی ساں ساں میں کلبلاتے اپنے ہی بدن کو ڈنگتے، شہد کا چھتہ قطرہ قطرہ ٹپکتا، پر جھنکارتی مکھیاں آپس میں ہی بھڑ جاتیں۔

اُونچی ہیل کے سینڈلز میں سے بنا چھلکے والے انڈے جیسی گول پیازی ایڑیاں جھلملاتیں۔۔۔ ہلکے شیڈز والے ارمانی کے چشمے، مارکس اینڈ سپینسر کے شولڈر بیگز، جدید فیشن والی برینڈڈ جینز اور کھلے کھلے کُرتے، مس زارا فلک شیر جہاں سے گزر جاتی تماشائیوں کی دیواریں کنکریٹ ہو جاتیں۔ لڑکے دھک دھک بجتے اور لڑکیاں ڈولتے دلوں پر ہاتھ رکھ رکھ اندر کی بھڑاس اِک دُوجی کے کانوں میں اُنڈیلتیں۔

''یہ مس زارا فتح شیر کبھی کوئی ڈریس ریپیٹ نہیں کرتیں تو کیا ان قیمتی ملبوسات کا اچار ڈالتی ہیں پھر۔۔۔ اگر یونیورسٹی کی لڑکیوں میں عنایت نہیں کر سکتیں تو آرٹ گیلری میں ان کی ماہانہ یا ہفتہ وار نمائش ہی لگا دیا کریں، چلیں جی بھر کر نظارہ ہی ہو جائے۔ اُنگلیوں سے مس کر کے ہی پہننے کا مزہ لے لیں، ورنہ یوں کترن کترن چپہ چپہ ذرا ذرا تو دیکھنے کی ہڑک کو مجرم بنا دیتا ہے۔ سارے ریشم، سارے برینڈز، ساری نفاستیں ساری کوالٹیز صرف انھی کے ذوقِ نظر کے لیے ہی بنائے جاتے ہیں۔ یہ برینڈ میکرز بھی کتنے بڑے سامراجی، جو سامراج کی تحدید کو نفاستوں اور قیمتوں میں پیک کر دیتے ہیں۔ عوام کے لیے شجرِ ممنوعہ ون پرسینٹ میں سے بھی پوائینٹ ٹو کے ذوق کی حفاظت۔ ان میں بند اعلیٰ و ارفع گھمنڈ خرید و بے پناہ دولت کے اصراف کی نفسیاتی تسکین۔

''جب ہماری حکومت آئے گی تو ہم سب سے پہلے دُنیا کو طبقوں اور اعلیٰ و ادنیٰ میں تقسیم کرنے والے ان برینڈز کا خاتمہ کر دیں گے۔ حاکموں اور سرمایہ داروں کے امتیازات ان کپڑوں، جوتوں، عینکوں، گھڑیوں کو ایسے ہی آگ لگا دیں گے جیسے کبھی کبھی مزدور مشتعل ہو کر ملوں اور فیکٹریوں کو خاکستر کر ڈالتے ہیں۔ خدا کی مخلوق کو امارت اور غربت اُونچے اور نیچے خانوں میں بانٹنے والے ان سائنز کو زیرِ زمین گاڑ دیں گے، جیسے اِن گراں قیمت برینڈز کے بچ رہے پچھلے سال کے ڈیزائنز کو خود یہ کمپنیاں زمین میں دفن کر دیتی ہیں، لیکن کلیرنس سیل نہیں لگاتیں کہ کوئی عامی انھیں پہن کر خواص کے پہننے اوڑھنے کی بے حرمتی نہ کر دے۔''

پولیٹیکل سائینس کی طالبات اپنے پرولتاری جذبات کو انقلابی لفظوں کے تڑنکے مار مار آسودہ کرتیں، جن کے والدین اُنھیں آئندہ پوری زندگی کسی کابک میں مقید کرنے کے لیے پریشان رہتے جہاں انڈے سہتے اور چوگا چگاتے جوڑوں گھٹنوں میں درد کی تڑاڑیں اُٹھنے لگیں گی اور یہ بڑے بڑے آدرش اور فلسفے کولہوں اور پیٹ کی چربی میں کہیں دفن ہو جائیں گے۔

''پالیٹکس بھی ایک سائینس ہے لیکن اس مُلک کی یہ سائینس بڑی ہی بے اصول اور بے ایمان ہے۔ پاگل اُونٹ جیسی جس کی اپنی کوئی کل سیدھی نہیں ہے جس کے دماغی عوارض اور عضوی بے ترتیبی نے پاکستانی معاشرے اور ریاست میں عجب ہڑبونگ کا کھیل کھیلا ہے۔ مست اُونٹ کی راہ میں آنے والے خس و خاشاک رُندتے چلے جاتے ہیں۔ برصغیر کی مٹی کا خمیر تابع فرمائی اور بلوائیت میں گندھا ہے۔ بار برداری والے جانوروں کی طرح جن کا مالک اُنھیں ہانک کر کہتا ہے۔ ''سیدھا گھر کو جا۔'' اور وہ پورا مال صحیح سالم زخمی پیٹھ پر لادے سیدھے گھر ہی پہنچتے ہیں یا پھر بوجھ سے نجات پانے کی خواہش میں ڈبکی لگا کر پیٹھ پر لدی روئی مزید بھاری کر لیتے ہیں۔ اس مُلک کی یہی سائیکی ہے کہ لاکھوں کروڑوں کمائیں اور گنتی کے چند افراد اُسے کھائیں۔ اس کے سارے وسائل، سارے اختیارات، سارے اناج، انھی گنتی کے خواص کی نسل در نسل میراث ہے۔ اس کی ساری بھوکیں سارے امراض سارے دُکھ کرو د ساری مشقتیں اَن گنت کروڑوں افراد کا

ازلی وابدی مقدر ہیں۔''

جب مس زارا فتح شیر سیاست وحکومت کے سنجیدہ مسائل پر لیکچر دے رہی ہوتیں تو دورانِ لیکچر طالب علموں کے ہاتھوں ہاتھ دو پرچے گردش کر رہے ہوتے۔ایک لڑکیوں کے درمیان اور دوسرا لڑکوں کے مابین۔لڑکوں والا پرچا اگر غلطی سے کسی لڑکی کے ہاتھ میں پہنچ جاتا تو وہ اپنے ڈھکے سر کے ساتھ اُسی دوپٹے میں غرق ہو جاتی وہی دوپٹے جو سرکاری آرڈر کے ساتھ ان کے سروں پر مسلط کر دیئے گئے تھے۔اسی لیے تو مس زارا فتح شیر ستاروں کا چوراسامہین مسلن کا دوپٹہ سیاہ گھٹاؤں پر یوں اوڑھ لیتی جیسے بادلوں کے کنگروں پر برق کی دھاری کوندتی ہو۔مسلن کے یہ دوپٹے حاکمِ وقت کے پردے کے حکم کی جبری تعمیل تھے لیکن یہ لڑکے باریک شفعون، نائیلوں اور ڈھاکہ کی نفیس ململ میں سے جھلملاتے ہر رنگ، ہر قوس اور ہر اعضا کی شاعری کو کاغذ پر اُتار لیتے تھے۔مس فتح شیر دوپٹوں کی سرکاری قید سے آزاد ان گردشی کاغذوں پر منتقل ہوتی رہتی، پھر ان پر لکھے ہوئے ریمارکس لڑکوں کی چھپی خواہشات کی رُکی ہوئی بدروؤں سے یوں بھبھکے مارتے کہ پڑھنے والیاں دِنوں آئینہ دیکھنے سے بھی شرماتیں۔

''ارے ان فرسٹیڈ لڑکوں کو سیاست کے اجارہ دار اپنے مفادات کی نکیل ڈال کر بندر کی طرح نچاتے ہی رہیں تو بہتر۔۔۔ان کے دماغ کی گندی نالیوں میں فریب جال پھینک کر اُنھیں دو دھڑ والے عجوبوں کی طرح اپنے سیاسی پنجروں میں رکھ ان پر تماشے کا ٹکٹ لگا دیں تو یہی ان کی اوقات ہے۔''

لڑکیوں والے پرچے پر لاچاری کی بھڑاس جس چھوڑتی۔

''ہائے بھولی کو تو دیکھو''گنتی کے چند افراد''جیسے خود تو ان میں شامل نہیں ہے نا، یونہی ارمانی اور باس جیسے برینڈوں میں اکڑتی پھرتی ہے ارے ایسے ملبوسات اور میک اَپ میرے پاس ہوں تو میں بھی قلوپطرہ لگوں۔۔۔''

''ہوں قلوپطرہ۔۔۔''

''قلوپطرہ۔۔۔حسن کا سب سے بڑا استحصالی نام، گدھی کے دودھ میں نہانے والی آج بھی ہر مقابلۂ حسن کے لیے معیار بنی ہوئی ہے، حسن کا ناپ تول بھی انھی شہزادیوں کا میزان، فیشن بدلتا ہے تو انھی کی نقالی میں، ڈیزائن متعارف ہوتے ہیں تو انھی کے برینڈز میں، ہم محض نقال جھوٹن چکھنے اور اُترن چربہ کرنے والے ہم سب کی ایک ہی آواز نہیں چلے گا نہیں چلے گا۔سرمایہ داری نظام نہیں چلے گا۔۔۔''

پولیٹیکل سائینس کی طالبات کیسے بھی انقلابات کی پیش بندی کر لیں لیکن حقیقت یہ تھی کہ مس زارا فتح شیر نے جب سے یونیورسٹی میں قدم رکھا تھا فیشن کی دُنیا میں تو کم از کم انقلاب آ گیا تھا۔اس جامعہ میں پہلی بار سرمایہ داریت خیرگی کی طلسمیت کو چھو رہی تھی۔چاہے پردے کے کیسے ہی کڑے احکامات نازل ہوئے ہوں۔شرعی حدود کی ٹلکٹیاں سجائی جا رہی ہوں کہ شریعت کے کوڑے برسائے جا رہے ہوں لیکن سینوں پر دھری صبر اور قناعت کی سیل چیخ رہی تھی۔دولت اور آسائشات کی دوڑ میں انسانیت بے قابو ہو چلی تھی۔یہی سزاؤں اور پابندیوں بھرا دور تھا، جس میں کلاشنکوف کی دہشت اور نئے نئے متعارف روزگار ہیروئن کے بورڈ میں پھل پھول رہے تھے۔سرِ شام یونیورسٹی ہوسٹل کے اِردگرد کی سڑکوں پر مہنگی گاڑیاں پہلے سے کہیں زیادہ کھڑی ہونے لگی تھیں، جن میں کلاشنکوف بردار دستے سوار ہوتے، یہ اسلحہ بردار محافظوں کا اسٹیٹس سمبل بھی اسی عہد میں مروّج ہوا تھا۔سرمایہ داروں اور سیاست دانوں کے عسکری وِنگ جاگیرداروں کے رسہ گیروں سے بھی زیادہ تربیت یافتہ ہو رہے تھے۔

حاکمِ وقت نے جب سے جسم فروشی کے اڈوں کو اسلامائز کرنے کی کوشش کی تھی یہ مراکز ان پاش رہائشی علاقوں میں گھس آئے تھے جہاں پہلی بار پیٹ کی ضرورت متعارف ہوئی تھی۔پیٹ کی ضرورتوں کا بار اُٹھائے امیرانہ ماڈل کی گاڑیاں یہاں بھر بھر داخل ہونے لگیں اور پیٹ کا تبادلہ ترسیلِ زر سے ہونے لگا اور دُنیا کے قدیم ترین روزگار کے مواقع دو چند کرنے لگا۔یونیورسٹیوں کا مال جو ہمیشہ سے پسندیدہ اور مہنگا چلا آیا تھا۔ان اڈوں کی منتقلی نے ان کا بھاؤ بھی گرا دیا تھا۔ان پاش علاقوں میں آنے جانے سے کسی بدنامی کا خطرہ نہ رہا تھا تو ضبط کے پاٹوں میں پستے سفید پوش بھی خریدنے بیچنے کو بے دھڑک آزاد ہو گئے۔پابندیوں اور حدود کی اوٹ نے کاروبار کو پھلنے پھولنے کا سہارا فراہم کر دیا تھا۔نچلے متوسط طبقے کی اصولوں، روایتوں میں سسکتی صدیوں پرانی بھوک پر دھرا صبر کا باٹ کھسکنے لگا اور طبقہ بدلنے کی بے مہار خواہش نے حدود قاعدوں کو روند ڈالا۔

پیغمبرِ وقت نے ریاست کے ہر ادارے کو مذہبی چولے میں ڈھک کر جن قباحتوں اور خرابیوں کو نظر پوش کر دیا تھا اب وہ پھل پھول رہی تھیں۔ڈھکے ہوئے کوڑھ اور پھوڑے بدبوئیں اور زہریلے گیس، سرپوش بدروؤں میں دھرتی کی نازک رگیں گریدنے لگی تھیں۔عجب حادثہ ہوا تھا کہ بندشیں ہی افزائش کا محرک تھیں، لیکن اس یونیورسٹی کی غریب والدین کی بیٹیوں پر سے صبر اور قناعت کے باٹ کھسکانے کا الزام مس زارا فتح شیر پر ہی دھرا جاتا تھا، جس نے لڑکیوں میں بننے سنورنے، پہننے اوڑھنے کی ازلی خواہش کو بے لگام کر دیا تھا۔خوبصورت دِکھنے کی تمنّا کو مقابلے کی مارتھن ریس میں لگا دیا تھا۔اس مقابلے کے معیار کو یکدم اس قدر بلند، معیاری اور مشکل بنا دیا گیا تھا کہ بدن سجانے کو خود بدن کو اپنا ہی سوداگر بننا پڑتا تھا۔آرائش وزیبائش کے نت نئے فیشنوں کو ایڑھ لگی تو اخراجات ہواؤں کے ہم رکاب ہو گئے۔قیمتی ملبوسات، میچنگ جوتے، پرس اور آرٹی فِشل جیولری ایک وبا یونیورسٹی میں پھیل گئی تھی یہ آرٹی فِشل جیولری اور میچنگ کا تصوّر بھی یونیورسٹی کی لڑکیوں میں اسی عہد میں متعارف ہوا تھا۔وہ لڑکیاں جن کے گھر والے مس(Mess) فیس کے لیے دو ڈھائی سو روپے بھی مستقبل کی منصوبہ بندی میں اُدھار اُٹھا کر بھیجتے تھے کہ یہ سارے پیسے کل بہترین نوکری کی تنخواہ میں ڈیپازٹ ہو جائیں گے۔وہ اپنی پھٹی ہوئی ایڑھیوں، کیل مہاسے لپی

سانولی جلد کو بے داغ اور گوراچٹا بنانے کے لیے اِمپورٹڈ کریمیں کہاں سے خریدیں۔ یہ امپورٹڈ اور مہنگی کریمیں جواَب ہوسٹل کے ہر کمرے کی الماریوں میں بھری رہتی تھیں۔ اب تو صدیوں سے مروّج کپڑے اور روئی کے ماہانہ استعمال میں بھی پیڈز کا انقلابی خرچہ متعارف ہوگیا تھا۔ یہ بھی اب فیشن میں شامل تھا۔ مفت پوری ہونے والی ضرورتوں کو ٹریڈکمپنیوں نے اِس قدر پبلی سائیڈ (Publicities) کیا تھا کہ وہ بھی خریدی جانے والی انتہائی جائز ضروریاتِ زندگی بن گئی تھیں۔ ویکسنگ، تھریڈنگ، کٹنگ کے لیے بیوٹی پارلرز اسی مذہبی دور میں کھلے تھے۔ ہر بیوٹی پارلر کے باہر لمبی لمبی چمکتی دمکتی کاروں کی لائنیں لگنے لگیں۔ ٹریڈکمپنیوں نے نئے نئے روزگار کے مواقع بھی عام کر دیئے تھے۔ ویکسنگ، تھریڈنگ، مساج، فشل، برائیڈل میک اَپ، لیڈی کٹنگ کا عوامی رجحان اسی مذہبی دور میں عام ہوا، جب رعایا پر اپنی پسندیدہ شرع نافذ کی جانے لگی تو عجب نفسیاتی ردِّعمل سامنے آیا کہ ہنسنے، سنورنے، کھانے پینے کے نت نئے رجحانات اورمراکز گلی محلوں میں بھی کھلنے لگے۔ کڑاہی گوشت، چرغے ملک شیک اسی عہد کی پیداوار تھے، برگر، سینڈوچ، پیزا، انقلابی، ذائقے روائتی کھانوں کو چٹ کر گئے تھے۔ فاسٹ فوڈز نے بھوک اتنی بڑھادی، کہ تین وقت کے کھانوں کے اوقات اُتھل پتھل ہو گئے تھے۔ روز روز کھلنے والے مہنگے سکولوں نے اس بزنس کو خوب سہارا دیا تھا۔ بھاری فیس ادا کرنے والوں کو ان جدید ذائقوں کی لت پڑ گئی تھی۔ دیسی کھانوں کے ذائقے پینڈو اور ناپسندیدہ ہوتے جا رہے تھے۔

لیکن یونیورسٹی کی لڑکیوں کو شدید تحفظات لاحق تھے کہ نادار لڑکیوں کو فیشن کی یہ چاٹ لگانے میں مس زارا فتح شیر کا حصہ ضرور ہے۔ اُس کی لمبی سیاہ چمکیلی شورلیٹ گاڑی جب یونیورسٹی کے گیٹ سے داخل ہوتی تو لگتا اِس کے ڈھلے ڈھلائے سیاہ ٹائروں کے نیچے کئی ایک لڑکوں کے دل اور بے شمار لڑکیوں کے جسم کچلے گئے ہیں۔ چاندی سے چمکتے ویل کپ والے سیاہ ٹائر اور رنگ برنگ امپورٹڈ ہیلیں جب سیاہ کول تار کی سڑک کو ٹک ٹک چھوتی اُٹھتی تھیں تو لگتا سڑک کے سینے میں اتنے ہی چھید بن رہے ہیں جنھیں کبھی کوئی بجری سیمنٹ مندمل نہ کرسکیں گے۔ وہی سڑک جس پر لڑکوں کے زخمی دل اور لڑکیوں کے کچلے ہوئے جسم تڑپتے پڑے رہ جاتے۔ یہ دل و دماغ کا بھی عجب ماجرہ ہے، کبھی سترہ برس کی نوخیز اپنے فلیٹ شوز کے ساتھ دل کی سرزمین پر نقش پا ثبت کرنے میں ناکام رہتی ہے تو کبھی اٹھائیس برس کی بھرپور حسینہ اپنی نکیلی ہیل سے چھید بناتی ہوئی گزر جاتی ہے، جس کے نظارے کے لیے انیس بیس برس کے یہ لڑکے سیاہ بجری والی کشادہ سڑک پر شیورلیٹ کے بھاری ٹائروں اور پینسل ہیل کی نوکیلی ٹوہ کی لتاڑ تلے کراہتے گنگناتے۔

''ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھو۔''

لاکالج کی لڑکیوں نے تو میٹنگ کر کے یہ قرارداد متفقہ طور پر پاس کی تھی کہ مس زارا فتح شیر کے خلاف ٹاٹ ایکٹ کے تحت مقدمہ دائر کیا جائے کہ آخر اُنھیں کیا حق پہنچتا ہے کہ نوعمر لڑکوں کے جذبات کو اتھل پتھل کر کے اُن کا جذباتی استحصال کریں اور اُنھیں کس نے اجازت دی ہے کہ وہ مفلس لڑکیوں کو دولت کی چکاچوند سے یوں خیرہ کر دیں اور کہ اِس چمک کی لپک میں گڑھوں اور بدرووں میں گرتی پڑتی پھریں۔ ایسی اشتہا خیز اور اِشتعال انگیز چیزوں کا داخلہ پبلک پلیسس پر ممنوع قرار دیا جائے جیسے سیاسی سرگرمیاں تعلیمی اِداروں میں ممنوع ہو چکی ہیں۔ اِشتعال انگیز لٹریچر کی طرح مس زارا فتح شیر بھی ان اِسلامک ہیں۔ ان پر بھی پابندی عائد کی جائے یہ جاگیردار چاہے آکسفورڈ اور کیمبرج جیسی یونیورسٹیوں سے ڈگریاں لے آئیں لیکن ان کی شخصیت کی اُجڈ حاکمیت کبھی پالش نہیں ہوتی۔ ان کی گردن کی اکڑن ان کے لہجے کا تحکم کبھی کوئی تعلیم کلچرڈ نہیں کر سکتی۔ خود کو برتر دیگر ہر کسی کو کمتر سمجھنے کی نفسیاتی بیماری ان کو انسانوں کی سطح پر اُترنے نہیں دیتی۔ ان کی دُنیا ان کی اپنی ذات سے شروع ہوتی اور اپنی ہی ذات پر ختم ہو جاتی ہے۔ سرکاری تعلیمی اِداروں میں ایسی مخلوق کا کوئی جواز نہیں بنتا ہے۔ اُنھیں اپنی جاگیروں اور ریاستوں تک محدود کرنے کے آرڈر جاری کیے جائیں۔

لاء کالج کی لڑکیوں کی منظور شدہ قرارداد پر اتنے دستخط ثبت ہوئے تھے کہ کاغذ کے ساتھ مزید کئی کاغذ نتھی کرنے پڑے تھے۔ یہ سارے دستخط کسی کچی بستی میں کلبلاتے ننگے بھوکے بچوں کے ڈھیر کی طرح ایک دوسرے سے بھڑ رہے تھے۔ ناجائز تجاوزات کی طرح ایک دوجے میں منہ دھنسائے کسی اچانک چھاپے سے سہمے ہوئے جیسے۔ فٹ پاتھوں، سڑک کناروں، چھابڑیوں، ٹھیلوں میں بھرے بے قیمت سستے سودوں کی طرح جن کے بیچوں بیچ گزرتی مس زارا فتح شیر کی شیورلیٹ کا گھمنڈی شوفر اتنی گرد اُڑاتا تھا کہ فٹ پاتھیوں کے حلق میں کئی روز تک کھانے کے ذائقے گرد میں تبدیل ہو کر اُترتے تھے۔

جامعات میں سیاسی سرگرمیوں پر جب سے پابندی لگی تھی۔ سیاست زیرِ زمین گردش کرنے لگی تھی۔ اسی لیے سطحِ زمین زلزلوں کی زد میں رہتی تھی۔ کھلی بدرووں زیر زمین اُتر کر زیادہ زہرناک اور زیادہ ہلاکت خیز گیسوں میں تبدیل ہوگئی تھیں۔ انڈرگراؤنڈ گردشی سرگرمیوں کا دہانہ پھر مس زارا فتح شیر کے منبع پر کھلنے کا الزام تھا۔ وہاں اچھی چائے ملتی تھی اور ساتھ بسکٹ بھی، کھانوں کے بڑھیا ذائقے اور ایئر فریشنر کی خوشبوؤں کی لپٹیں بھی۔

ان میں سے بعض سیاسی ورکرز کو مس زارا فتح شیر کا کلاس فیلوز ہونے کا اعزاز بھی حاصل تھا، جو بار بار فیل ہو کر ہوسٹل کے کمرے اور یونیورسٹی کی سیاست سے بے دخل ہونے سے اِنکاری ہو چکے تھے، جب جب سکیورٹیز، لاء فورسز ریڈ کرتیں تو وہ ماڈل ٹاؤن کی اِس قدیمی کوٹھی کے سرد تہ خانوں میں خرد برد ہو جاتے جس کے باہر سنگِ مرمر کی تختی لگی تھی۔ ''وزیر برائے زراعت و دیہی امور۔ ملک عبدالرحمٰن ترقی یافتہ دُنیا کے سرمایہ کار اپنے اضافی سرمایوں کو چیریٹی میں لگا دیتے ہیں۔ کس قدر نفسیاتی برتری کی تسکین، عظمت اور نیکی کا بڑھیا زُعم۔۔۔ اسی طرح کبھی کبھی پرولتاری تنظیموں کے ڈونر بورژوا بن جاتے ہیں، پتہ نہیں کس

نفسیاتی کیتھارسس کے لیے۔۔۔جیسے ماڈل ٹاؤن کی یہ امیرانہ رہائش گاہ جس پر وفاقی وزیر کے نام کی اقتداری شناخت والی بے پیندے کی نیم پلیٹ عوامی دور سے فوجی دور تک کا گول سفر طے کرتی رہتی ہے۔ ننگے بھوکے نقد جاں کا سرمایہ قربان کرنے والوں کو پوشیدہ کر ہر دور میں آویزاں رہتی ہے۔ اچھا کھانا اور سگریٹ پان کا خرچہ اُٹھانا کیسی انقلابی چیریٹی کہ ایسے منصوبے میں پیسہ لگانا جسے کبھی تکمیل کے سامنے شرمندۂ تعبیر نہیں ہونا پڑتا۔ زیرِ زمین گردشی منصوبہ اضافی جوش نفرتوں اور مر مٹنے کے جنونی حربوں کو اپنا من پسند محفوظ دھانہ فراہم کر دینا۔ اقتدار، دولت اور طاقت کی سٹریٹجی بھی عجب کنفیوژن پیدا کرتی ہے کہ اپنے ہی خلاف جاری تنظیموں کے ڈونر بن جاتے ہیں۔

امریکہ کا جو یار ہے وہ غدار ہے۔

عوامی سادہ دلی کو چھو لینے والا پُرکشش نعرہ جیبیں خالی کر دینے والا نفسیاتی چندے کا زبردست ڈرینیر لیکن اُنھی کی تخلیق اُنھی کی اختراع جو خود یارِ غار ہیں۔ اپنے ہی خلاف بے پر کی چیونٹیوں کو پر لگا دینا کہ اُڑنے کا چاؤ بھی پورا ہو جائے لیکن اُڑان بس اتنی ہی جتنی ڈور کی ڈھیل کوئی ڈور تڑوا کر اگر کھلی فضاؤں میں نکلنے کی احمقانہ جرأت کرے تو پھر بوکاٹا۔ کس قدر غیر متعصب، عادل، فراخ دل و دماغ عجب قلندرانہ رویے، مابعد عالمگیریت کی خاموش زیرِ زمین دانشورانہ حکمت عملیاں وہ بھی ایسی ہی خاموش ڈونر تھی۔ اُن کی جن کی سرفروشیوں اور شہادتوں کو ڈونر کی متعین شدہ سمت پر گامزن ہونا ہوتا تھا۔ ان بے اختیار عوامی جذبوں کا ہائی جیک ہونا ہی اُن کا مقدر ہے، جو نظر آتا ہے وہ ہوتا نہیں جو ہوتا ہے وہ نظر نہیں آتا۔ ہر عہد میں جاں نثاروں، مجاہدوں اور شہیدوں کی کھیپ تبدیل ہوتی رہی تھی۔ اَن دیکھی ڈوریوں والے تبدیل نہیں ہوتے بس جگہ بدل لیتے ہیں۔ ڈوریوں کی غیر محسوس حرکت اور ان کے سروں پر بندھی پتلیاں ایکٹ اپون کرتی بھی نظر آ جاتیں لیکن ان کا خدا شاید آسمانوں کی وسعتوں میں کہیں چھپا رہتا ہے، جس کے حکم کے بغیر پتہ بھی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔

قدرت نے خود کو مخفی رکھ کر مقتدر طاقتوں کو کتنا سہارا دیا تھا۔ طاقت اور حکمرانی کے کتنے گُر سمجھا دیئے تھے۔ منہ سے نکلا ہر حرف حرفِ آخر ہر حکم اٹل کوّے نے جب دُنیا کے پہلے گناہ کی پوشیدگی کا طریقہ سکھایا تو پھر پوشیدگی ہاتھ کی صفائی اَن دیکھی قوتوں کی حکمتِ عملی جیسے قدرت نے خود زیرِ زمین مروّج کر دی جیسے فطرت نے خود لیگلائیز کر دیا ہو خدا کو فرشتوں کا مشورہ بھی شاید کسی پوشیدہ مستقبل بندی کا عندیہ کہ انسان زمین پر فساد پھیلائے گا لیکن اس خطرے کو زمین پر نافذ ہونے دیا گیا، جس کے نفاذ کنندگان خود خدائی اوصاف کے نقال بن گئے۔ اس زمین کی عمر جتنے ہی پرانے یہ چھوٹے خدا جو اپنے اقتدار کے نفاذ کے لیے ہمیشہ بڑے اور یکتا خدا کی ریس میں چلتے رہے۔ اُسی کے بنائے قوانین کی لاٹھی کو اپنے قابو میں لے آتے کہ ان قوانین پر عملدر آمد کروانے کو ہی تو خدا نے اُنھیں اپنا خاص بنایا ہے۔ فوق البشر، خلیفتہ الارض، امیرالمومنین، یکتا و تنہا حاکمِ وقت، وہی الہامی لفظوں جیسے اٹل احکامات، وہی حکم عدولی پر سخت سزائیں، جو بولا وہ قانون جو چاہا وہ شریعت، ہمیشہ قائم و دائم جاوِداں رہنے کا زعم، ہر پل تسبیح پھرولتے ثناخواں، احکامات نافذ کروانے والے بااختیار ملائکہ، سزائیں نافذ کرنے والے منکر نکیر کوڑے لہراتے ہوئے۔ نافرمانی کے مرتکب مجرموں کے لیے دہکتے ہوئے جہنم، تہ خانے، اٹک قلعے اور شاہی محلات کے عقوبت خانے اور جیلوں کے ٹارچر سیل، مطلق العنان طاقتوں کو بھنبھناتے مچھروں، مکھیوں کی سنسناہٹ بھی اقتدار کے ایوانوں پر چڑھائی کرتے گھوڑوں کی ہنہناہٹ کیوں محسوس ہونے لگتی ہے۔ فرماں برداروں پر جنتی وعدوں کی نوازشیں، حور و قصور، دودھ اور شہد کی رواں دواں نہریں، میٹھے اور رسیلے پھلوں سے لدے شاداب باغات، ریشم کے بچھونے اور انواع و اقسام کے میوہ جات، پیش کرتے نوعمر غلمان تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے اور جو پاگل جھٹلانے کا حوصلہ کر پاتے، اُن کے لیے ٹکٹکیاں کوڑے لہراتے جلاّد جب اسٹارٹ لیتے تھے تو تماشائیوں کے بے پناہ ہجوم میں سے اِک رِدھم سے آوازیں برآمد ہوتیں، جیسے اللہ ہو کا وِرد معبد گاہوں کی دیواریں ہلا دیتا ہے۔ سماوی جنت و دوزخ کی تصویریں، زمین کے سینے پر ثبت کرنے کی استعداد اور طاقت رکھنے والے ظل الٰہی پرتوے خدا، نائب اللہ، فوق البشر، امیرالمومنین ہیں، پھر بھی حشرات الارض کی سرسراہٹ اقتدار کے ایوانوں پر چڑھائی کرتے گھوڑوں کی ٹاپیں کیوں معلوم ہونے لگتی ہے۔ خدائی احکامات کی بجا آوری نے عوام کے کھیل تماشوں کے ذوق کو ہی تبدیل کر کے رکھ دیا تھا۔ اب کبڈی کے مقابلوں، کرکٹ، ہاکی کے میچ ان اسلامک معلوم ہوتے تھے۔ کھیلوں کا ذوق بھی اسلامائز ہو رہا تھا۔ شریعت کی پیروی اختیاری نہیں لازمی تھی۔ ان لازمی مضامین کی طرح جو اِس شرعی دور میں پیشہ ورانہ تعلیم میں بھی نصاب کا حصہ قرار دیئے گئے تھے۔ صلائے عام تھی کہ خدا کی مقرر شدہ سزاؤں کے نفاذ کا عملی مظاہرہ دیکھیں۔ پیشہ ور گواہ ہر مقدمے میں مقدس کتاب پر ہاتھ رکھ کر سچ کی قسمیں کھاتے عورتیں اور بچے بھی جوق در جوق جمع ہوتے تھے۔ یہ انسان نافرمانی اور مفسد فطرت لے کر پیدا ہوا ہے۔ اسی لیے تو سخت سزاؤں کا حکم اُترتا ہے، جن پر عملدر آمد کروانے کو ہر عہد کے ظلِ الٰہی ہر خطے کے نائب خدا ہر دھرتی کے منکر و نکیر جاہ و حشم کے ساتھ اُٹھتے رہے ہیں۔ جامعات میں تو خصوصی طور پر چھٹی کر دی جاتی کہ طالبِ علموں کے سرکش جذبوں کی تحدید کے لیے ان منفرد سزاؤں کا تماشا از حد کار آمد تھا۔ اِرادہ شکن، اعصاب توڑ سزائیں لاؤڈ اسپیکر کے منہ سے غیر انسانی چیخیں بن بن کر فضاؤں کو تھرّا رہی تھیں۔ جلاّدوں کے سینے سے چھٹتی مجتمع طاقت کی ’’ہوں ہوں ہوؤں‘‘، ’’لچکیلے کوڑوں کی ’’ کے ساڑ ساڑ‘‘ زارا نے گاڑی روکنے کا اِشارہ کیا۔ ٹکٹکی پر بندھا وہ انور علی تھا، جسے خطاطی کا ہنر قدرت نے بخشا تھا۔ کچی بستیوں کی تنگ و تاریک کھولیوں پر وسعتوں اور کشادگیوں کی تصویریں بناتے رِکشوں اور بسوں کے پیچھے شعر لکھتے لکھتے وہ سیاسی نعرے بنانے میں مہارت حاصل کر گیا تھا۔ سیاسی مخالفین اُس کی خدمات حاصل کرتے اور صبح

کی پہلی کرن کے ساتھ شہر کی اکثر دیواریں تیز طرّار نفرت سے چیخ دھاڑ رہی ہوتیں۔ آمنی سامنی دیواروں پر تو کبھی ایک ہی دیوار پر اُوپر نیچے ایک دوسرے کی ضد، دائیں اور بائیں بازو کے نعرے درج ہوتے، ساٹھ کی دھائی کے اخیر اور ستر کی دھائی کے شروع میں یہ نعرے اپنے عروج پر تھے۔ اسی لیے انور علی کی ماں نے گھروں میں برتن مانجھنے چھوڑ دیئے تھے۔ اب صرف اپنا آبائی پیشہ پاتھیاں تھاپنے اور بیچنے تک خود کو محدود کرلیا تھا۔ وہ بھی جب انور علی گھر پر نہ ہوتا تو ہی وہ اُپلوں کا ٹوکرا سر پر اُٹھا کر باہر نکلتی کیونکہ فن کار بیٹا سوا روپے فی سیکڑہ کے حساب والی پاتھیوں سے زیادہ تو ایک نعرہ لکھنے پر کما لیتا تھا، جو چشم زدن میں پورے شہر کی زبانوں پر چڑھ جاتا تھا۔ کئی بار زارا نے بھی اُسے ادائیگی کی تھی۔ اُس کی جدت طبع سے خوش ہو کر ٹپ بھی دی تھی کہ یہ عبوری نسل بڑی قابلِ رحم ہوتی ہے، جس کے پیر اپنے طبقے کے ارزل کیچڑ میں دھنستے ہوتے ہیں اور چہرہ تبدیلی کے سرد تھپیڑوں سے جھلس رہا ہوتا ہے۔ پاتھیاں بیچنے والی کا یہی پینٹر بیٹا ٹکٹکی سے بندھا تھا۔ جلّاد کے نرخرے سے نکلتی ''ہوں ہوں ہوں'' اور ٹکٹکی پر بندھے ہوئے شکار کی خرخراتی چیخیں اور ملائکہ کے سوالات۔ عجب سماں تھا، تماشبین اِس دلچسپ ڈرامے کا ایک جملہ بھی مس کرنا گناہ تصوّر کرتے تھے۔ اِن شرعی سزاؤں کا نظارہ مذہبی جوش و جذبے سے کرتے تھے۔

''بول یہ شعر تو ہی بناتا ہے نا:

''بول کے لب آزاد ہیں تیرے۔''

''اب کے بول۔ ہاں ہاں بول نا لب آزاد ہیں تیرے۔''

''لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے۔''

''یہ بھی تو نے بنایا تھا نا اب دیکھ تیرے تخت کیسے اُچھل رہے ہیں۔ تیرے تاج کیسے گرائے جا رہے ہیں۔ اب دیکھ رہا ہے کہ مفسد پتلیوں میں لہو ٹھہر گیا ہے۔ اب تجھ پر لازم ہے کہ دیکھ۔'' ہر جملے پر پڑنے والے قہقہے عوامی تماش بینی والی مخصوص بے حسی اور لطف انگیزی میں لتھڑا تجسس دیوانہ وار اُمڈا پڑ رہا تھا۔

''اب بول کہ لب آزاد ہیں تیرے۔''

''نہیں اس کے لب آزاد نہیں ہیں۔ اتنے بھیانک جرم کے ارتکاب کی صلاحیت ہی نہیں پیدا کی گئی اس کی جبلت میں۔ اتنے عرشی نعروں کی تخلیق پاتھیاں تھاپنے والی کے نطفے میں خود خدا نے نہیں رکھی تھی، جس نے گھڑے ہیں اُس کی قبر پر کوڑے جا مارو، جو خود تو بڑے بڑے اعزازات کا کفن سمیٹ کر ناموری کی نیند سو رہا ہے اور اپنے لفظوں کی سزائیں اُن پر لاگو کر گیا، جنھیں یہ لفظ بولنے پر مجبور کر گیا۔ کھوکھلے بے عمل لفظ گھڑنے والے خود تو انعام و اکرام، ستائش و قصائد کی بارش میں نہاتے رہتے، لیکن وہ زبانیں کٹتی ہیں وہ سر پھوٹتے رہتے ہیں۔ اس نے تو جن سروں میں ان کا انقلابی سودا سما جاتا ہے، جن میں ان کا خنّاس سما جاتا ہے۔

زارا نے چیخ کر کہنا چاہا۔

''یہ اس نے نہیں بنائے اُس پر ان لفظوں کی تخلیق کی فردِ جرم غلط لگائی گئی ہے۔''

اُس کا جرم تو دوسری نوعیت کا ہے۔ گھِسے ہوئے ناخنوں میں دھنسے اور ارزل وجود میں رچے گوبر بھرے ٹوکرے کے وزن سے چھٹکارا دلانا چاہا تھا۔ اُسے جسے بیوگی اور غربت نے قبل از وقت بڑھاپے اور امراض کی پوٹ میں تبدیل کر دیا تھا، لیکن یہ دلیل بہت بودی اور بوسیدہ تھی۔ اصل میں ہاتھ تو قدرت خود اُس کے ساتھ کر گئی تھی۔ اچھی بھلی نسلی اور موروثی گوبر گوندھنے کی وراثت میں کھنڈت ڈال گئی تھی۔ اُس کی کمینی بھدی اور مشقتی اُنگلیوں کی ساخت میں سازش چھپا کر رکھ دی گئی تھی۔ ٹیڑھی میڑھی بدوضع اُنگلیاں گوبر گوندھتے گوندھتے پتہ نہیں کیوں۔ مخروطی اور آرٹسٹک ہو گئی تھیں۔ اتنی کہ وہ اپنے اندر کی کسی آنکھ پر طلوع عجب نظارے مصوّر کرنے لگا جو بسوں ٹرکوں رِکشوں کے پیچھے خوش رنگوں میں نکھرنے لگے تھے، کیونکہ ہر منظر میں سے سورج طلوع ہوتا تھا۔ لہلہاتے میدانی کھیتوں کو زعفرانی بناتا ہوا سورج، پہاڑی جھرنوں اور برف پوش چوٹیوں کے پیچھے سے جھانکتا ہوا روشن آفتاب۔ مزدور کی پشیمانی سے پھوٹتا ہوا نئے دن کا شاداب سورج، کسان کے ہل پر عنابی شفق بکھیرتا ہوا سورج۔ اُسے بنانا ہی تھا، تو لہو میں لتھڑا ڈوبتا ہوا، گرہن زدہ سورج بناتا یہ اُبھرتا ہوا نیا سورج آئینِ خداداد کی تعزیرات کے تحت جرم قرار پایا تھا۔

آخر کس مفسد دماغ کی علامت ہے، نئے دن کا آغاز کرتا ہوا یہ سورج، کس باغیانہ سوچ کا گواہ تھا، یہ سورج، وہ سوا اِنکاری ہو کہ یہ محض اُس کے آرٹ کا نمونہ تھا، لیکن تاریکیوں میں دیکھنے کی صلاحیت رکھنے والی اس دھرتی پر بے پناہ سورج اُگانے کا الزام رد کرنے کو یہ کافی جواز نہ تھا۔ یہ سورج یقیناً کسی باغی تنظیم کا کوڈ ورڈ تھا۔ پاتھیاں تھاپنے والی کا پینٹر بیٹا اتنی بڑی سپاۂ خدا کو چنوتی دے رہا تھا، جہاں سورج گل کرنے کا عمل اتنی سُرعت اور صفائی سے ممکن ہو رہا تھا، وہاں ایک نئے اور تر و تازہ سورج کی شبیہہ اُگانا!''

''بول کس کے لیے گھڑتا ہے یہ مخرب الاخلاق شاعری کس کے کوڈ ورڈز بناتا ہے ان غلیظ سورجوں کو۔ ان سورجوں کی آگ تیری آنکھوں میں گھسیڑ دی جائے گی اور اس غلیظ شاعری کے لٹھ تیری چوت میں۔۔۔''

''میں نے نہیں گھڑی، میں بس لکھتا ہوں، مجھے تصویریں بنانے کے پیسے ملتے ہیں۔ آپ دے دیجیے آپ کے لیے آپ کی پسند کا ڈوبتا ہوا سورج گھڑ دوں گا۔ ستاروں پر بھی سیاہی پھیر دوں گا۔ سیاہ تاریک آسمان پینٹ کر دوں گا۔ اُس میں پورے ملک کو لپیٹ دوں گا۔ پیسوں کے تناسب سے صفائی اور کام کی مہارت پیدا ہو گی۔ آپ موقع تو دیجیے۔''

''حرامی چکر دیتا ہے حرامی پھر چکر۔۔۔''

ٹوپی والے نے تھرڈ ڈگری کے سارے حربے آزما لیے لیکن حرامی خفیہ کا نطفہ اپنے ناجائز باپ کا۔ نام ہی نہ بتاتا تھا۔ جھوٹ موٹ بتا کر بھی جان نہ

بچاتا تھا، بلکہ ٹارچرسیل کی تاریک دیواروں پر اپنے ہی لہو سے چڑھتے ہوئے سورج پینٹ کردیتا۔ وہ لہو جو جری جوان اِس سوکھی پاتھی کے کیڑے میں سے کس قدر مشقتوں سے نچوڑ پاتے تھے۔ آخر وہ ڈوبتے ہوئے سورج کیوں نہیں بناتا تھا۔ اِرادے اور فعل کے درمیان تعلق سے جرم جنم لیتا ہے۔ یہ عجب جرم تھا کہ جس کی عادی اُنگلیاں اس قدر بے اختیار ہوچکی تھیں کہ دماغ اور اِرادے کے تعلق کے بغیر ہی زخم زخم پوروں پر سورج پھوٹ نکلتے تھے۔ اُس نے اتنے سورج اُگائے تھے کہ اب شہر بھر کی دیواروں پر راوی کی خشک ریت پر، ٹرکوں اور رِکشوں پر سورجوں کی فصلِ بہار لہلہاتی تھی جن پر سفیدی کے کئی کئی کوٹ پھیرے گئے پھر بھی ان کی کرنیں کہیں نہ کہیں سے پھوٹ نکلتیں۔ ''سورج بنانے والا'' اُس کا نام پڑ گیا تھا۔ اِس ٹارچرسیل میں اُس کے دماغ اور اِرادے کا رشتہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منقطع کردیا گیا تھا، لیکن اُس کی اُنگلیوں پر سورج ابھی بھی کھلتے تھے وہ زندہ رہنا چاہتا تھا وہ ہر سمجھوتہ کرنا چاہتا تھا لیکن اُس کی اُنگلیاں اُس کے اپنے ہی اِرادے سے باغی ہوتی تھیں۔ وہ اِشاروں سے قفس خانے کی تاریک فضاؤں میں سورج پروتا رہتا۔ سنگی دیواروں پر پوروں سے اتنے سورج کندہ کیے کہ پوریں رگڑیں کھا کھا لہو میں بھیگ جاتیں۔ چوہوں، چھپکلیوں، کاکروچوں بھرے غلیظ فرش پر سورج پر سورج اُگا دیتا۔ اگرچہ کوئی دلیل یا شہادت تو نہ تھی۔ پوری مشینری کی حرکت کے باوجود کہیں سے کوئی تصدیق بھی نہ ملی تھی لیکن اِک خوف سا تھا۔ واہمہ سا تھا کہ یہ بے مایہ مچھر نمرود کی ناک غلیظ فرش پر سورج پر سورج اُگا دیتا۔ اگرچہ کوئی دلیل یا شہادت تو نہ تھی۔ پوری مشینری کی حرکت کے باوجود کہیں سے کوئی تصدیق بھی نہ ملی تھی لیکن اِک خوف سا تھا واہمہ سا تھا کہ یہ بے مایہ مچھر نمرود کی ناک میں گھسنے کی کوشش کررہا ہے، جس کے دماغ اور اِرادے کا تار کب کا منقطع کردیا گیا تھا تو بھی سورج اس کی پوروں پر لہلہاتے تھے، جیسے یہی ضد ہو یہی چڑ ہو، ظلِ الٰہی کی۔۔۔'' لیکن اب معجزے جنم نہیں لیتے، جب سے خدا نے پیغمبر بھیجنے کا سلسلہ منقطع کیا، معجزے بھی آسمانوں میں ہی کہیں سمیٹ لیے گئے ہیں۔ اب مچھروں کے دل قوی لشکروں کے کشتوں کے پشتے لگانے کی غیبی طاقت سے محروم کردیئے گئے ہیں۔ اب بھاری بوٹوں تلے مچھروں کے کچلے جانے کی باری ہے۔ اب غیبی قوتوں کو معطل کردیا گیا ہے کہ اُنھوں نے اپنی پسپائی کو خود قبول کرلیا ہے، پھر کسی اور روز سیاہ شورلیٹ کے پاورفل اے سی کی ٹھنڈک میں کچے شیشوں پر کسی ٹنڈ نے دستک دی تھی۔ مندمل ہوچکا پرانا ٹھنٹھ جس پر سے اُنگلیوں کی شاخیں تراش لی گئی تھیں۔ اس ٹھنٹھ پر بھیک ڈالنے کے لیے بھرا ہوا پرس وہ نہ کھول سکی۔ اُس نے اپنا ماتھا پیٹ لیا۔ پاتھیاں تھاپنے والی کے بیٹے کو آخر پینٹر بننے کی ضرورت ہی کیا پڑی تھی، اگر اُنگلیوں کی جبلت تبدیل ہوگئی اور ان پر سورج کھل بھی اُٹھے تھے تو ان کی چکاچوند میں دیکھ سکنے والی بینائی کا ظرف تو عطا نہیں ہوسکتا تھا۔ اُسے اوچھے اور اتھلے کو خزانہ مخفی کرنے کا ڈھنگ کیوں کر یاد ہوتا، چھوٹی ذات کا ارزل ڈنگ ڈنگ کھانے والا اتنی بڑی نعمت کو سہار نہ سکتا تھا۔ اُسے سورج کی شبیہ بنانا ہی تھی، تو گوبر کی تاریکی میں اسے دفن کردیتا ٹرکوں اور بسوں پر سورج سوار کروانے سے خود کو مشکوک قرار دے دیا نا۔ ٹھنٹھ شورلیٹ کے شیشوں پر دستک دیتے رہے۔ قلم کردہ اُنگلیوں والی ہتھیلیوں پر بھیک کے سکے ٹپکتے رہے۔

''خلّاق افسانہ نگار''

طاہرہ اقبال واقعتاً ایک خلاق افسانہ نگار ہیں۔ اردو فکشن کا شاندار مستقبل جن چند افسانہ نگاروں کے فنی اور فکری کمالات پر منحصر ہے ان میں طاہرہ اقبال سرِفہرست ہیں۔ مبدائے فیاض سے انہیں بے پناہ تخلیقی صلاحیتیں ودیعت کی گئی ہیں۔ طاہرہ اقبال نے خالق اکبر کی اس عطا کا شکرانہ یوں ادا کیا ہے کہ تہ در تہ حقائق تک رسائی کو ایک نظر میں اپنے شعور کی گرفت میں لے لینے کی خداداد صلاحیت کو چمکانے کے لیے انتھک محنت سے کام لیا ہے۔ ان کی نگاہ باریک بیں ہے، مشاہدہ تیز ہے اور مطالعہ گہرا ہے۔

طاہرہ اقبال نے سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی اور احمد ندیم قاسمی کے ذہن و ذوق اور تخلیقی روایات سے وہ سب کچھ سیکھا ہے جو ایک ایجاد طبع فن کار سیکھ سکتا ہے۔ طاہرہ نے جدید اور ترقی پسند اردو فکشن کی اس راویت سے اکتساب فیض بھی کیا ہے اور اسے ثروت مند بھی بنایا ہے۔ ''سنگ بستہ'' اور ''ریخت'' کے بعد طاہرہ کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ اس کے اور جدید تر اردو فکشن کے شاندار مستقبل کا ثبوت بن کر طلوع ہوا ہے۔

پروفیسر فتح ملک

براہِ راست

طاہرہ اقبال اردو فکشن کا ایسا نام ہے جس نے اردو افسانے کو نئی چھب، نیا لب ولہجہ اور نئی اٹھان دے کر کچھ نہ کرنے والوں کو بہت کچھ کرنے کی دعوت دے ڈالی ہے۔ ادب کو روزمرہ کی عکاسی کچھ اس طور کرنا چاہیے کہ موجودہ وقت کے ساتھ آنے والے زمانے بھی اس سے استفادہ کر سکیں۔ اس پس منظر میں ہم طاہرہ اقبال کی تخلیقات پڑھیں تو انہوں نے ہمارے دیہات کے روزمرہ کی عکاسی اس قدر سفّا کی اور بے باکی سے کی ہے کہ کبھی کبھی اُن کی سلامتی کے حوالے سے طبیعت مضطرب بھی ہو جاتی ہے۔ مگر یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ اردو ادب پر ایک مدت سے جو جمود طاری تھا وہ کسی قدر کم ہوا ہے۔ نا صرف کم بلکہ نئے لکھنے والوں کو حوصلہ بھی ملا ہے اور بہت سے نئے لکھنے والے طاہرہ اقبال کی پیروی میں بہت کچھ نیا لکھ رہے ہیں۔ آج کی نشست میں طاہرہ اقبال کی شخصیت اور فن کا احاطہ اس غرض سے کیا جا رہا ہے کہ ہم اور آپ کھلے دل اور دماغ کے ساتھ طاہرہ اقبال کی تخلیقات کا نہ صرف بالغ نظری سے مطالعہ کریں بلکہ وہ جس مقام کی بجا طور پر مستحق ہیں اُس کا تعین بھی درست طور پر کریں تا کہ طاہرہ اقبال کا مضطرب قلب اور متحرک قلم وہ کچھ منشائے شہود پر لانے میں کامیاب ہو سکیں جس کی توقع ہم بجا طور پر طاہرہ اقبال سے کر سکتے ہیں۔

گلزار جاوید

☆ ملکہ کوہسار کے وزن پر ملکہ گنجی بار سے بچپن کی یادیں کھوجنے کی درخواست کی جائے تو قبول ہونے کے امکانات کس قدر ہیں؟

☆☆ چند مناظر چہرے، موسم خوشگوار و ناخوشگوار یادیں محدود مگر گہری۔۔۔ کپاس کے وہ سرد موسم جب چنائی کرنے والی عورتیں سفید برف سی روئی کی بڑی بڑی پنڈیں کھول کر کچی پکی کھوکھڑیاں نکالتیں اور بٹائی کرواتیں۔ بیسواں حصہ بھانجی (مزدوری) اور باقی ''پڑ'' یعنی ڈھیر میں وٹڑ واڈالتا جاتا۔ اُونچے اور بڑے بڑے برف سی روئی کے انباروں پر گھٹنوں گھٹنوں دھنسی ایک بچی سرخ کوٹ کی جیبیں پستے چلغوزوں سے بھری ہوئیں لیکن اس احساس سے کبھی نہ کھاتی کہ سامنے پھیلے اُس کے ہم عمر بچے بھوک ننگ کی پوٹیں ٹانگر مرنڈے کی فرمائش پر اپنی ماؤں سے چانٹے کھاتے بسورتے ہیں، پھر گندم کی کٹائی کے وہ گرم موسم جب کٹے ہوئے کھیت بھاپیں مارتے کھال کے پانی بخارات بن کر اُڑتے درختوں کے سائے میں پڑی پینگ وہ لڑکی جھولتی نوکرانیاں جھلاتیں اور ٹپے ماہیے گنگناتیں۔

ساڈے دُکھ سن سن کے روندے پتھر پہاڑاں دے وہاں پتھروں کے رونے کے جواز بہت تھے۔ چند خوشگوار مناظر کی نسبت تکلیف دہ منظر بہت تھے۔ بھوک پیوند لگے لباس، جانوروں کے کھرّ وں سے ننگے پیر جو کھڑانوؤں کی مانند ہنڈا دیئے جاتے۔ بائیس پچیس برس کی لڑکیاں دس بارہ زچگیوں میں صرف ہو کر مسمار، منہدم خدوخال پائیرازدہ مسوڑھے اکا دُکا لٹکتا دانت وہی جو کبھی قتلوں کا موجب بنی تھیں۔ عمر قید کاٹ کر لوٹنے والے کیسے پچھتاتے ہوں گے اور خود سے ہی پوچھ پوچھ شرمندہ ہوتے ہوں گے، کیا یہی۔۔۔؟''

گنجی بار کے میدانوں میں گونجتا یہ جملہ سدا پیچھا کرتا رہا۔ ''کُجھ دُکھاں ماریا کُجھ بھکاں ماریا کُجھ جیوندیاں ماریا کُجھ مویاں ماریاں کیوں دیتی اور با اے گندی حیاتی لے میں موڑ کے سٹی جھپ لے۔۔۔''

شاید ''گنجی بار'' میں گم شدہ بچپن کی تفسیر اسی جملے میں قالب بند رہ گئی۔

☆ اب جناب کچھ تفصیل تعلیم، اساتذہ اور ہم جماعت دوستوں کی بیان فرما دیجیے؟

☆☆ گنجی بار کے سرسبز کھیتوں، بھاپ چھوڑتی دھول آٹھ آٹھ پہر ریت کے پہاڑ اُڑاتی سرخ وسیاہ آندھیاں اور روتے ہوئے پتھروں میں محصور رہ گئی وہ لڑکی ساہیوال شہر کے پائلٹ سکول میں اِتنی تنہا، کم گو، اُداس اور نالائق تھی کہ شوخ و چنچل ہم جماعت اُسے خود میں کبھی نہ سموتیں جیسے وہ کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہو۔ وہ خود بھی اس ہنستے کھلکھلاتے بے فکر ماحول سے دُور کٹھور فطرت کے کسی بار میں بھٹکتی رہتی، جہاں ہنسنے کے جواز نہ ہونے کے برابر تھے جہاں روتے ہوئے پتھر بہت تھے۔ چند ابتدائی جماعتوں کے بعد سکول کا یہ سلسلہ منقطع ہوا اور یہ زمیندار گھرانہ واپس گاؤں لوٹ آیا تو یکبارگی احساسِ زیاں نے دبوچ لیا۔ جہالت اور لاعلمی کا شدید خوف اُس تاریک، اُندھے غار سی زندگی جس میں جانور بھی داخل ہوتے ہوئے ڈرتے ہیں۔

مجھے پڑھنا ہے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا ہے۔ علم کی واٹ، روشن تو چراغ ورنہ بجھا ہوا کالک بھرا دیا اس سوچ نے گویا ڈس لیا پورا وجود زہرناب۔ بس پھر سارا تعلیمی سلسلہ پرائیویٹ چلا انتہائی باقاعدگی سے بہت مخالف صورتِ حال اور نامساعد حالات نے راستہ روکا لیکن ذات کی کھوج کا یہ عمل روکے رُک نہ سکا۔

میٹرک، ایف اے، بی اے، ایم اے سب پرائیویٹ کالج کی شکل پہلی بار بطور لیکچرر ہی دیکھی آج وہی نالائق طالبِ علم پروفیسر ڈاکٹر کہلاتی ہے۔

ابتدائی درجوں میں اُستاد کا تصوّر کسی جلّاد کا سا تھا جیسا کہ نالائق طالبِ علم کے لیے ہوا کرتا ہے۔دُعا کرتی رہتی کہ کچھ ایسا ہو جائے کہ سکول ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے اور جب مجھ پر بند ہو گیا، سکول کبھی یاد نہ آتا کوئی اچھی یادیں اُس سے وابستہ ہی نہ تھیں، البتہ کتابوں سے رغبت اِنتہا کو پہنچی۔کسی معاملے میں اتالیق کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔فطرت سے کتابوں سے خود سے دوسروں سے اِکتساب کیا۔

☆ کتاب کی للک کس عمر اور کس بنا پر پڑی اور سب سے پہلے کون سی کتاب مطالعے میں آئی؟

☆☆ یہ زمیندار گھرانہ کوئی علمی ادبی پس منظر نہ رکھتا تھا۔البتہ ماں باپ دونوں پڑھے لکھے تھے۔والد صاحب انگریزی ادب کا وسیع مطالعہ رکھتے تھے۔انگریزی اخبار اور رسائل وغیرہ بذریعہ ڈاک گھر میں آتے۔والد صاحب کا خیال تھا کہ اُردو زبان اس قابل ہی نہیں کہ اعلیٰ ادب تخلیق کر سکے، لیکن اپنی گفتگو میں غالب، ذوق، حافظ و خیام کے اشعار کثرت سے کوٹ کرتے۔بہت کمال کی گفتگو ہوتی اُن کی شیکسپیئر ورڈز ورتھ کیٹس اُن کی Tips پر تھے۔وہ علاقے کے اِنتہائی زیرک اور مُدبر آدمی مانے جاتے سبھی پنچائتیں جھگڑے اُنہی کے رُوبرو پیش ہوتے۔کبھی اُن کے فیصلے پر کوئی اِختلافِ رائے نہ ہوتا۔کبھی کسی کو نہ ڈانٹتے نہ ہی براہِ راست اُس کی غلطی جتاتے ایک آدھ ایسا طنزیہ جملہ کہتے کہ سمجھنے والے کے دماغ سے بھی دھواں چھوٹ جاتا۔ہمیشہ یہ حسرت رہی کہ کاش اُن کی زبردست شخصیت کا عشرِ عشیر ہی حاصل ہو پاتا لیکن وہاں باپ اور بیٹی میں وہی فاصلے تھے جو اُس معاشرت کا حصہ ہیں۔گھر میں داخل ہوتے تو بیٹی کونے کھدروں میں چھپ جاتی۔دونوں ماں باپ آپس میں انگریزی میں گفتگو کرتے کہ دوسرا کوئی سمجھ نہ پائے اور واقعی میں کبھی سمجھ نہ پائی یہ انگریزی کتابیں دسترس سے بہت اُوپر رہیں۔

والدہ حور، زیب النساء آدابِ عرض جیسے رسائل کا مطالعہ کرتیں۔میں نالائق طالبہ تھی۔انگریزی پڑھنی نہ آئی۔اُردو رسائل کی طرف متوجہ ہوئی، لیکن اُن کی سطحی اور کچی پکی کہانیاں ہرگز متاثر نہ کرتیں۔

میرے گرد پھیلی زندگی کی حقیقتیں اتنی سنگین گونا گوں حیرت زا تھیں تو آخر لوگ ان حقائق کو کیوں نہیں لکھتے۔شاید یہی سوچ لکھنے کی محرک بنی، تبھی یاد نہیں کیسے گھر میں احمد ندیم قاسمی کی کپاس کا پھول آ گئی۔میرے اندر سے وہی نعرہ بلند ہوا یعنی پا لیا۔ہاں یہ ہے جو میں لکھنا چاہتی ہوں پڑھنا چاہتی ہوں اُس اکلوتی کتاب کو اتنی بار پڑھا کہ ایک ایک حرف از بر ہو گیا۔ہمارے گاؤں میں بجلی نہ تھی۔حویلی میں جنریٹر چلتا تھا لیکن رات کو روشنی کی ضرورت محسوس نہ کی جاتی۔میں لالٹین کی روشنی میں پوری رات نصاب کی کتابیں پڑھتی رہتی۔کہانیاں لکھتی رہتی، لیکن ادب کی ذیل میں کچھ اور پڑھنے کو میسر نہ تھا۔

☆ منٹو، بیدی کے مطالعے کا وسیلہ کب اور کیسے بنا اور لکھنے کا آغاز کس طور ہوا؟

☆☆ منٹو یا بیدی کو پڑھنے کا وسیلہ اُس دور میں تو نہ بنا۔اُس وقت تو ان کے نام سے بھی واقف نہ تھی جب میں چاردیواری میں بند ڈھیروں ڈھیر کہانیاں لکھتی رہتی۔کسی تکنیک یا فنی رموز کی خبر تک نہ تھی۔بس فطری اپج تھی جس طرح تعلیم میں کوئی اُستاد میسر نہ تھا۔اسی طور فنِ افسانہ میں بھی خارجی تعلیم نہ تھی۔

☆ پہلی تخلیق کب ظہور میں آئی، اشاعت کا وسیلہ کیسے بنا اور لوگوں کا ردِ عمل کس طرح کا تھا؟

☆☆ پہلے تک بندی کرتی تھی پوری بیاضِ شاعری تیار ہو گئی۔میٹرک کی تیاری کر رہی تھی تو کہیں پڑھا کہ شاعری کے لیے عروض واوزان کی ضرورت ہوتی ہے۔اِس علم سے متعلق ایک کتاب بھی ہاتھ آ گئی۔بہت سر مارا لیکن سیکھ نہ سکی اُس چاردیواری میں یہی تو زندگی کی دلچسپی مقصد اور رنگینی تھی، اگر لفظوں کو جوڑ نہ سکی تو زندہ رہنے کا سامان کیا ہو گا۔وہ دسویں کلاس کی لڑکی چارپائی پر اوندھی پڑی مرنے کے مختلف طریقوں پر غور کر رہی تھی کہ اچانک خیال آیا کہ لفظوں میں خود کو اُنڈیلنا ہی تو ہے۔ذریعہ کوئی بھی ہو سکتا ہے شاعری نہ سہی نثر سہی۔

اُس لمحے ایسے محسوس ہوا جیسے پھانسی گھاٹ پر سے پھندہ اُتر گیا ہو۔کاپی پن پکڑ کر کہانی لکھنے لگی۔جواب تک لکھ رہی ہے۔بے شمار لکھا لیکن چھپنے کا سلسلہ وہاں ممکن نہ ہو سکتا تھا جو اُردو رسائل گھر میں آتے اُن میں آدابِ عرض حقیقت کے قریب محسوس ہوتا میں نے پہلی بار آٹے سے جوڑ کر ایک لفافہ بنایا۔ڈاک کے بہت سارے لفافے منگوائے اُن کے ٹکٹ کاٹ کر آٹے سے ہی اُوپر چپکائے اور منشی کو چوری چوری دیا کہ ڈاک خانے دے آؤ۔اگلے مہینے وہ کہانی چھپ گئی۔ایڈیٹر کا تعریفی خط بھی آیا اور بہت سے ستائشی خطوط بھی۔۔۔میری خوش قسمتی کہ یہ خطوط باہر سے نوکرانی نے لا کر مجھی کو دیئے میں نے اگلی کہانی اسی طریقے سے بھجوائی اور لکھا کہ آئندہ مجھے کوئی خط نہ بھیجا جائے یہ سلسلہ بی اے تک چلتا رہا۔بہت کہانیاں چھپیں، بی اے کے بعد ایم اے اُردو کا نصاب پڑھتے ہوئے مجھ پر منکشف ہوا کہ یہ رسائل ادب کا حصہ نہیں ہیں۔میں نے کہانیاں بھجوانے کا سلسلہ منقطع کیا، لیکن انھیں کہاں بھیجنا چاہیے یہ میرے علم میں نہ آ سکتا تھا۔ادبی رسائل کون سے اور کہاں سے چھپتے ہیں نامعلوم۔بس لکھتی اور رکھ چھوڑتی، بے شمار کہانیاں لکھیں اتنی کہ شادی کے بعد میں جب وہاں سے نکلی تو بوریاں بھری تھیں۔شادی کے اِبتدائی سات آٹھ برس لکھنے کا سلسلہ منقطع رہا۔ایک بار کالج میں کتابوں کی نمائش کا اہتمام ہوا تو دیکھا کہ کئی لیکچرز اپنی کتابیں لیے سٹال پر تفاخر سے کھڑی ہیں۔سوچا جو سیکڑوں کہانیاں بوریوں میں بند پڑی ہیں اُنھیں چھپوا کیوں نہ دوں، لیکن اُس کتاب کو کون پڑھے گا، چلو ڈیڑھ سو تو سٹاف ممبران ہیں اُنھیں دے دوں گی کچھ ملنے ملانے والوں کو بانٹ دوں گی۔کچھ رکھ چھوڑوں گی۔میری سادگی دیکھئے کہ میں نے افسانوں کی کتاب کا دیباچہ

لکھنے کے لیے اپنی ایک کولیگ نسیم صحرائی کے مشورے پر مقصود وفا کو کہانیاں بھجوائیں، کیونکہ میں تو کسی نام سے بھی واقف نہ تھی۔ اس اچھے انسان نے مجھے فون کیا اور کہا کہ آپ تو ٹھیک ٹھاک افسانہ نگار ہیں۔ میں آپ پر لکھنے کے لیے احمد ندیم قاسمی کو بھجواتا ہوں۔ میرے تو چھکے چھوٹ گئے۔ وہ مجھ پر کیوں لکھیں گے، جن کا واحد تعارف ''کپاس کا پھول'' مجھے آج بھی از بر تھی، لیکن حیرت تو جب ہوئی کہ اُنھوں نے لکھا کہ مقصود وفا صاحب! آپ نے طاہرہ اقبال کے افسانے بھجوا کر مجھ پر بڑا کرم کیا ہے اور بہت ستائش لکھی، یعنی ادبی دُنیا میں میرا پہلا تعارف ''سنگ بستہ'' سے ہوا، پہلی کتاب کسی بھی لکھنے والے کا تاثر بنا بھی دیتی ہے اور بگاڑ بھی دیتی ہے۔ اس کتاب نے میرا تاثر بنا دیا۔ اس کے بعد تقریباً ہر ادبی پرچے میں تواتر سے لکھا اور سرعت سے کتابیں چھپیں۔

☆ کتابیں کس قسم کی پڑھتی ہیں اور کون سے قلم کار آپ کی تحریر میں دخیل ہیں؟

☆☆ جب پڑھنے کو بے پناہ وقت تھا پڑھنے کے لیے ترستی تھی تو کچھ دستیاب ہی نہ تھا۔ جن اخباری کاغذوں میں سودا سلف لپٹا ہوتا وہ بھی جمع کر کے پڑھتی، کوئی اخبار، رسالہ، اگر گھر میں آ جاتا تو عجب سرشاری کی کیفیت طاری ہو جاتی جیسے طویل گرم دن کے روزے دار کو افطاری نصیب ہوئی ہو، جیسے کسی سنگی فصیل میں کوئی روزن کھل گیا ہو۔ چونکہ پڑھنے کو کچھ میسر نہ تھا تو بس لکھتی رہتی بعد میں بے شمار رسائل اور کتابیں گھر میں پڑی رہتیں تو پڑھنے کا وقت نہیں ملتا تھا، جب کسی کو پڑھنے سے ہی محروم رہی تو کوئی دخیل کیسے ہو سکتا ہے۔ تخلیق کار کی مشاطہ خود قدرت ہوتی ہے۔ تخلیق کار ہوتا ہے یا نہیں ہوتا جو نہیں ہوتا وہ کاوش کر کے ہو نہیں سکتا کیونکہ فطرت نے اُس کے حصے کی فکر مشاہدہ اور غم خود اُسے ودیعت کیا ہوتا ہے اس کا تناسب اور زاویہ ہر ایک کے لیے الگ الگ ہو سکتا ہے۔

☆ اُس کیفیت میں ہمارے قاری کو شریک کیجیے جو آپ سے افسانہ لکھاتی ہے؟

☆☆ کوئی جملہ، منظر، واقعہ دِنوں دماغ میں گردش کرتا رہتا ہے جو از خود کسی متوازن شکل میں ڈھل جاتا ہے۔ کوئی مقصدی یا ارادی کوشش ہرگز نہیں ہوتی۔ افسانہ گھڑا نہیں جاتا۔ موجود واقعات اور افراد خود اپنی قوت سے تخلیقی رچاؤ اختیار کر جاتے ہیں یہ رچاؤ جس تکنیک، برتاؤ یا انداز پیشکش میں متشکل ہوتا ہے اسی چابکدستی کی بنا پر فن پارہ اعلیٰ یا ادنیٰ ٹھہرتا ہے۔ اسی لیے شدید متاثر کرنے والا واقعہ فوری افسانے میں نہیں ڈھلتا۔ واقعہ کو فن بننے کے لیے تخلیق کار کے دِل و دماغ میں اِک عرصہ بسر کرنا ہوتا ہے۔

☆ افسانہ ایک ہی نشست میں لکھتی ہیں یا قسطوں میں؟

☆☆ جس واقعہ یا کردار یا مکالمہ کسی تخلیقی صورت کو اختیار کرنے میں وقت لیتا ہے۔ اِسی طرح کہانی بھی اپنی آخری صورت تک پہنچنے میں قطع و بُرید کے عمل سے گزرتی ہے۔ پہلی بار تو جس طور خیالات وارد ہوئے، لکھے جاتے ہیں جو خاصی طویل شکل اختیار کر لیتے ہیں پھر اُن میں سے پُر اثر اور باربط حصے الگ کیے جاتے ہیں۔ اس لکھے کو بار بار پڑھنے اور بنانے سنوارنے کا عمل دِنوں، مہینوں کی ریاضت مانگتا ہے۔

☆ جب آپ بطور قاری اپنی تخلیق پڑھتی ہیں تو آپ کے احساسات کیا ہوتے ہیں؟

☆☆ جب کہانی کمپوز کروا کر بھجوا دی جاتی ہے تو لگتا ہے کہ اب اس پر مزید کام کرنے کا میرا حق ساقط ہو گیا۔ اب کہانی اپنی ذات کی خود مالک ہے۔ اُس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ زیادتی ہے۔ چھپنے کے بعد شاید ہی کسی کو دوبارہ کبھی پڑھا ہو، پھر اس میں ترمیم و اضافے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ افسانہ خاص تخلیقی لمحے یا وقت کی امانت ہے اُسی کے سپرد ادبی روایت میں اس کے معیار و مرتبے کا فیصلہ بھی وقت کے حوالے وہی منصف ہے۔

☆ آپ کے قلم سے اُن خوابوں کی نقاب کشائی ضروری ہے جو آپ اور خواتین اکثر دیکھا کرتی ہیں خاص طور سے تیسری دنیا کی خواتین۔ آج کے حالات میں تو پاکستان کا اختصاص بھی ضروری ہونا چاہیے؟

☆☆ ادیب کو کسی خاص مسلک کا حامل ادب تخلیق کرنے کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔ ادب معاشرے کی اِصلاح کا ذریعہ بھی نہیں بلکہ ایک خلاق ذہن کا اِظہارِ ذات ہے۔ تخلیق کا عمل اِنفرادی ہے اجتماعی نہیں کسی خارجی عمل کی نشر و اشاعت کا ذمہ دار بھی نہیں ہے لیکن اچھا ادب ایک پورے عہد کو محیط ہوتا ہے اور ایک خوب تر معاشرے کو وجود میں لانے کی سرگرمی کا نام ضرور ہے۔ ادب کا بنیادی موضوع انسان اور اس کی ہفت پہلو زندگی ہے۔ اس موضوع کی پیشکش کا انداز تو اپنا اپنا ہو سکتا ہے لیکن ادب کو زنانہ و مردانہ ادب میں تقسیم نہ کیا جانا چاہیے۔ افسانہ قضیۂ زمین بر سرِ زمین والا معاملہ ہے۔ اس لیے تخیل کے قدم بھی زمین پر جمے رہتے ہیں۔ فکشن مخصوص، زمان و مکاں اور زبان و لسان کا قیدی ہے اور یہ عمل کسی زندہ معاشرے اور متحرک عہد کے اندر ہی ممکن ہے، گویا افسانہ نگار تخلیق کا رَس اپنے زمانے اور معاشرے سے کشید کرتا ہے۔ پاکستانی ادیب خواتین بھی اپنی زمین، عہد اور حالات سے جڑی ہوتی ہیں اور ان کا پرتو تحریروں میں موجود ہے، یعنی ملکی، سیاسی، سماجی یا معاشی صورتِ حال سے جو مسائل اور حالات پیدا ہوتے ہیں ان کے تناظر میں معاشرے کے افراد جس کیفیت سے دوچار ہو جاتے ہیں جو عمل اور ردِعمل ظاہر کرتے ہیں جو نفسیاتی اور جذباتی کشمکش جنم لیتی ہے جو طبقاتی و گروہی سوچ پنپتی ہے جس طرح دماغی و جذباتی صحت متاثر ہوتی ہے۔ رُوحانی اور اخلاقی اقدار کی شکست و ریخت برپا ہوئی، جس کے نتائج ضمیر اور خمیر کو اُبھارتے یا مارتے ہیں یعنی انسانی زندگی کے اندرون میں اُس کے باطن میں جو تبدیلیاں رُونما ہوتی ہیں جن کا تعلق لامحالہ خارج کے واقعات کے اثرات سے جڑا ہوتا ہے۔ یہ سارا عمل ادب کی اقلیم یا موضوعات میں آ جاتا ہے۔ یہ سب رُجحانات عمل، ردِعمل اور تحریکات ادب کا خام مواد یا مصالحہ ہیں پھر خواتین ادیب ان حالات سے بے خبر

تو نہیں رہ سکتیں۔ تعلق چاہے پہلی دُنیا سے ہو کہ تیسری دُنیا سے اپنے اپنے ماحول اور مسائل کا پرتو تو موجود رہتا ہے۔

☆ چار دیواری کی باسی تیسری دنیا کی تخلیق کار کے تجربات، مشاہدات کا ماخذ بلخصوص آپ کی ذات کے حوالے سے کیا ہے؟

☆☆ آج دُنیا گلوبل ویلج کی اِصطلاح میں سمٹ چکی ہے۔ آج معلومات اور اِطلاعات کی ترسیل تیز تر ہو چکی ہے۔ اِس لیے چار دیواری کی باسی تخلیق کار بھی قریبی منظر نامے سے بے خبر نہیں رہ سکتیں۔ پاکستان کی اڑسٹھ سالہ تاریخ میں برصغیر کی تقسیم کے نتائج کشمیر کا رستا ہوا ناسور فلسطین کا قضیہ، ایران میں شہنشاہی کا خاتمہ سوویت یونین کا ٹوٹنا، نئی ریاستوں کا ظہور پذیر ہونا۔ بوسنیا، چیچنیا میں قتلِ عام، واحد سپر پاور کا عراق پر چڑھ دوڑنا اور افغانستان کو تہس نہس کرنا۔ نائن الیون کے بعد کے حالات پاکستان کا اتحادی بننا، ڈراؤن حملے اور خودکش بمباروں کی نئی اِصطلاح کا عام ہونا، تھرڈ ورلڈ، آئی ایم ایف، یونی پولر کا اِستحصال، جبریت، جنگیں، خانہ جنگی، وہی چنگیزی حیلے جن کے پیچھے اِستحصال، طاقت اور جبر کی پرانی روائتوں کا تسلسل جاری ہے۔ یہ حالات آج ہر خطے کو متاثر کر رہے ہیں۔ ان حالات میں خواتین لکھاری نہ تو رُومانی تخیلاتی یوٹوپیا میں بند رہ سکتی ہیں اور نہ ہی داخل اور دروں بینی کے قلعے میں محصور بلکہ سبھی امور کو ہیئت و اسلوب کے تنوع میں بیان دے رہی ہیں۔ وہ نہ تو بے حس ہیں اور نہ ہی کسی دوسرے خطے کی باسی، نسبتاً زیادہ حساس اور کہانی کہنے کی فطری جبلت سے مزین ان کے تجربات و مشاہدات اگر نسائی دُنیا کے گرد بھی رہیں تو بھی یہ دُنیا خارجی حالات سے اثرات قبول کرتی ہے یوں بھی موضوع کی عظمت اعلیٰ ادب پیدا کرنے کی ضامن نہیں ہے، بلکہ ادیب کی ہنر مندی، چابک دستی، تکنیکی بصیرت اور فنی عوامل کی سلیقہ مندی کسی تحریر کو ادب میں اُس کا جائز مقام دِلاتی ہے۔ موضوع اور فنی تقاضے مِل کر اچھے ادب پارے کو جنم دیتے ہیں اور یہ اُسی وقت ممکن ہے جب عصری حسیت کو فنی تقاضوں میں سمویا جائے۔

☆ مشاہدے کی بات ہے خوش شکل خواتین تخلیق کار لبرٹی لینے کی خواہش مند ہوتی ہیں۔ کچھ لوگ بھی آؤٹ آف وے اُنھیں اہمیت دیتے ہیں آپ کے ہاں صورتِ حال کیا ہے؟

☆☆ ورجینیا وولف یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ ادب کے میدان میں خواتین اس قدر کم تعداد میں ہیں۔ اُن کے لیے ادب تخلیق کرنا مشکل اور بعض حالات میں ناممکن کیوں بنا دیا جاتا ہے۔ آپ کا یہ سوال شاید ورجینا وولف کے سوال کا کسی حد تک جواب ہو سکتا ہے۔ خصوصاً پاکستان میں خواتین تخلیق کاروں کو ایسے ہی رویوں کو جھیلنا ہوتا ہے۔ میں نئی لکھنے والیوں کو ہمیشہ مشورہ دیا کرتی ہوں۔ اپنی صلاحیتوں پر اعتماد رکھو یہ کانفرنسز، سیمینارز، مشاعرے، ایوارڈز، مرد حاوی اِدارے ہیں۔ عورت کا وقار اور اَنا اِن سب سے کہیں بالاتر ہے۔ خوش شکل عورتوں کی نسبت تو بات کر دی آپ نے لیکن بوڑھے شاعروں، ادیبوں کے متعلق کیا خیال ہے جو ستر برس کی عمر میں بھی اٹھارہ برس کی لڑکی کے عاشق بن بیٹھتے ہیں۔ خواتین اساتذہ پی ایچ ڈی کی عمر رسیدہ طالبات کو بھی بیٹا کہہ کر پکارتی ہیں لیکن کبھی کسی مرد کی زبان سے بیٹا کا لفظ نہیں نکلتا، ہو سکتا ہے کچھ خواتین ان کو سیڑھی بنا کر زینے تلاش کرتی ہوں، جب چڑھ جاتی ہوں تو پھر کسی دوسری سیڑھی کا سہارا لے لیتی ہوں اور انھیں پٹخ دیتی ہوں، شاید یہ کسی مکافاتِ عمل کا سلسلہ ہو۔ میرا ایک اچھے زمیندار گھرانے سے تعلق ہے جو فطرتاً اکھڑ مزاج واقع ہوتے ہیں پھر شوہر سی ایس پی آفیسر ملا۔ اپنے گھر بچے پہلی ترجیح تھی۔ ادب تو ذاتی مجبوری ہے، اس کے آڑے کبھی اپنا وقار یا اقدار نہ آ سکتی تھیں نہ کبھی آئیں۔

☆ کچھ لوگ آپ کو پنجاب کی پچاس سالہ تاریخ میں سب سے اہم خاتون افسانہ نگار کس خوبی کے سبب گردانتے ہیں؟

☆☆ مجھے پھر اِس سوال سے مرد حاوی معاشرے کی بُو آ رہی ہے۔ میری یادداشت کے مطابق خواتین میں سے جمیلہ ہاشمی نے چند افسانے دیہی پس منظر میں لکھے۔ نجانے خواتین کی کس روایت کا آپ ذِکر کر رہے ہیں۔ بلونت سنگھ، بیدی، احمد ندیم قاسمی، منشا یاد وغیرہ نے دیہات نگاری میں تفوق حاصل کیا۔ اسی روایت میں ان چند خواتین کو بھی دیکھنا چاہیے۔ خواتین کو کسی الگ کونے میں لگانے کی کوشش مناسب نہیں پوری ادبی روایت میں اُن کے مقام و مرتبے کا تعین ہونا چاہیے۔

☆ کسی تخلیق کار کے لیے سندھ، پنجاب، بہار، بنگال کا دُم چھلاّ اُس کے امکانات محدود نہیں کرتا؟

☆☆ فکشن نگار کسی تاثر یا خیال کو کچھ واقعات میں ڈھالتا اور کچھ کرداروں پر اُسے وارد ہوتے ہوئے دکھاتا ہے یعنی افسانہ کسی خاص خطۂ زمین پر مخصوص انسانوں کے عمل اور ردِّ عمل میں وقوع پذیر ہوتا ہے، یعنی وہ خاص عہد معاشرت، حالات و واقعات اور کرداروں پر کہانی کی تعمیر کرتا ہے، اگر کہانی کی فضا پس منظر یا کردار اجنبی ہوں تو وہ اُن کے اندر اُترنے کی بجائے فاصلے پر کھڑا تماشائی رہ جائے گا یعنی کوئی بھی فن پارہ واقعیت و صداقت حاصل کرنے کے لیے قریبی مشاہدات کا محتاج ہوتا ہے۔ اچھا ادب اسی زمین سے اُگتا ہے، جس کی وہ جنس ہوتا ہے۔ اُس کی فضائیں، گیت، ہوائیں، پانی اور موسم اُس کی آبیاری کرتے ہیں گویا فن کار براہِ راست جس ماحول، خطے اور اُس کے حالات و مسائل کا حصہ ہوتا ہے۔ اُنھی سے فنی دیانت داری بھی برت سکتا ہے۔ محض کتابوں یا اخبارات کی معلومات سے تو فن پارہ جنم نہیں لیتا گویا ادب میں مقامی کردار یا زمینی و جغرافیائی فضاؤں کی رُوح موجود ہونی چاہیے۔ ہر خطے کا ادب کسی انسانی اساس اور مقامی فضا میں سے قومی اور عالمی مزاج حاصل کرتا ہے، یہی دُم چھلاّ تیسری دُنیا ہی نہیں پہلی دُنیا کے ادیبوں کی شناخت بھی بنتا ہے اور اِمکانات بھی واضح کرتا ہے، کیونکہ اہمیت زمان و مکاں کی نہیں تفہیم اور فنی صلابت کی ہوتی ہے۔

☆ جولوگ آپ کی کہانیوں میں ''لوک دانش'' کی نشان دہی کرتے ہیں وہ کس امر کی جانب توجہ دلا رہے ہیں؟

☆☆ یہ اَمر اپنی جگہ پر درست ہے کہ دیہاتی از خود فطرت کے زیادہ قریب رہتا ہے۔ موسموں، بارشوں، دھوپوں، آندھیوں، طوفانوں کا زیادہ فطری اور شدید سبھاؤ دیکھتا ہے۔ سچا ترش اور شدید عمل ایسے ہی براہِ راست اور دوٹوک ردِّعمل کو بھی جنم دیتا ہے۔ ان تجربات کا نچوڑ اُس دانش کو بھی پروان چڑھاتا ہے جو فطرت کے عمل و ردِّعمل سے خودرو پھل پھول کی طرح پھوٹتی ہے۔ جاہل چرواہے۔ اَن پڑھ عورتیں ہاری مرد ایسے نقطے کہہ جاتے ہیں جو بعد میں ہمیں زیادہ منظّم و مربوط فلسفوں کی صورت میں دانشوروں، فلسفیوں اور علماء کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ شاید یہی لوک دانش ہے۔ دیہات نگاری میں اکثر تصنع برتا جاتا رہا ہے۔ معصوم، سادہ پُرخلوص، بےغرض رویے گویا دیہاتیوں کا مستقل مزاج ہوں لیکن دیہات میں بسر کرنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ دیہی انسانی فطرت اس سے اُلٹ بھی ہوسکتی ہے۔ زیادہ ترش اکھڑ اور ظالم بھی ہوسکتی ہے۔ شاید دیہات میں سیاحت کرنے والے اِس حقیقت کو نہ جان پائیں لیکن جو وہاں جما پلا وہ اس فطرت کو زیادہ بہتر پیش کرسکتا ہے۔

☆ منشا یاد نے آپ کی نسبت ''فرسٹ ہینڈ نالج'' کی اصطلاح استعمال کر کے خاہ مخواہ اُلجھن پیدا کردی؟

☆☆ تخلیق خارج کے اثرات کو بھی باطنی واردات بنا کر پیش کرتی ہے۔ آمد اور آورد کی بات شاعری تک تو ٹھیک ہے لیکن نثر ٹیبل ورک ہے۔ چلتے پھرتے خیال کو کچھ واقعات میں ڈھالنے کی تکنیک یا بنت کا فیصلہ ہو بھی جائے تو بھی افسانہ قضیۂ زمین برسرِ زمین والا معاملہ ہے۔ اس لیے تخیّل کے قدم بھی زمین پر جمے رہتے ہیں کوئی واقعہ یا نظریہ اُس وقت تک ادب نہیں بنتا جب تک اس کے اندر شدت، تجربہ اور دروں بینی شامل نہ ہو جائے۔ زمینی حقائق یا واقعات کا خارجی بیان یقیناً فن نہیں ہے بلکہ اطلاع یا اخبار کی خبر ہے۔ اِس خبر کو کہانی بنانے کے لیے واقعے کے خارجی عوامل و تموّجات سے انسان کے باطن میں جو تبدیلیاں یا مدوجزر پیدا ہوتا ہے کہانی اُس داخلی فضا کو پیش کرتی ہے۔ یوں کوئی فن پارہ زیرِضمیر رہنے والے جذبات و احساسات کو مس کرتا ہے اور داخلی صورتِ احوال کو سامنے لے آتا ہے۔

☆ خارج سے زیادہ باطن کے افسانوں کی بات آمد اور آورد کی جانب روشنی تو نہیں ڈال رہی؟

☆☆ یہ اِصطلاحات عام ہو چکیں مغرب سے برآمدہ ان تھیوریز کو ہماری تحریروں پر لاگو کرنے کی کوششیں ضرور جاری ہیں۔ اُردو ناقدین ان جدید تھیوریز کو مغرب کی نقالی میں اِستعمال کر رہے ہیں۔ ان سبھی اِصطلاحات کے رواج کا زمانی دورانیہ اُس کے اُلٹ ہے جس ترتیب سے انہیں سوال میں بیان کیا گیا ہے۔ وجودیت کا دعویٰ ہے کہ وجود جوہر پر مقدم ہے انسان کا اِنفرادی وجود ہی اہم ترین شئے ہے۔ اس میں دروں بینی اور ذات کی غواصی کو مرکزیت حاصل ہے یہ سائنسی ترقی مارکسی نظریات، فاشزم اور نسل پرستی کے خلاف ایک بغاوت تھی جسے ہیگل فشطے ونٹ وغیرہ نے مقصدی اور عقلی نظریات کے ردِّعمل سے شروع کیا۔ اب دیکھئے کیا اس کا مرکزی فلسفہ ہمارے ہاں موجود نہیں رہا ہے کیا انسان احسن التقویم نہیں کہا گیا کیا دروں بینی اور احترامِ آدمیّت مقدم نہیں رہا۔ ہم شاید جدید فیشن میں اپنی روایتوں کو بھول جاتے ہیں، البتہ جدیدیت ایک ہمہ گیر اِصطلاح ہے، جو برسوں سے استوار معیاروں اور روشوں کو پایۂ استناد سے گرانا چاہتی ہے یعنی ماضی کے تمام تیقنات و اِستحکامات اپنی مضبوطی اور بنیادوں سے محروم ہوتے چلے گئے۔ سرمائے شہنشاہیت، پاپائیت، جہالت و اوہام پرستی کے اِتحاد کے خلاف یہ ایک اِحتجاج تھا اور مابعد جدیدیت اس سے آگے کی منزل ہے جو لا اِنسان اور مابعد اِنسان سے آغاز کرتی ہے، جو انسان کی عظمت یا مرکزیت کی مکمل نفی ہے یعنی کوئی سچائی حتمی یا کوئی عمل حرفِ آخر نہیں مسلسل تبدیلی اور توڑ پھوڑ کا عمل ہی اہم ترین سچائی ہے، جب کہ ساختیات کا علمبردار رولاں بارتھ جولیا کرسٹو وغیرہ نے Intertexuality and Text کی اِصطلاح پر توجہ دی۔ ژاک دریدہ کی اِصطلاح Deconstruction میں بھی متن کے متعین معنی کو بےدخل کرنے کا رُجحان سامنے آیا یعنی پسِ ساختیات الفاظ کو کوڈ ورڈز کا درجہ دے دیتی ہے۔ ان سب بحثوں پر اعتراضات اپنی جگہ پر برقرار ہیں۔ کیا یہ ضروری ہے کہ اِن نظریات کو خارج سے ٹھونسا جائے جب کہ افسانہ اپنی ذات میں خود متکفی ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ماڈرن کہلانے کے لیے مغربی جدید اِصطلاحات کے اثرات کو خارج سے قبول کر کے اپنی تحریروں میں اُنہیں ضرور اپنایا جائے۔ ان نظریات کی آمد سے بیشتر بھی اُردو ادب میں انسانی عظمت یا بےقدری۔ معاشرتی تقسیم یا انسانیاتی بنیادوں کی توڑ پھوڑ زبان کے تجربات اور اِنفرادی اِصطلاحات وغیرہ کا چلن موجود رہا ہے۔ ہمارے ہاں بھی پسی ہوئی اقوام اور نظر انداز ارزل طبقوں کی نمائندگی ادب میں خوب ہوئی ہے۔ غیر محسوس اور غیر اِرادی طور پر ان مطالب کا کھوج میرے افسانوں میں بھی لگایا جاسکتا ہے لیکن یہ مغرب کے زیرِ اثر ہرگز نہیں ہے، لیکن افسوس ہمارا نقاد بھی مغربی تھیوریز کا اعادہ تو کرتا ہے، اُنہیں عملاً تحریروں میں برتنے کی طرف رجحان کم ملتا ہے۔ حالانکہ Post Colonialism بھی ایک جدید اِصطلاح ہے اور اس کے اصولوں کے مطابق تخلیق ہو چکے گزشتہ ادب کو پھر سے آج کے نئے تناظر میں پڑھنے کی ضرورت ہے۔ Double Reading سے کچھ ایسے عناصر سامنے آتے ہیں جو نئے عہد اور نظریات سے مطابقت رکھتے ہیں اور غیر اِرادی طور پر اُس وقت کے ادب میں در آئے تھے۔

ادب ایک جہانِ معنی ہے جو خارجی فلسفوں اور نظریات کے پرچار کا آئینہ نہیں ہے ہاں اس سے فلسفے اور نظریات اخذ کیے جاسکتے ہیں اور بہت سی انسانیاتی بنیادیں اور دانش و نظر اس کا ہمیشہ حصہ رہی ہیں لیکن کوئی جدید تکنیک کسی

کامیاب ادب پارے کی ضامن نہیں ہے۔

☆ آپ کے افسانے کو روسی افسانے کا تسلسل کس بنا پر گردانا جاتا ہے؟

☆☆ روسی سے مطلب مارکسزم ہے یا اس سے پہلے کا افسانہ ہے۔ میرے مطالعہ میں یہ ادب نہیں آیا کچھ کہہ نہیں سکتی۔

☆ آپ کی کہانیوں میں ضعیف الاعتقادی کی حوصلہ افزائی کثرت سے نظر آتی ہے؟

☆☆ ہرگز نہیں بلکہ دیہی معاشرہ میں پائے جانے والے عنصر کو ہمیشہ طنزیہ پیش کیا ہے۔

☆ گوبر اور کیچڑ سے کھیلنے کا شوق آپ کو کب اور کس سبب ہوا؟

☆☆ میں ایک بڑی حویلی کی بیٹی تھی، جہاں ہر سو پھرنے والی خادمائیں ہمیں بڑھا چڑھا کر مخاطب کرتیں۔ میری چھٹی حس مجھے بار بار احساس دلاتی کہ اس چھوٹے سے گاؤں کی راجدھانی کے باہر ایک وسیع دُنیا آباد ہے جس میں ہماری حیثیت صفر ہے۔ یہ شہزادگی صرف اس کشادہ چار دیواری کے اندر ہی ہے۔ بچپن میں ان نوکروں، مزارعوں کی جھگیوں میں جانے کا شوق تھا کیونکہ اُن کی آزادی اور بے خبری مجھے ہانٹ کرتی، گوبر اور غلاظتوں سے اَٹے بغیر چار دیواری کے صحن دھویں اور بو سے بھری جھگیاں اِتنا فرق دونوں گھروں میں لیکن یہ جھگیاں گوبر اور کیچڑ زیادہ پُراسرار معلوم ہوتا، اگر ان دو لفظوں کو آپ نے کسی علامتی پیرائے میں اِستعمال کیا ہے تو بھی گوبر اور کیچڑ کسی زمین کی آلائش نہیں، بلکہ فطرت ہے۔ ارزل طبقات کی عکاسی چاہے گلیمر نہ پیدا کر سکے لیکن یہ ارزل اپنی فطری بے ساختگی ازلی کمینگیوں بھوکوں اور دُکھوں سے دھرتی کا سینہ یوں لتھڑ پتھڑ دیتے ہیں کہ ان سے دامن بچا کر نکلنا ممکن نہیں رہتا۔ حوادث اور واقعے انھی کے لیکھوں میں لکھے گئے ہیں۔ اشرافیہ تو ایک یکساں رویہ ہے۔ اس میں ایسا تنوّع کہاں۔

☆ آپ کے ہاں مرد اور عورت کے تعلق کو اس قدر زیادتی سے برتنے کے اسباب کیا ہیں؟

☆☆ میں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گاؤں میں گزارا اب بھی وہاں جا کر رہتی ہوں، وہاں کی سیاست، معاشرت، معیشت، تہذیب، زبان واضح طور پر عورت اور مرد کے تناظر میں بٹی ہوئی تھی، پوری معاشرت انہی شدید رویوں کے گرد گھومتی ہے۔ افسانہ انسانوں کو مرکزی حیثیت دیتا ہے۔ حیوانات کے اِستعارے، تجسیم، فلسفہ، تلازمۂ خیال، شعور تحت الشعور، اسطور وغیرہ بحیثیت پروفیسر اُردو میرے لیکچر کا حصہ ضرور ہوتے ہیں، لیکن افسانہ سامنے کے زندہ اور موجود انسانوں کا فطری اِظہار یہ ہے جو یقیناً مرد وزن ہی کہلاتے ہیں۔ شدت اور اِنتہا کا کوئی ناپ تول ان روابط میں شاید موجود نہیں ہے۔

☆ کچھ لوگ اس کے ڈانڈے نفسیاتی اُلجھن سے بھی جوڑتے ہیں؟

☆☆ نفسیاتی تنقید کی بنیاد کو فرائیڈ کے نظریہ لاشعور پر رکھا گیا پھر ایڈلر اور ژنگ وغیرہ نے اس میں گہرائی پیدا کی اور شعور، لاشعور، تحت الشعور اجتماعی شعور وغیرہ کی اِصطلاحات مروّج کیں لیکن انسان کی سائیکی اور ذہن کی بدلتی کیفیات کے حوالے سے ادب کو پرکھنے کی کوششیں پرانی ہیں اور ادب میں Oedipus کے نظریے کو عملاً برتا گیا ہے لیکن اِس عمل میں حد درجہ احتیاط کی ضرورت ہے ورنہ ایسے نتائج اخذ کیے جاتے ہیں جن کا تعلق مصنف کی زندگی یا نفسیات سے دُور کا بھی نہیں ہوتا جیسے ڈاکٹر وحید قریشی نے عطیہ فیضی اور شبلی نعمانی کی عالمانہ خط کتابت سے شبلی کی حیاتِ معاشقہ جیسی کتاب لکھی جو ان کے ساتھ ایک زیادتی ہے۔ سنسنی پھیلانے کی ایسی کئی کوششیں موجود ہیں اس سوال میں بھی اسی سنسنی کی خواہش نظر آتی ہے۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

☆ چلیے! یہ بتلا دیجیے کہ ایک مہذب معاشرے کے تخلیق کار کی تخلیق میں سیکس کا تناسب کتنے فیصد ہونا چاہیے؟

☆☆ ادب کوئی فارمولا نہیں ہے۔ نہ ہی کسی خاص رجحان کے تناسب کی ضرورت ہے۔ افسانہ نگار کی اقلیم وہ حالات ہیں جن سے دوچار ہو کر افراد یا فرد کسی ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی کشمکش سے دوچار ہو جاتا ہے۔ اس کشمکش کی جاندار عکاسی فن کی چابکدستی ہے۔ ادیب کے سامنے تلذذ پیدا کرنے کا کوئی جواز بھی نہیں ہے اس کے ذرائع دوسرے ہیں۔ ادب عمومیت کا نہیں خصوصیت کا قائل ہے، وہی حالات واقعہ بننے کی قوت رکھتے ہیں جو منفرد ہوا کرتے ہیں۔ فرق یہاں پڑھنے والے کی اپنی اُپج اور سوچ کا ہے۔ آپ نے منٹو کا ذِکر کیا۔ اُن کے نفسیاتی نوعیت کے کتنے افسانے ہوں گے چار یا پانچ جن کی وجہ سے اُنھیں عدالتوں میں گھسیٹا گیا اور منٹو کا نام فحش نگاروں کی ذیل میں چلا گیا'' کالی شلوار''، ''اُوپر نیچے اور درمیان''، ''کھول دو'' میں کونسا فحش عنصر ہے۔ زیرِ منقار معاشرتی سنگینیاں ہیں۔ ''ٹھنڈا گوشت''، ''بو'' نفسیاتی افسانے ہیں۔ معلوم نہیں قرآن پاک کی بعض آیات پر اب تک پابندی کیوں نہیں لگائی جا سکی۔ تخلیق میں کسی بھی تناسب کا کوئی پیمانہ موجود نہیں۔ ہاں پڑھنے والا کوئی تناسبات پیدا کر لے تو یہ اُس کی اپنی مجبوری ہے۔

☆ اگر آپ کو منٹو کا نسوانی پیکر کہا جائے تو آپ ناراض ہوں گی یا خوش؟

☆☆ وہی لکھنے والے جینے کی صلاحیت رکھتے ہیں جو چبائے نوالے نہیں چباتے، جو اپنی راہ خود کھوجتے ہیں جیسا کہ منٹو نے کیا۔ منٹو کے افسانوں کا لینڈ اسکیپ اس معاشرت میں ڈھلے کردار، فضائیں، ہوائیں، میرے لیے بالکل اجنبی ہیں۔ میرے افسانوں کا لینڈ اسکیپ دوسروں کے لیے شاید اجنبی ہو گا یعنی کسی کے قدموں کی آہٹ بن کر اپنے قدموں کا اعتبار کبھی نہیں ملتا۔

☆ آپ کا تحقیقی مقالہ بھی منٹو پر ہے۔ اسے اتفاق کا نام دیا جائے یا ذہنی قربت سے موسوم کیا جائے؟

☆☆ ''منٹو کا اسلوب'' بہت بعد میں لکھا گیا تب کسی سے اثر قبول کرنے کی عمر گزر چکی تھی۔ ہاں یہ اُردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار کا بھرپور اعتراف

ضرور ہے،اسی لیے اسے منٹو پر لکھی جانے والی کتابوں میں اعتبار حاصل ہوا۔ میں نے تو پی ایچ ڈی کے مقالے میں سبھی اُردو افسانہ نگاروں کا تفصیلی تجزیہ پیش کیا۔ سبھی سے اثرات قبول کرنے کا جواز تو نہیں بنایا جاسکتا اسے۔

☆ آپ کو جاگیرداری نظام توڑنے کا کریڈٹ دینے والے اس نظام کے مزید طاقتور ہونے سے بے خبر کیوں ہیں؟

☆☆ اس میں شک نہیں کہ پرانے زمیندار گھرانے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکے ہیں لیکن ایک ادیب نہ تو لیڈر ہوتا ہے نہ ہی مصلح محض نشاندہی کرسکتا ہے۔ سیاست، حکومت معیشت کے نظاموں کی کمزوریوں کی سمت اِشارہ کرسکتا ہے۔ اب ہوا یہ ہے کہ قدیمی خاندان تو ختم ہورہے ہیں لیکن صنعت کاروں سرمایہ داروں کو فیوڈل لارڈ بننے کی شدید بیماری لگ گئی ہے۔اس لیے پنجاب کی سطح تک ٹوٹ پھوٹ کا شکار یہ نظام نئے حوصلوں سے نئے خاندانوں میں پھر سے منظم ہورہا ہے کیونکہ اُس کی طاقت اور تفاخر کا جو نشہ ہے وہ اور کسی سرمائے یا اِقتدار میں نہیں ہے۔

☆ کچھ لوگ آپ کے افسانے کو ڈرامے سے تشبیہ بھی دیا کرتے ہیں؟

☆☆ شاید اِس لیے کہ منظر کشی، جزئیات نگاری، مرقع کشی، محاکات نگاری، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، افسانے کا بھی حصہ ہیں۔فن کے ڈانڈے آپس میں مِل جاتے ہیں۔فنونِ لطیفہ کے معیارات وتاثیر اکثر یکساں ہوجاتے ہیں۔

☆ آپ کے نظریاتی تال میل میں عدم توازن سے کیا مراد ہے؟

☆☆ نظریاتی عدم توازن سے آپ کی کیا مراد ہے۔ادیب عموماً خیر اور بھلائی کا متلاشی ہوا کرتا ہے۔وہ کسی خارجی نظریہ سازی کا حامل ادب تخلیق نہیں کرتا، تا آنکہ اس نظریے سے نظریاتی طور پر متفق ہو۔کسی افسانے سے اپنے مؤقف کے لیے کوئی مثال دی جاتی تو شاید وضاحت ممکن ہوسکتی۔

☆ آپ کی زبان اس قدر مشکل اور پیچیدہ کیوں ہے؟

☆☆ فن پارہ اپنی زبان خود لے کر وارد ہوتا ہے، اگرچہ اسلوب، خیال کے اُس تخلیقی اظہار کا عمل ہے جو اپنے عہد کی شناسا زبان میں معرضِ اظہار میں آتا ہے لیکن صاحبِ اسلوب اپنی افتادِ طبع سے اُس میں تخیلی ردّوبدل کی اِستعداد رکھتا ہے۔زبان کے اُستاد کی طرح وہ صرف کتابی واِکتسابی امور تک محدود نہیں رہتا۔ اسلوب کوئی جامد شئے نہیں ہے۔اپنے عہد کے مروّجہ اظہار کے سانچوں سے انحراف یا تبدیلی لائی جاسکتی ہے جسے وقتی ناقبولیت کا سامنا بھی ہوسکتا ہے لیکن جس مٹی، تہذیبی یا لسانی عادتوں سے کہانی اُٹھتی ہے اُن کا عمل دخل کہانی کی ضرورت بن جاتا ہے۔مقامی یا نامانوس لفظیات کے مترادفات، تاثر اور واقعیت، پیدا نہیں کرسکتے مثلاً لفظ ''تھوبا'' گندھی ہوئی مٹی کی مٹھی کہہ کر اس کی اصل صورت اور خصلت کو پیش نہیں کیا جاسکتا مثلاً ''اشناک'' اب یہ لفظ نازک مزاج یا نخریلی کے معنی میں تو ضرور ہے لیکن ان لفظوں میں وہ خاص تہذیبی رچاؤ نہیں آسکتا جو ''اشناک'' میں آئے گا تو وجہ واقعات کرداروں اور مخصوص زمینی مزاج کی عکاسی بنتی ہے۔

☆ کردار نگاری میں بھی آپ اکثر حد سے تجاوز کرتی نظر آتی ہیں۔بہت سے کردار تو اس قدر منہ زور نظر آتے ہیں ''کبھی کسی لڑکے کو چکھو، بڑا وحشی ذائقہ ہوتا ہے، جنگلی پھل جیسا، چھری سے نہیں دانتوں سے کھایا جاتا ہے'' خواتین تو کجا مرد قلم کاروں سے بھی خال خال ایسی توقع کی جاتی ہے؟

☆☆ اگر سیاق وسباق سے ہٹا کر چند جملوں کی بنیاد پر کوئی حکم نافذ کیا جائے تو یہ تحقیق وتنقید کے شایانِ شان نہیں ہے۔میرا تعلق دیہی معاشرے سے ہے۔زندگی چار دیواری کے اندر پابند اور اِنتہائی شریفانہ ماحول میں بسر ہوئی۔ بچپن کے اِبتدائی چند برسوں کے بعد خارجی دُنیا سے ربط منقطع رہا لیکن حویلی کے اندر نوکرانیاں، مزارعیاں بہت تھیں، جن کی آپس کی لڑائیاں، گالیاں کوسنے اُس اُجڈ معاشرت میں ہرگز کسی فحاشی کی دلیل نہ سمجھے جاتے تھے۔یہ اُن کا روزمرہ اور محاورہ تھا، جب اُس معاشرت کی عکاسی کی تو ان کے بیانیہ اور کردار کا حصہ اُن کی زبان بھی اِستعمال ہوئی۔باہر والے چاہے اُن سے اپنے مطالب اخذ کرتے رہیں لیکن وہاں یہ گالیاں اور لفظیات ، بے معنی اور محض شدت جذبات کے ترجمان بن جاتے ہیں۔

☆ آپ کے بیشتر کردار شکست خوردہ نظر آنے کی وجوہات کیا ہیں؟

☆☆ اس سوال کی وضاحت کے لیے میں اسد محمد خان کے ایک تبصرے کا اِقتباس دینا چاہوں گی۔لکھتے ہیں'' تاہم جاری زندگی کی حقیقی دہشت ناکی میں ایک بات بڑی حوصلہ دینے والی ہے وہ یہ کہ طاہرہ اقبال کی کہانی کا ہر کردار چاہے وہ کیسا ہی شکست خوردہ اور پٹا پٹایا کیوں نہ ہو۔کیسی ہی گند اور کیچڑ میں لتھڑا ہوا کیوں نہ ہو۔وہ کسمساتا ہوا کروٹ لے کر اُٹھ بیٹھنے، جیسے تیور رکھتا ہے۔یہ بات میں نے بین السطور دیکھی ہے۔یہ بہت زیادہ Pronounced شاید نہ ہو۔کیوں کہ ان بی بی نے کسی Subtle انداز میں ایسا کچھ ضرور کر دیا ہے کہ مجھے ان کے کچلے ہوئے کردار بھی پوری طرح ہارے ہوئے نہیں لگتے اور یہ بات انھوں نے بہت سے لفظوں میں نہیں کہی۔'' شاید اس کے بعد میرے کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہتی۔

☆ آپ کے ہاں بیانیہ طویل ہونے کا سبب یہ خوف تو نہیں کہ افسانے میں لینڈ اسکیپ کی تفصیلات لازمی ہونا چاہیے؟

☆☆ لکھنے والا کوئی فارمولا طے کر کے نہیں لکھتا۔کہانی آپ خود کو لکھواتی ہے۔کوئی تفصیل، کوئی مکالمہ، فضابندی، جزئیات نگاری، کوئی جملہ ایسا نہیں اِستعمال ہوسکتا جو کہانی کے بنیادی تھیم سے جڑا ہوا نہ ہو، یا اُسے تقویت نہ دے رہا ہو۔بیانیہ کے مختصر اور طویل ہونے کا اِنحصار کہانی کی مرکزی بنت سے ہوا کرتا ہے۔کردار کی تاثریت، تھیم کا ابلاغ خود اپنی حدود واِکناف متعین کرتا ہے۔بیانیہ اسی کے تابع ہوا کرتا ہے۔

☆ جب آپ پاکستان سے نکل کر بھارت، بنگلہ دیش کے سفر پر جاتی ہیں تو کن چیزوں کا تقابل آپ کو خوش یا ناخوش کرتا ہے؟

☆☆ زندگی میں کوئی زیادہ سفر تو آئے نہیں اِبتدائی زندگی کے پچیس چھبیس برس تو حویلی سے باہر شاید ہی کسی زندگی کو دیکھا ہو۔ شادی کے بعد تھوڑی دُنیا دیکھی تو حیرت ہوئی چونکہ تعلق زمین اور اُس کی تفصیلات سے رہا تو دھرتی کی محبت شدت سے وجود میں اُتری۔ فصلوں، فضاؤں، اجناس، انسانوں کا موازنہ ضرور اُبھرتا ہے، چونکہ بھارت، بنگلہ دیش جانے کا موقع مِلا تو ہمارے ثقافتی زمینی اور تاریخی ربط کی وجہ سے موازنہ اُبھرتا رہا۔

☆ اردو ادب اور ادیب اگر آپ سے بڑے کینوس کے ناول کی اُمید کریں تو اُنہیں کس طرح کی صورت حال کا سامنا ہوگا؟

☆☆ نیلی بار ناول تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔ پاکستان کے مختلف سیاسی ادوار اور ملکی صورتِ حال نے دیہی معاشرت کو کس انداز میں متاثر کیا، یہی اس کا بنیادی تھیم ہے۔ ''گراں'' پوٹھوہار کے پس منظر میں لکھا گیا ہے جس کا ایک حصہ مکمل ہو چکا ہے۔ دوسرا حصہ پوٹھوار سے باہر کی دُنیا پر مشتمل ہے جو لکھنا باقی ہے۔ اصل میں کبھی ایک وقت میں ایک چیز نہیں لکھی دو تین چیزیں اکٹھی زیرِ تحریر رہتی ہیں اور تقریباً اکٹھی مکمل بھی ہو جاتی ہیں۔

☆ آپ اردو زبان کی اُستاد ہیں۔ کبھی اردو ادب کی ترقی و ترویج کی بابت دھیان نہیں گیا آپ کا؟

☆☆ کہا جاتا ہے کہ دُنیا میں سات ہزار زبانوں میں سے تقریباً تین ہزار زبانیں مر چکی ہیں، اور عالمی سطح پر ہر دو ہفتوں میں ایک زبان متروک ہو کر مردہ ہو رہی ہے۔ اُردو خوش قسمتی سے رابطے کی زبان ہے جو خود تو کوئی علاقہ یا جغرافیائی قومیت نہیں رکھتی لیکن مختلف علاقوں اور قومیتوں کو باہم جوڑنے کا سبب ضرور ہے۔ اس کا اپنا کچھ بھی نہیں لیکن کئی ایک بڑی زبانوں سے مستفید ہو کر ثروت مند بنی، اس کے آغاز و اِرتقاء کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں لیکن اپنی فطری لچک اور انجذاب کی صلاحیت کی بنا پر مضبوط روایتوں اور سرمائے کی حامل ہے اسی لیے قدیم تاریخ رکھنے والی زبانوں کے ہمدوش ہوئی خصوصاً پنجابیوں نے اسے یوں گلے لگایا کہ اپنی ماں بولی کی نسبت اس کی محبت زیادہ دکھائی، لیکن اپنا رنگ بھی اس میں اُنڈیل دیا اسی لیے آج پاکستانی اُردو ہندوستانی اُردو سے مختلف اطوار کی حامل ہے۔ یہ جواز اس کے زندہ رہنے کو کافی ہیں۔ ہر شہر سے رسائل و جرائد نکل رہے ہیں پھر کس نے کبھی اچھا ادب تخلیق کیا سوائے اپنی مادری یا اوّلین زبان کے جب تک یہ اوّلین زبان رہے گی تو زندہ بھی رہے گی۔

☆ کچھ تفصیل ارادوں اور مُرادوں کے حوالے سے بیان کیجیے کہ آپ کیا کچھ کرنے کے لیے کمربستہ ہیں؟

☆☆ کبھی کوئی پلاننگ تخلیقی کام سے متعلق ہو نہیں سکتی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی افسانہ مہینوں اِلتوا کا شکار ہے اور کبھی کوئی دِنوں میں ہو جائے۔ یہ عمل تقدیر فطرت یا اَن دیکھے مستقبل جیسا ہی ہے۔ کون جانے کب کیسا دن طلوع ہو فطرت کونسی کروٹ لے، تقدیر کیا لکھ دے یا لکھا ہوا مٹا دے۔ غالب نے بہت لکھا لیکن اِنتخاب کیا مختصر سا دیوان جو سب سے ارفع ٹھہرا۔ پطرس کل گیارہ مضامین لکھ کر جاوِدانی حاصل کر گیا۔ منٹو جن افسانوں کی وجہ سے معتوب ٹھہرا وہی اُس کی شناخت ہو گئے۔ یہ سب ہو جاتا ہے کیا نہیں جاتا۔ دیکھیے آئندہ موسموں میں تخلیق کی زمین سے کیا پھوٹتا ہے۔

☆ اپنی بابت تنقیدی اور تحقیقی کام کی نسبت آپ کے ہاں کس قدر اطمینان پایا جاتا ہے؟

☆☆ ہر کام کے تسلسل کو قدرت جاری رکھنے کا انتظام کرتی ہے۔ فصلوں کو اُگنا ہے، فیکٹریوں، دفتروں کو چلنا ہے۔ ادب کے تسلسل کا دیا جلانے میں ہر ایک کو اپنا اپنا حصہ ڈالنا ہے، کچھ کا حصہ معتبر ہو کر رہ جاتا ہے کچھ کا بھلا دیا جاتا ہے شاید یہ اس حصے کی ریاضت اور نصیب پر منحصر ہے۔ اس سفر میں اطمینان نہیں ہوتا۔ یہ اندر کی مجبوری ہے جو فن کے ستار چھیڑے رکھتی ہے۔ فضا میں پھیلتے سروں کو سماعتیں میسر آئیں کہ صدائے صحرا بن مٹ جائیں کون جانے آنے والا کل اپنے معیارات اور قبولیت کو کس انداز میں ساخت کرے یہ تو بس اپنے حصہ کا کام ہے، جسے کرتے رہنا ہے فیصلہ تو کہیں اور ہوگا۔

☆ وطن عزیز کی علمی، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی گاڑی جس تیزی سے پٹڑی سے اُتر رہی ہے اُس کے بعد مستقبل کے امکانات کیا رہ جاتے ہیں؟

☆☆ پرانی تحریروں کو اُٹھا کر دیکھیے ہر موجود علمی ادبی ثقافتی معیارات کے تبدیل ہونے اور اقدار کے مٹ جانے کا رونا رویا جاتا رہا ہے۔ شاید یہ رویہ وقت کے ساتھ چلنے اور بدلتے ہوئے عہد کو لبیک کہنے کے مترادف ہے۔ گزرا ہوا ہر اچھا اور آنے والا ہر بُرا ایک منفی رویہ ہے۔ سب موجود رہتا ہے بلکہ زیادہ نفیس اور پُرتعیش ہو رہا ہے۔ شادیاں تہوار میلے ٹھیلے تعلیم ادبیات تخلیق بھی ایک اہم جاری سرگرمی ہے۔

☆

''سزائے موت''

امریکی ریاست جارجیا میں 70 سال میں پہلی بار خاتون کو سزائے موت دے دی گئی۔ تفصیلات کے مطابق 47 سالہ کیلی گنڈیز کو جیل میں انجکشن دے کر ہلاک کیا گیا۔ خاتون کو اپنے شوہر کو قتل کے جرم میں رواں برس فروری میں سزا ہوئی تھی۔ رومن کیتھولک کے مذہبی پیشوا پوپ فرانسس نے بھی کیلی کی سزا روکنے پر زور دیا تھا تاہم امریکی سپریم کورٹ نے کیلی کے وکلاء کی درخواست آخری وقت میں مسترد کر دی تھی۔

جدید اسلوب کی نمائندہ

منشایاد

(●)

اسلام آباد میں منعقدہ طاہرہ اقبال کے پہلے افسانوی مجموعے ''سنگ بستہ'' کی تعارفی تقریب میں جہاں میں نے اس کے بہت افسانوں کی تعریف کی وہاں بعض افسانوں پر طوالت اور ناموں کی تذکیر و تانیث میں کنفیوژن کے حوالے سے تنقید بھی کی تھی جس کی پاداش میں انہوں نے مجھے آج کی تقریب کا صدر بنا کر گویا میرا منہ بند کر دیا کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ صدر ملک کا ہو یا کسی ادبی تقریب کا اس کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے اور ملک یا تقریب کا دفاع کرنا اس کا فرض بن جاتا ہے۔ چنانچہ اب میرا فرض اور نعرہ ہے ''سب سے پہلے طاہرہ اقبال''

سچی بات یہ ہے کہ جب میں نے ان کا دوسرا مجموعہ ''ریخت'' پڑھا اور بعض کہانیوں کو پوری طرح سمجھنے کے لیے کئی کئی بار پڑھنا پڑا تو مجھ پر ان کی تکنیک کے بہت سے بھید کھلے۔ مثلاً یہ کہ کرداروں کے ناموں میں تذکیر و تانیث کا کنفیوژن کوئی عیب نہیں بلکہ تجسس پیدا کرنے کے لیے وہ جان بوجھ کر پیدا کرتی ہیں۔ کرداروں کا پورا تعارف نہ کرانا اور قاری پر چھوڑ دینا کہ وہ خود کھوج لگائے کون کیا اور ایسا کیوں ہے، ان کی تکنیکی ہنرمندی کا حصہ ہے۔ کہانی کے جگنو کو وہ مٹھی میں بند کر لیتی اور مٹھی کو سہجے سہجے اور تھوڑا تھوڑا کر کے کھولتی چلی جاتی ہیں۔ بعض اوقات اس خیال سے کہ اتھلے پانی میں مفہوم کی مچھلی آسانی سے پکڑی جا سکتی ہے وہ اسے گہرے پانی میں چھپا دیتی ہیں جیسے پانی کے کھیل میں لڑکے غوطہ لگا کر تہہ میں خربوزے بو آتے ہیں۔ جہاں کہیں موضوع زیادہ نازک ہو وہ مفاہیم پر ایک ساتھ کئی کئی پردے ڈال دیتی ہیں۔ تشبیہات کی جالیاں، علامتوں کی چادریں اور استعاروں کے اچھاڑ جیسے مکئی کے کھیت میں ہوس ناک نظروں سے بچنے کے لیے ہری، من بھری، نو لاکھ موتیاں جڑی، پرت در پرت ساوا اچھور دوشالہ اوڑھے کھڑی ہوتی ہے۔ مثال دیکھئے۔

''دھول کے پاؤڈر میں لپٹی ہوئی پلکیں سائیں نے اٹھائیں۔ سارا وجود نچڑ کر آنکھوں میں سمٹ آیا۔ نظروں کے سارے گرز فرح پر برس گئے۔ تندو تیز برق کی لاٹ کوندی۔ سارے ویرانے چکا چوند سے لبالب ہو گئے۔ دیا سا سورج اس چانن میں غرق ہو گیا۔ عرش کی نورانی کھڑکی وا ہو گئی۔ دھول میں لپٹے زرد کیچوے لودینے لگے۔''

میری یہ شکایت کہ پہلے مجموعے میں بعض افسانے غیر ضروری طوالت کا شکار ہو گئے اور دو تو بتیس اور تینتالیس صفحات پر محیط تھے انہوں نے اب دور کر دی ہے۔ افسانوں کی طوالت کے حوالے سے میں نے ایک سال میں تین خواتین اور مرد افسانہ نگاروں کو ناراض کیا ہے۔ ان میں سے کراچی کی ایک خاتون سے مجھے یہ شکایت تھی کہ ان کے افسانے ضرورت سے زیادہ مختصر کیوں ہیں۔ میرا موقف ہے کہ اگرچہ یہ کوئی قاعدہ کلیہ تو نہیں اور نہ ہی اس سلسلے میں اب تک کوئی حتمی اصول وضع کیا جا سکا ہے کہ ایک اچھے افسانے کو کتنے صفحات یا منٹوں میں ختم ہو جانا چاہیے مگر جب آپ کسی افسانے کو کہیں کہیں چھوڑ کر پڑھ سکیں اور قصے کا تار ٹوٹے نہ کہانی کے تاثر میں کوئی کمی واقع ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ افسانے کو ڈائٹنگ اور ایڈیٹنگ کی ضرورت ہے۔ اور اگرچہ طوالت افسانے، قاری اور خود افسانہ نگار کی دشمن ہے اور غزل کا سا ایجاز واختصار اس کی خوبی، اسی لیے اس سے مختصر افسانہ یا شارٹ سٹوری کہتے ہیں مگر اسے اتنا مختصر بھی نہیں ہونا چاہیے کہ کسی کردار، خیال یا جذبے کی کوئی تصویر ہی نہ بن سکے۔ طاہرہ نے دوسرے مجموعے تک آتے آتے یہ راز پا لیا ہے۔ اب ان کی کوئی کہانی بارہ تیرہ صفحات سے زیادہ نہیں ہے۔ کتاب کی سب سے طویل تحریر چودہ صفحات کی ہے اور وہ برادرم یونس جاوید کا لکھا ہوا دیباچہ ہے۔ وہ اندھیروں اور اجالوں کے بادشاہ ٹھہرے چاہیں تو ایک سو چودہ صفحات کا دیباچہ بھی لکھ سکتے ہیں۔ طاہرہ اقبال کی تقریباً ہر کہانی ایک سے زیادہ بار کی خواندگی مانگتی ہے اور ہر خواندگی میں نئے نئے مفاہیم کھلتے چلے جاتے ہیں۔ خاص طور پر ریخت، گندا کیڑا، دیسوں میں، ملیچھ، کھندے، نا گفتنی اور جوڑا گھوڑا۔ کھندے میں نے تین یا شاید چار مرتبہ پڑھی۔ تب کہیں جا کر اس کہانی کی پوری تفہیم اور کرداروں سے آشنائی ہوئی۔

''سنگ بستہ'' کے افسانے اصلاً محبت کے افسانے تھے۔ اور آپ جانتے ہیں محبت کے ان گنت روپ ہیں۔ میرے خیال میں نفرت کے بھی اتنے ہی روپ ہوتے ہیں۔ کیونکہ جہاں جہاں محبت کا گڑ ہوتا ہے وہاں وہاں نفرت کی مکھیاں بھی ضرور بھنبھناتی ہیں۔ اس لیے آپ ان کو محبت، نفرت اور شادی کے عالم گیر اور مقبول ترین موضوعات کی کہانیاں بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن موجودہ مجموعے کی کہانیوں کے موضوعات بے حد متنوع ہیں۔ اور اظہار و بیان کے حوالے سے بھی ان میں زیادہ پختگی اور گہرائی ہے جو ان کے فنی ارتقاء کی دلیل ہے۔ ان میں بھی چند کہانیاں محبت کی کہانیاں ہیں یا ان پر محبت کی کہانیوں کا گمان ہو سکتا ہے مگر اب ان کے ہاں محبت بھی سادہ اور اکہری نہیں رہی۔ نہایت پیچیدہ اور تہہ دار صرف دو افسانوں سوہنی اور ریخت میں اس کی خالص شکل نظر آتی ہے۔ سوہنی میں سوہنی، جلال بلوچ پر اور ریخت میں چھمی ماچھن ملک گام پر فریفتہ ہے۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ سچی محبت کرنے والے دونوں کردار نسوانی ہیں۔ اور جھوٹی محبت کرنے والے سارے کے سارے مرد۔ آپ ان کو کھندے، ریخت، گندا کیڑا، وچولن، امیر زادی اور نا گفتنی میں دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ محبت کی تھوڑی بہت جھلک ''ملیچھ'' اور ''دیسوں میں'' بھی نظر آتی ہے۔

یوں تو اس کتاب میں دہشت گردی، افغا جنگ اور آج کی مصروف اور مشینی زندگی کی جھلکیاں بھی مل جاتی ہیں مگر زیادہ تر کہانیوں میں کرداروں کے جنسی اور نفسیاتی مطالعے پیش کیے گئے ہیں۔ جیسے ریخت کی چھمی، جو اپنے محبوب

کے بیوی بچوں کو بچانے کے لیے اپنی اساس یعنی دکان بیچ دیتی ہے۔ گندا کیڑا کی گوری بھی کم نہیں وہ زورآور ملک زادوں سے انتقام کی خاطر اپنا حمل نہیں گراتی تاکہ وہ اس کے ہاتھ میں کشکول تھما کر کہہ سکے، ملک جی جاؤ حویلی سے خیر پن کر لاؤ، دیگر اہم کرداروں میں چرواہا کا نامکمل قسم کا حقیر آدمی جو چودھری کو اس کی بے حیائی پر اینٹ مار کر ہلاک کر دیتا ہے۔ ''جوڑا گھوڑا'' کی کم عمر دوہٹی، جو پانچ ہزار کے عوض ایک بوڑھے سے بیاہی گئی اور راتوں رات دادی نانی چاچی اور تائی بن گئی۔ وہ دنیا سے محروم اور نامراد رخصت ہوتی ہے مگر مرتے دم تک حرف شکایت لب پر نہیں لاتی اور ملیچھ کی فرح جس کے اندر وہ خود نہیں کوئی دوسرا رہتا تھا اور سوہنی جس کی دلیری اور ذہانت نے بلونت سنگھ کے کرداروں کی یاد تازہ کر دی۔ اس کے علاوہ گلزاری، امیرو، میڈم صوفیہ، ناگفتنی کی ہر پل چلتی بھسم ہوتی بیوی اور مس فٹ کی العطش العطش پکارتی عذرا ان کے اہم اور یادگار کردار ہیں۔ مردوں میں سرائے ملک اور چودھری، میں زندہ ہوں کا سکندر نواز، وچولن کا راجہ راز، امیر زادی کے شاہد اور دکان دار اہم اور دلچسپ کردار ہیں۔

طاہرہ اقبال کو کیچڑ، گندگی اور گوبر پھرولنا اچھا لگتا ہے اور معاشرے کے گرے پڑے، مفلوک الحال اور جسمانی اور ذہنی طور پر پسماندہ کردار ان کی ہمدردی اور توجہ اپنی طرف زیادہ کھینچتے ہیں۔ کبھی کبھی انہیں واقعی غلاظت میں گرا پڑا کوئی لعل مل بھی جاتا ہے۔

اس کتاب کی بہت سی کہانیاں اندر سے ایک دوسری سے جڑی ہوئی ہیں۔ کردار ایک سے دوسری کہانی میں منتقل ہو جاتے ہیں اور اپنا نام اور شناخت بدل لیتے ہیں۔ مگر تھوڑی سی کوشش سے پہچانے جا سکتے ہیں۔ ریجنت کی چھمی دوسری کہانیوں کی گوری، سلو، سوہنی اور امیرو میں تبدیل (Transfrom) ہو جاتی ہے اور ریجنت کا ایک ملک گام اگلی کہانی گندا کیڑا میں پہنچ کر تین ملکوں میں بٹ جاتا ہے۔ پھر وہ چرواہا میں چودھری کا اور رکھندے میں دوبارہ ایک اور ملک کا روپ دھار لیتا ہے۔ اسی طرح گندا کیڑا کا محتاج آگے چل کر ملیچھ کا سائیں بن جاتا ہے۔ اور ملیچھ کی فرح اور چرواہا کی نکی بی بی اصل میں دونوں ایک ہیں۔ جوڑا گھوڑا کا منشی نظام، میں زندہ ہوں کی صوفیہ اور ''اک عجب چال گیا وہ شخص'' کا مظہر ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ دولت کے بل بوتے پر اپنی پسند کا مگر بے جوڑ جیون ساتھی خرید لینے والے۔

ایک اور یادگار ''دیسوں میں'' کی بوبو کا ہے جس کی سوئی اپنی چھوڑے ہوئے دیس، کرنیل سنگھ اور فسادات میں مارے جانے والے بھائیوں، شوہر اور دیگر عزیز و اقارب پر اٹکی ہوئی ہے مگر ایسا لگتا ہے کہ ان سب کو اس نے کرپانوں میں سلتے اور مرتے دیکھا اور رولیا ہے مگر جوان، خوبصورت اور اسم بامسمیٰ بیٹی نیک بیگم کی موت دردناک اور انوکھی ہے اور اس نے اسے کھوہ میں اترتے تو دیکھا مگر ڈوبتے یا باہر آتے نہیں دیکھا تھا اس لیے وہ اسے کسی لمحے نہیں بھلا پاتی۔ اور اس کی پوری زندگی ایک طویل بین کی صورت اختیار کر گئی ہے۔

''پونے کہا نیک بیگم کھوہ میں نہا جا۔ کھوہ میں اتر گئی اور نہا کر باہر نہ نکلی۔ ہور تے سیاں نہا گھر آئیاں۔ ہور تے سیاں نہاں گھر آئیاں۔ ہائے مر جاویں دھیے نی ماری اوڈونگڑی چھال۔ وال تے تیرے گز گز لمبے۔ ہائے مر جاویں دھیے نی۔ اڑے سروٹیاں دے نال۔ ہائے مر جاویں دھیے نی۔''

''دیسوں میں'' اتنی نازک، تہہ در تہہ اور اچھی بنت کی کہانی ہے کہ پڑھتے وقت سارے حواس بیدار رکھنا پڑتے ہیں۔ قیام پاکستان کے وقت فسادات پر ان گنت کہانیاں لکھی گئیں مگر ایسی اندوہناک ہمیشہ یاد رہ جانے والی اور شاندار کہانی کی ابھی تک گنجائش تھی۔ بلکہ شاید یہ لکھی ہی اب جا سکتی تھی۔

طاہرہ عورت کے جذبات و احساسات کی سچی اور بھرپور عکاسی کرتی ہیں اس سلسلے میں ان کے افسانے ''ناگفتنی'' کا نسائی کردار ایک مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں نسائی جذبات کا اظہار بہت ہی بھرپور اور عمدہ طریقے سے ہوا ہے۔ وہی تہہ دار علامتی، استعاراتی انداز، پتھر وجود میں سنگ پگھلنا، آتش زار، نازک نسوں اور شریانوں کا دہکنا، نقطۂ ابال سے کئی درجے اوپر کا کھولاؤ۔ وجود کا آبلہ بن جانا، فصد کا کھلنا نا گزیر ہو جانا، چتا کے الاؤ پر بیٹھنا، وجود کا پگھلنا، ہڈیوں کا تڑختا، گرم آہنی سلاخ کا آنکھوں کے آر پار اترنا، بھاپ سا تنفس، دھواں دھواں بو۔ ایسی ساری علامتیں اور لفظیات مل کر ایک جہنم کا سا الاؤ دہکا دیتی ہیں۔

''ارے مجھے مار ڈالو۔۔۔ کچل ڈالو۔۔۔ مجھے میری نیند دو۔۔۔ تمہارے دیدوں میں تو نور کی پتلی ہے ہی نہیں۔''

''واکنگ ٹریک دو کلومیٹر'' میں واکنگ ٹریک کی فضا، مردانہ حسن اور دہشت گردی کا منظر بیان کرنے میں طاہرہ اقبال نے کمال ہنرکاری دکھائی ہے۔ یہ نہایت ہی مختلف اور نہایت ذائقے کی کہانی ہے۔ مگر ''جنگل سکرین'' ان کا ایک حیرت انگیز افسانہ ہے۔ جس میں انہوں نے ایسی صورت احوال بیان کی ہے جو جنگل کے قانون یعنی جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے رویے اور طاقت کے متکبرانہ اظہار پر رائے زنی کرتی ہے اور اگرچہ اس میں یہ سلیقہ موجود ہے کہ کہیں بھی افغانستان کا نام نہیں لیا گیا مگر ظاہر ہے یہ دنیا کی واحد سپر پاور کے ایک نادار اور کمزور ترین ملک افغانستان پر چڑھ دوڑنے کے بارے میں لکھا گیا ہے افسانہ ہے کیوں کہ کتاب شائع ہونے تک عراق پر ان کی یلغار جس کو Horror & Awe کا نام دیا گیا ہے شروع نہیں ہوئی تھی لیکن اچھے ادب پارے کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ اور ہر دور میں Relevent رہتا ہے۔ اور بڑے تخلیقی فنکار کو قدرت نے بڑا وژن اور پیغمبرانہ بصیرت (Prophecy) عطا کی ہوتی ہے اور بعض اوقات وہ درست نتیجے نکالنے اور ٹھیک ٹھاک پیشن گوئی کرنے پر قادر ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ افسانہ عراق کے خلاف اتحادی طاقتوں کی موجود جارحیت پر بھی پوری طرح صادق آتا ہے۔ چند ٹکڑے ملاحظہ کیجیے:

☆ ٹی وی اسکرین میں سنڈیاں پڑے عرصہ ہوا۔ بم، میزائل، دھماکے بھی معمول ہو گئے۔ بارود کے آتش زار میں اڑتے جلتے جسموں کے چیتھڑے بھی

نگاہ کا نظارہ ہوئے لیکن تازہ ٹی وی سیریل ''جنگل سکرین'' نے سنسنی خیزی اور جدت وچابکدستی کے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیئے جس کا افتتاحی گیت حربیہ موسیقی کی تال پر عالم گیر شہرت یافتہ گلوکاروں نے مل کر گایا۔۔۔گر خدا نہیں تو خدا جیسا ہوں میں۔۔۔دیدۂ عبرت نگہہ! فرعون جیسا ہوں میں مانو کہ میں عظیم ہوں عظیم ہوں میں۔۔۔بولو کہ سپریم ہوں سپریم ہوں میں۔

☆ میں نے کہا بیٹا کاپی تو ہم جیسے چھوٹے لوگ کرتے ہیں، جن کے پاس آئیڈیاز کی کمی ہوتی ہے اور وسائل کی نایابی، جنگل سکرین سیریل تو جدید ترقی یافتہ اقوام کی مشترکہ پیشکش ہے جن کے سیارے اور سیارچے بادلوں کی طرح آسمانوں پر محو پرواز رہتے ہیں۔ جو ہر انسان وحیوان، نباتات وجمادات کی ہر ہر حرکت کو محفوظ کرتے ہیں جن کے حساس آلات ہماری سانسوں تک کا شمار رکھتے ہیں اور عکس ریزی جدید مشینیں ہمارے جسموں کے آرپار دیکھتی ہیں۔

☆ اس وقت جنگل سکرین میں وہ مقبول قسط سہ بارہ دکھائی جارہی تھی جس میں کارپٹ بمباری کو فلمایا گیا تھا اور جسموں کے کٹے پھٹے اعضاء، بریدہ لاشوں اور بہتے لہو سے اٹھتے دھوؤں سے سیٹ کی آرائش کی گئی تھی۔ دراصل اس قسط کا ذیلی عنوان تھا۔ موت ہی موت۔ جس میں جانیں قبض کرنے کی جدید ریسرچ کے تجربات کو فلمایا گیا تھا اور Horror موسیقی کے جلو میں جنگل بج رہا تھا۔

آسمانوں سے بارود برساتا ہوں۔۔۔زمین پر اسلحہ کا جال بچھتا ہوں
منکروں کو سزا میں کڑی دیتا ہوں۔۔۔اک دو نہیں، نسلیں کئی مار دیتا ہوں

☆ نہیں بیٹا نہیں۔ نعوذ باللہ۔ یہ خدا تو نہیں لیکن بڑی طاقت ضرور رکھتے ہیں۔ ہر ایک پر حکمرانی ان کا حق ہے اور سرتابی کی جرأت کرنے والے کو مار ڈالنا ان کا فرض ہے۔

☆ اب سیٹلائیٹ سسٹم نے پوری دنیا کو گلوبل ویلج بنا دیا ہے۔ طاقت کے اظہار کی حد ایک بستی پر تمام ہوتی ہے تو سلسلہ وہیں سے دوسری بستی پر محیط ہو جاتا ہے۔ طاقت کے رزق کے لیے اور ظلم کے ذوقِ طبع کے لیے اب کس کا انتخاب کیا جائے گا۔ لائن میں لگے سارے بے طاقتے دہل دہل جاتے تھے شاید اب ان کی باری آئے۔

طاہرہ اقبال کے اسلوب پر پنجابیت کی گہری چھاپ ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ جب کردار اور ماحول پنجاب کا ہوگا تو اس میں پنجابیت تو آئے گی۔ یوں بھی لکھنؤ بہت پیچھے رہ گیا۔ اردو کا نیا روپ پاکستانی زبانوں کے تال میل ہی سے وجود میں آئے گا اور آرہا ہے۔ پنجابی لفظیات اور روزمرہ کا اپنا ایک مزہ ہے اور پنجابی گالی تو کوئی جواب ہی نہیں۔

ملاحظہ فرمایئے خالص پنجابی ایکسپریشن اور روزمرہ کی چند مثالیں (پنجابی سے نابلد قاری کی آسانی کے لیے میں نے کچھ اشارے دے دیے ہیں)
(۱) کاکے کا بہت ارمان لگا (تعزیت کا ایک مخصوص انداز)
(۲) ملک جی آپ بازو دیں گے یا پھر (مغویہ کی بازیابی) (۳) اری لڑکی جلدی آیا کر اللہ کا نور نجانے کب سے باہر پڑا ہے۔ پتہ نہیں کن کن نظروں سے نکلا ہوگا (دودھ کے بارے میں) (۴) تو میرے کندھے پر ہاتھ رکھ اور مجھے اپنی ٹوہنی بنا لے (اندھے کی لاٹھی بنا) (۵) کہنا کدی سانوں وی چپاؤ۔ میں کھینچ کے آم مارتی۔ کیسوں میں الجھ جاتا۔ ہور چوپو (جوانی میں بوبو کا کرنیل سنگھ سے ہنسی مذاق) (۶) تمہاری بہن بیٹیوں کے چن چڑھ گئے ہوں گے۔ پلید کتوں کے مالشیئے، (پاؤں بھاری ہونے پر چن چڑھنے کی پھبتی اور اس کے جواب میں) (۷) کھندے کا کیا کام کہ وہ گاہ کو زخمی کرے۔ اوئے گندی نسل کا کھندا کون لایا ہے۔ (اچھی نسل کے شکار کے کھوجی کتے، صرف شکار کو تلاش کرتے اور پناہ گاہ سے باہر نکالتے ہیں شکار کو پکڑتے اور زخمی نہیں کرتے)

طاہرہ اقبال کا اسلوب فکشن کے جدید معیاروں پر پورا اترتا ہے۔ اردو افسانہ تجریدیت اور بے معنویت کا طویل چکر لگا کر اپنی اصل یعنی کہانی پن کی طرف لوٹ آیا ہے۔ اور بے سروپا کہانیاں لکھنے اور افسانے کے نام پر بجھارتیں ڈالنے والے بھی اب سمجھ میں آنے والے کردار اور پلاٹ کے افسانے لکھ رہے ہیں بلکہ انہوں نے اپنی راویتی اسلوب میں لکھی ہوئی پہلی اور ابتدائی کہانیاں بھی جو انہوں نے اس ڈر سے چھپا دی تھیں کہ کہیں ان کی جدیدیت پر حرف نہ آجائے، نکالی لی ہیں اور انہیں جھاڑ پونچھ کر کتابی صورت میں شائع کروا رہے ہیں۔ طاہرہ کا ڈکشن یقیناً جدید ہے مگر اس میں کہانی پن کا فقدان نہیں۔ اور اگرچہ یہ اسلوب اپنے ٹریٹمنٹ کی وجہ سے کہیں کہیں تھوڑا پیچیدہ اور مشکل ہے مگر گنجلک اور بے معنی نہیں۔ گہری علامتوں، تشبیہات اور استعارہ در استعارہ کے سلسلے نے طاہرہ اقبال کی کہانیوں میں ایجاز واختصار کی خوبیاں بھر دی ہیں۔ منظر کشی اور جذبوں کے بیان میں وہ محاکاتی تصویر کشی ہی نہیں کرتیں آوازوں کو بھی لفظوں میں بیان کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اور اس کے لیے ضرورت کے مطابق الفاظ ایجاد کر لیتی ہیں جیسے چھل چھل، بھڑ بھڑ، لخ لخ، جھر جھر، کھٹ کھٹ وغیرہ۔

میں سمجھتا ہوں طاہرہ اقبال کی کہانیاں اردو کے افسانوی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہیں۔ میں ان کو اس خوبصورت اور اہم افسانوی مجموعے کی اشاعت پر مبارک باد دیتا ہوں۔ اللہ کرے وہ اسی توانائی، محنت اور سلیقے سے ایسی ہی خوبصورت کہانیاں ہمیشہ لکھتی رہیں۔

''حقیقت نگاری کا اسلوب''

سنگ بستہ طاہرہ اقبال کے پندرہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جن میں اس کے ہنر کے ابتدائی آثار محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ طاہرہ اقبال کے افسانے حقیقت نگاری کے اسلوب میں لکھے گئے ہیں۔ ان کے افسانوں کا خمیر آج کی دنیا سے اٹھتا ہے۔

انیس ناگی

طاہرہ اقبال کی افسانہ نگاری

ڈاکٹر محمد علی صدیقی
(●)

طاہرہ اقبال کی افسانہ نگاری کا محور دیہی پنجاب کی بظاہر پرسکون لیکن ہر قسم کے تناؤ سے بھری زندگی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ طاہرہ اقبال نے دیہی پنجاب کی زندگی میں طبقاتی آویزش کے بیہوں میں پستی ہر دو طبقوں کی ''عورت'' کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ اور اس سے پیدا ہونے والے انسانی رویوں کو بہت ہمدردانہ طریقے سے سپردِ قلم کیا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں بھی دیہی پنجاب کا وہ رخ ملتا ہے جو ایک ترقی پسند لکھنے والے کے لیے زیادہ غور طلب ہو سکتا ہے۔ گاؤں کا زمیندار، گاؤں کا مولوی اور گاؤں کی الھڑ مٹیار جوانی کے صبر آزما مسائل کے ساتھ جڑی رومانی زندگی کے ساتھ ہماری توجہ کی مستحق ٹھہرتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے دیہی پنجاب کی زندگی کی بہت کامیاب عکاسی کی ہے اور وہ اس زندگی کی عکاسی کے بنیاد گزار ہیں۔ غلام الثقلین نقوی، نعیم صدیقی کے افسانے بھی قاسمی کے افسانوں سے ذرا سے فرق کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ دیہی پنجاب احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کی طرح بلونت سنگھ اور محمد منشا یاد کے افسانوں میں بھی موجود ہے اور متذکرہ بالا افسانہ نگار کسی نہ کسی اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف اور ممیّز ہیں لیکن کسی ایک کا دیہی پنجاب دوسرے کے پنجاب پر خطِ تنسیخ نہیں کھینچتا دکھائی دیتا۔ طاہرہ اقبال کے یہاں دیہی پنجاب کی ''عورت'' کا جس جرأت اور ہمدردی کے ساتھ مطالعہ کیا گیا ہے وہ بہت منفرد ہے۔ اس کا افسانہ ''ماں ڈائن'' میں حقیقت نگاری اور ڈرامائیت اس درجہ شیر و شکر ہوئے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے لازمی ضرورت معلوم ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں اس کے افسانے ''گنجی بار'' میں طاہرہ اقبال کے منفرد اسلوبِ نگارش نے نقادوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔

''ڈائن ماں'' میں پولیس کے تحقیقاتی داؤ پیچ، وعدہ خلافی اور ایک ماں کی بے پایاں محبت کی ایک ایسی کہانی رقم ہوئی ہے جس میں طبقاتی اونچ نیچ کا ایک کربناک رخ سامنے آتا ہے کہ پولیس کی نگاہ میں 'غریب ملزم' کی 'ماں' بھی 'ماں' نہیں رہتی بلکہ وہ مطلب براری کے لیے ایک ''مہرہ'' بنادی جاتی ہے۔ ایک ماں کا اپنے بیٹے کے لیے سب کچھ کر سکنا اپنی جگہ لیکن طاہرہ اقبال نے دیہی پنجاب میں عورت ذات کی تذلیل کی روح فرسا کہانی پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ کہانی میں اصل ڈرامہ افسانے کی Landscape کی اُن تفصیلات سے آتا ہے جو کہانی کار کو اپنے کرداروں اور ان کی landscape کی ماہرانہ انداز میں پیشکش سے حاصل ہوتی ہیں۔ طاہرہ اقبال اپنے کرداروں کے لہجہ اور ڈکشن پر بہت ماہرانہ نظر رکھتی ہیں اور شاید اسی لیے ان کے دیہی زندگی سے متعلق افسانے جو ڈرامائیت سے بھرپور ہوتے ہوئے ڈرامہ نظر نہیں آتے بلکہ ان کے افسانے فطرت سے اس درجہ قریب نظر آتے ہیں کہ وہ اپنی ''ڈرامائیت'' سے محروم ہو کر شاید اپنی ''وقعیت'' سے بھی مرحوم ہو جائیں۔

طاہرہ اقبال کے افسانے منشا یاد کے افسانوں سے اس لیے مختلف ہیں کہ منشا یاد کے یہاں اردو پر پنجابی کی استرکاری واضح طور پر نظر آتی ہے لیکن طاہرہ اقبال کی زبان میں استرکاری کی شعوری کوششیں نہیں ہے بلکہ ان کی پنجابی آمیز اردو میں جس قدر فطری Osmosis ہو چکا ہے وہ کسی تکلف کے بغیر نظر آتا ہے۔ محمد منشا یاد اپنے افسانہ کے اسلوب نگارش میں بھی ڈرامائیت سے زیادہ وقعیت کا احساس دلاتے ہیں۔ طاہرہ اقبال اپنے اسلوب نگارش کو، اپنے کرداروں کی زبان کو فطری زبان کی ڈھلان پر رکھ دیتی ہیں اور یہ کردار بین السطور میں گفتگو کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ شاید اس لئے طاہرہ اقبال کی تصور کشی میں سب سے زیادہ دلکش پہلو اس کے کرداروں کی زبان کی ''فی الفوریت'' ہے شاید وہ ایک ایسی فنکارہ ہے جو زبان کے فرق سے دیہی پنجاب کی زندگی کا ایک ایسا زاویہ پیش کرنا چاہتی ہے اور وہ بھی صنفِ نازک نے مخصوص لہجہ میں جس سے دیہی پنجاب کی عورت کی مظلومیت کے ساتھ ساتھ دیہی پنجاب کی روح اور اس میں خلقی طور پر موجود ترنگ اور اس ترنگ کی body language کے بہت سے نہفتہ پہلو کچھ اس طرح radiate ہوتے ہیں قارئین خود کو افسانوں کے دیہی کرداروں سے الگ تھلگ Isolation میں محسوس نہیں کر پاتے بلکہ ناظر اور منظر ایک ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ ''ملیچھ'' میں نظر آتا ہے۔

طاہرہ اقبال کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے دیہی کرداروں کی ''جانبدارانہ'' عکاسی کرتے ہوئے غیر دیہی قارئین کے قدرے مختلف اسلوبِ زندگی کو اپنی Landscape کی راہ میں پردہ بننے نہیں دیتیں بلکہ اپنے کرداروں کی زبان کی دل کشی اور قوت سے نامانوس زندگی کے محاورہ Idiom کو اس درجہ مانوس بنا دیتی ہیں کہ ان کے کرداروں کے اسلوبِ زیست سے شمہ برابر بھی ''بیگانگی'' محسوس نہیں ہوتی اور یہ بات سچ معلوم ہوتی ہے کہ اگر کسی افسانہ نگار کے افسانوں میں زبان، زندگی اور مسائل یک ہو جائیں تو پھر انسانی زندگی کی تفہیم آسان جاتی ہے اور وہ ہمارے اندر ان پوشیدہ قوتوں کو release کر دیتی ہیں جو افسانہ نگار کے سامنے پیش آمدہ مسائل کو سمجھنے میں شریک ہو جاتی ہیں۔

اکثر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ افسانہ یا فکشن ہماری زندگیوں پر کس طرح اور کیونکر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس سوال کا ایک جواب تو یہی ہے کہ دوسری زندگیوں کے دکھ اور درد، امیدیں، آسیں اور خوابوں کا مطالعہ ہمیں ان زندگیوں کو بھی بھوگ لینے پر مجبور کرتا ہے اور ہم ایک زندگی میں کئی زندگیوں کی زندگی گزار لیتے ہیں۔ طاہرہ اقبال کے یہاں پنجابی دیہات کے مسائل کرداروں کے

اضطراری فیصلوں کے ذریعے طے ہونا سمجھ میں آتا ہے۔ دیہی لوگ اپنی زندگی کے ''جبر'' سے اس درجہ تنگ ہوتے ہیں کہ ان کے رویے فی الفور اختیار میں تبدیل ہوجاتے ہیں برصغیر کے کسی اور علاقہ میں صورتِ حال علاقہ بہ علاقہ بدلی ہوئی ہوتی ہے۔ اگر بنگال میں بوڑھی گنگا میدانوں کے شباب سے نکل کر آہستہ آہستہ سمندر میں شامل ہونے کے لیے آہستہ خرامی کے اسٹیج میں داخل ہوتی ہے تو پنجاب میں دریا پہاڑوں کے علاقے میں گڑگڑاہٹ اور طوفانی دور سے گزر کر میدانی علاقوں کے قدرے کم پرشور علاقوں میں داخل ہوتے ہیں۔ شہری زندگی کسی قدر استقرار اور توازن پیدا کر دیتی ہے لیکن دیہی زندگی میں فصل بونے، اگنے اور کٹنے کا عمل خود انسانی زندگی پر اس طرح منطبق ہوجاتا ہے کہ انسانی جذبات اور فطرت میں حد درجہ ہم آہنگی تعجب کی بات نہیں رہتی۔ بنگال میں بھٹیالی راگ کے سے ٹھنڈے اور میٹھے سُر ہوں یا پنجاب میں پہاڑی راگ کی سرمستی اور خوشی میں دھمال ڈالنے والے رقاصوں کی تیز حرکت ہو یہ دونوں images انسانی توانائی کے بدلتے ہوئے پیکروں کے استعارے ہیں۔

طاہرہ اقبال کے افسانوں کے مجموعوں ''سنگ بستہ''، ''ریخت'' اور ''گنجی بار'' میں دیہی پنجاب کی زندگی کی بڑی اجلی اور صاف عکاسی معلوم ہوتی ہے۔ ان کا ڈرامائی عنصر کہانی کی ضرورت بن جاتا ہے۔

مجھے ''ماں ڈائن'' کے بعد طاہرہ اقبال کے افسانے ''گلابوں والا ڈیرہ'' کی زبان اور بیان نے بطورِ خاص متاثر کیا۔ افسانے کے واحد متکلم کی زبان سے عیاش زمیندار چاچا کی گلابو جیسے ''الھڑ کپاس کلیوں'' کی اونٹنی کے دودھ میں گھوٹے بادام کی سردائی کے کئی گلاس چڑھانے والے کبوتروں کی یخنی اور خرگوشوں کے بھنے گوشت کے ساتھ پراٹھوں کی غذا سے طاقت مردی کی سان پر گلابو جیسی الھڑ لڑکیوں کی جوان بجلیوں کو اپنی مٹھی میں دبوچتے اور مسلتے ہوئے ایک عمر گزر گئی تھی۔ واحد متکلم کی چاچی جی یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتی اور اس زمیندار کا وطیرہ سمجھتے اتنا سیاپا کر چکی تھیں کہ اب اس سے اس موضوع کی نزاکت شرم یا اخفا کی ڈھٹائی بالکل نکل گئی تھی۔

واحد متکلم ایک موقع پر کہتا ہے:

''ساری چوسی ہوئی امبیاں حویلی کے اندر اور ان کے باپ بھائی گولے باندے فطرت کی منہ زور طاقت کے سامنے بے بس نظر آتے ہیں۔''

کہانی اپنے نقطہ عروج کو اس وقت پہنچتی ہے جب چاچا جی اپنی سب سے پیاری تیز رفتار اور ہنر مند شکاری کتیا کو بیماری، کمزوری اور بڑھاپے کی ذلت میں بے توقیر ہوتا نہیں دیکھ سکنے پر اپنے پستول سے اس کے ماتھے پر بیچو بیچ نشانہ لگاتے ہیں تاکہ وہ غیرت مند سکون سے مر سکے۔ شکاری کتیا نہ چیخی نہ تڑپی اور سکون سے مر گئی اور اس پر بیمار چاچا کے بارے میں جو سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئے تھے اس کے بھتیجے کو یہ خیال آیا کہ وہ اپنے چاچا کا شکاری کتیا جیسا انجام چاہے تاکہ چاچا کی موت بھی سہل اور بڑی نیکی کی طرح فی الفور ہوجائے۔

افسانہ کی جان ہی یہ ہے کہ واحد متکلم کے اس خیال کے پیچھے ''گلابوں کا ڈیرہ'' سہل اور سریع موت کی خواہش میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ لیکن یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا گاؤں کی گلابوئیں چاچا کی موت کے بعد اپنی زندگی اپنی مرضی سے جی سکیں گے اور چوسی ہوئی امبیوں کے باپ بھائی گولے باندے فطرت کی منہ زور طاقت کے سامنے بے بس ہی نظر آتے رہیں گے۔ افسانے کا کمال یہ ہے کہ پورا ماحول جس قدر بھیانک ہے اس کے خلاف پیدا ہونے والا تاثر ایک سوال انگیز سریت کے ساتھ ختم ہوجاتا ہے اور یہ ایک بڑی خوبی ہے جس نے طاہرہ اقبال کو قابلِ داد افسانہ نگار بنا دیا ہے۔

طاہرہ اقبال کا فن وقت کے ساتھ اور نکھرے گا۔ ہر ادیب کے ساتھ یہی معاملہ ہوتا ہے۔ ابھی تک کسی اور ادیب شاعر یا فکشن نگار نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ اپنا کام مکمل کر چکا ہے۔ اگر اس کے قلم سے یہ جملہ ادا ہوجائے تو پھر اس جملے کے بعد کی زندگی اس کی موت کے مترادف ہوگی۔

☆

''حیرت انگیز''

اردو افسانے کے دورِ زریں میں بھی مجھے راجندر سنگھ بیدی سے بڑھ کر مشاہدے کی سچائی، گہرائی اور ہمہ گیری کم ہی کہیں ملی مگر طاہرہ اقبال کے چند افسانے پڑھنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ گہرے اور کھرے مشاہدے کے ذریعے اپنے افسانے کو موثر بنانے کا سلسلہ بیدی پر ختم نہیں ہوگیا تھا۔ طاہرہ اقبال کے ہاں مجھے حیرت انگیز باریک بینی نظر آئی غربت و افلاس میں روندے اور کچلے ہوئے ماحول اور اس کے کرداروں کا اتنا قریب سے مشاہدہ اور مطالعہ طاہرہ اقبال کی ایسی خصوصیت ہے جو بہت حد تک منفرد ہے۔

احمد ندیم قاسمی

مٹی کی سانجھ

رشید امجد
(راولپنڈی)

طاہرہ اقبال جدید اردو فکشن میں ایک مخصوص کلچر، زبان اور اسلوب حیات کی ترجمان بن کر سامنے آئی ہیں۔ان کی کہانیاں پنجاب کی آب و ہوا، یہاں کی مٹی کی بو باس، موسموں کے رنگ ڈھنگ اور سماجی زندگی کے اتار چڑھاؤ کی بہت قریب سے کھینچی ہوئی تصویریں ہیں۔ گنجی بار اور نیلی بار کے علاقوں کی تھمی ہوئی اور متحرک فضاؤں، ان میں رچی بسی آوازوں ، گھلے ملے چہروں اور مسلسل رواں دواں کہانیوں کو طاہرہ اقبال نے زاویے بدل بدل کر دیکھا،محسوس کیا اور بیان کیا ہے۔''مٹی کی سانجھ'' اور''رئیس اعظم'' کا موضوع اور ماجرا بھی اسی علاقے اور اس کی قدیم اور جدید زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ گہرے پکے رنگوں کی امین اس دھرتی کے انگ انگ کا احوال یہاں کھلتا ہے اور ایک تازہ تاثر کے ساتھ اپنی پہچان کراتا ہے۔

''اس نیلی بار اور گنجی بار کے اپنے رنگ ہیں دوستو! گہرے اور پکے، جو یہاں کی بہنوں کے نیلے کرتوں اور سیاہ تمدنوں اور بوچھنوں میں رچے ہوئے ہیں۔ جو کھیسوں میں نیلے، لال اور ہرے تانے بانے بنتے ہیں، جو چکنی مٹی میں گھل کر گھڑوں، چاٹیوں اور کجیوں پر اپنے نمونے بناتے ہیں۔ گنجی بار اور نیلی بار کی صدیوں پرانی رہتل تو آج بھی اس علاقے میں پرانے ٹیلوں تلے دبی ہے جو آپ اپنی پہچان ہے۔

پرانے ٹیلوں تلے دبی، ماضی کے اندھیروں میں گم اور یاد کے دریچوں کی اوٹ میں بیٹھی زندگی کو طاہرہ اقبال نے موجود منظروں کے ساتھ گھلا ملا کر پیش کیا ہے(یہ کسی ایک نسل کی نہیں، کئی نسلوں کی کہانی ہے)۔ملک بہاول دین، منیرہ بیگم،نوراں، جنید، فاطمہ اور راحت کے ساتھ ساتھ بہت سے دیگر کردار اس کہانی کی صورت گری کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ایک عجب طرح کے تناؤ، اضطراب، المیے کی پر چھائیاں قریب قریب سبھی کرداروں کے ساتھ چپکی ہوئی نظر آتی ہیں اور یہ غالباً اس لیے کہ سماج کے طے شدہ بندھن ٹوٹ رہے ہیں۔قدریں ، ضابطے اور معیارات اور سے اور ہو رہے ہیں۔سارے کا سارا منظر نامہ الٹ پلٹ کا شکار ہے۔طاہرہ نے اسی شکستگی اور ریزگی کے دورانیے میں ناولٹ کی کہانی کو گھمایا پھرایا ہے۔اور اس کے ذریعے اپنی اس فکر کی ترسیل کی کوشش کی ہے کہ وقت صدا ایک جیسا نہیں رہتا ہے۔ ہر اثبات کے اندر سے ہی اس کی نفی کے سوتے پھوٹتے ہیں اور پھر سب کچھ تنکا تنکا ہو کر بہہ جاتا ہے۔

ملک الیکشن لڑے بنا ہی ہار گیا تھا۔ یہ خاندانی سیٹیں بھی ان خاندانوں میں آبائی زمین کی طرح عزت اور پگ ہوتی ہیں۔ملک کے اندر بے عزتی کے گھاؤ تھور کے کانٹوں کی طرح بڑھ رہے تھے اور آک کے کڑوے سیال کی طرح قطرہ قطرہ ٹپکتے تھے۔علاج کا مزاج بدل گیا تھا۔پنج کلیان کلِے سے کھل گئے تھے۔

طاہرہ اقبال نے صدیوں پروان چڑھتی تہذیب کے پنج کلیان کو کلِے سے کھلتے اور نئے تیور اختیار کرتے دکھایا ہے۔اس سلسلے میں ان کے ہاں نظریاتی تال میل تو نہیں لیکن طبقاتی کشمکش کو مصور کرنے میں ان کا رویہ ترقی پسندی کے بہت قریب قریب ہے۔انھوں نے اس کہانی میں کرداروں کے چناؤ، مناظر و ماحول کے انتخاب اور وقوعوں کے بیان میں جو اہتمام روا رکھا ہے اس کے ڈانڈے پریم چند اور احمد ندیم قاسمی کی سماجی حقیقت نگاری سے ملتے دکھائی دیتے ہیں۔تاہم اس میں ایک توازن اور اعتدال کو انہوں نے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

''مٹی کی سانجھ'' میں بھی طاہرہ کی دیگر تحریروں کی طرح جزئیات نگاری اور تفصیل پسندی اپنی تمام تر خوبیوں خامیوں کے ساتھ موجود ہے۔ناولٹ میں کہیں کہیں ان فنی حربوں کی بدولت خلل بھی واقع ہوا ہے تاہم بحیثیت مجموعی ان کی بدولت کہانی کی خوبصورتی اور روانی دوچند ہوئی ہے۔ زبان و بیان اور اسلوبیاتی پیش کش میں طاہرہ اقبال کی گرفت خاصی مضبوط ہے۔

اپنے موضوع سے متعلق منظروں ، مزاجوں، رویوں اور لہجوں کے بیان میں انہوں نے اس قدر مہارت دکھائی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔موقع محل کی مناسبت اور کرداروں کی حیثیت و حقیقت کے مطابق مکالموں کی ادائیگی، ان کے اتار چڑھاؤ اور اختصار و طوالت کو انہوں نے بڑی خوبی سے ملحوظ رکھا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے اس ناولٹ کو پڑھتے ہوئے لطف آتا ہے۔

میں اپنی بات کی تصدیق کے لیے طاہرہ اقبال کے افسانے'' گنجی بار'' سے ایک پیراگراف پیش کرنا چاہوں گا۔

''اگلے روز جب گنجی بار کے اُجاڑوں میں گڑھے آسمان کے کناروں پر سورج کی بھٹیاں دہکنے لگیں۔ درختوں کے جھنڈ بھوسے کی کھکھوں اور راجباہ کے پانیوں سے دھواں اُٹھنے لگا تو سکینہ شلجم نگلتی اور کھال کا پانی پیتی اور بین کرتی تھی۔

''ہائے رے دِتّو !تو روتا کیوں نہیں۔کچھ کھاتا بھی نہیں، گو موت بھی نہیں کرتا ہائے رے دِتو اماں پکی چڑھ گئی۔''

نرمے کی قطاروں کے بیچوں بیچ، اٹ سٹ، سانواک، تلے، دھمائیاں کھودتی عورتیں بَین سُن باہر نکلیں۔پُشت پہ اُچھلتی گھاس پھونس سے بھری جھولیاں جن کی گرھیں پیشانی پہ بندھی تھیں۔دادی زینو نے جھولی کی گرہ کھولے بنا، ماتھے سے نکال سَر سے کھسکاتے ہوئے بنے پہ پنڈ ٹکا دی۔

''نی بھیڑیئے کینی ! کیوں بوجنی (بندریا) کی طرح اس مُردے کو لپٹائے پھرتی ہے یہ تو گل پرسوں کا ٹھنڈا ہو گیا، ری کملی!''

طاہرہ اقبال کی سفرنامہ نگاری

عطاء الحق قاسمی
(لاہور)

طاہرہ اقبال عصر حاضر کی نمائندہ افسانہ نگار ہیں۔انہوں نے اس صنف میں اپنی ایک منفرد پہچان بنائی ہے۔مجھے ان کے افسانوں نے ہمیشہ متاثر کیا ہے۔''معاصر'' کے شمارے کے لیے مجھے اور قاری کو ان کے تازہ افسانے کا انتظار رہتا ہے۔وہ زندگی اور انسانی نفسیات کا بہت گہرا شعور اور ادراک رکھتی ہیں۔ان کی باریک بیں نگاہ ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کو بھی دیکھ لیتی ہے جو عموماً لکھنے والوں کی آنکھوں سے اوجھل رہتی ہیں۔زندگی کے بارے میں ان کا مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ بہت وسیع ہے اس لیے نئے نئے موضوعات کی تلاش کے لیے ان کو تگ ودو نہیں کرنا پڑتی بلکہ خارج سے زیادہ باطن سے وہ خود بخود ظہور پذیر ہوتے ہیں۔خوبصورت، دلچسپ اور سحر انگیز نثر لکھنے کا ہنر انہیں قدرت نے ودیعت کیا ہے اس لیے جب وہ کسی گھسے پٹے یا عام موضوع پر قلم اٹھاتی ہیں تو اس میں بھی نئی دلکشی اور خوبصورتی بھر دیتی ہیں۔کچھ روز قبل مجھے ان کے دو سفرناموں کے مسودے موصول ہوئے تو مجھے خوشگوار حیرت ہوئی کسی کتاب کا دیباچہ لکھنا میرے لیے دنیا کا مشکل ترین کام ہے مگر یہ مشکل کام ان کے سفرنامے پڑھ کر میرے لیے بہت آسان ہو گیا کیونکہ دیباچہ یا فلیپ لکھنا اس وقت مشکل لگتا ہے جب جھوٹ بولنا پڑے۔ان سفرناموں کے مطالعہ کے دوران میں نے محسوس کیا کہ طاہرہ جب لکھتی ہیں تو بہت سی ان دیکھی دنیائیں اس کی انگلیوں کی پوروں سے ہوتی ہوئی کاغذ پر لفظ لفظ بکھر جاتی ہیں۔سفر تو بہت سے لوگ کرتے ہیں مگر سفرنامہ تو ایک تخلیق کار ہی لکھ سکتا ہے جو راستے کے منظروں کو ایک الگ زاویہ نگاہ اور منفرد فریم سے دیکھتا ہے اور سفرنامے کو سفر سے بھی زیادہ دلچسپ، خوبصورت اور پر اسرار بنا دیتا ہے۔میں نے طاہرہ اقبال کا تسلیم، بندگی اور نیاز میں گندھا ہوا مکہ، مدینہ کا سفرنامہ بھی پڑھا ہے اور دل کو چھو کے لگاتا ہوا دلخراش سفرنامہ بنگلہ دیش بھی پڑھا ہے اور ان دو سفرناموں میں مجھے جس بات نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کی حقیقت نگاری ہے وہ اپنے سفرنامے کو مقبول اور بیسٹ سیلر بنانے کے لیے مبالغے سے کام نہیں لیتیں بلکہ تصویر کا وہی رخ قاری کو دکھانے کی کوششیں کرتی ہیں جو وہ خود دیکھ رہی ہوتی ہیں۔بیت اللہ کے سفر کو ہی لیجیے بحیثیت مسلمان زائر عقیدت ومحبت میں اتنا گندھا ہوا ہوتا ہے کہ اسے دورانِ سفر سب مناظر جنت الفردوس سے بڑھ کر حسیں معلوم ہوتے ہیں اور یہ عقیدت نامے بعض اوقات قاری کو بہت بڑے مغالطے میں بھی مبتلا کر دیتے ہیں اور وہ حج و عمرہ کے سفر کے دوران ان مشکلات کا اندازہ نہیں کر سکتے جو اسے درپیش ہوتی ہیں۔طاہرہ اقبال نے عقیدت ومحبت مستی وسرشاری کی کیفیت میں بھی شعور کا دامن تھامے رکھا ہے اور ان تکالیف اور مشکلات کی صحیح عکاسی کی جو زائرین کو اس مبارک سفر میں درپیش آئیں۔مثال کے طور پر ان کے درج ذیل اقتباسات دیکھئے:

''امیگریشن لاؤنج میں انڈونیشین زائرین کا ایک بڑا گروپ ننگے فرش پر پڑا تھا۔قریب سے گزرتے ہوئے گھن سی محسوس ہوئی۔یہ احرام پوش کس طرح گندے فرش پر آڑے ترچھے لیٹے بیٹھے ہیں۔احرام پوش افراد کی لائنیں امیگریشن کاؤنٹرز کے سامنے لگی تھیں ہماری فلائٹ میں سینکڑوں زائرین سوار تھے سبھی اپنے اپنے دستی سامان اور احرام سنبھالتے ایک دوسرے کو پچھاڑتے کاؤنٹر کی طرف بھاگے کہ کہیں دوسرا ان کے آگے کھڑا نہ ہو جائے اور کہیں ان سے پہلے باہر نہ نکل جائے اور ارض حجاز کی فضاؤں میں تیرتے قبولیت کے لمحوں کو اپنی دعاؤں کے کشکول میں نہ بھر لے۔اب لائنیں سیسہ پلائی دیوار کی طرف کھڑی ہیں۔ذرہ بھر نہ کہیں جنبش ہے نہ ہلچل پتہ نہیں کتنا عرصہ گزر گیا کھڑے کھڑے ٹانگیں شل ہو گئیں۔پیر سن ہو گئے۔دستی سامان من بھر بھاری لگنے لگا لیکن لائنیں ہیں کہ جوں کی توں کنکریٹ کی دیواریں بنی ہیں۔ایک فرد بھی نہ گھٹا نہ قطار آگے سرکی۔البتہ مزید سینکڑوں زائرین دوسروں کے حال سے بے خبر اک نئے جوش وجذبے کے ساتھ انہی قطاروں کو مزید دراز کیے جا رہے تھے بہت دیر میں معلوم ہوا کہ کاؤنٹر سب خالی پڑے ہیں کسی پر کوئی ایک شخص بھی پاسپورٹ پر مہریں ثبت کرنے کو موجود نہیں تھا۔خمیدہ کمروں والے بوڑھے، حرم کے دیدار کی چاہ میں آخری سانسیں لیتے مریض، شیر خوار بچے اور مائیں نہ پانی نہ کہیں کچھ کھانے کو مہیا، آہستہ آہستہ قطاریں زمین بوس ہونے لگیں۔سفید احرام پوش ننگے فرش پر ڈھتے چلے گئے کبھی کسی کاؤنٹر پر کوئی سعودی شہزادہ نمودار ہوتا تو منہدم ہوتی بھیڑ پھر اپنے قدموں پر ایستادہ ہو کر اسی کاؤنٹر کی سمت رش کرتی تو وہ نازک مزاج ان بدتمیز پاکستانیوں کو حقارت سے ڈانٹتا جیسے تھوک نوک زبان پر دھرا ہو۔چھڑی سے پیٹتا اور احتجاجاً کام چھوڑ کر واپس جاتے ہوئے کچھ بڑبڑاتا جیسے کہتا ہو''منہ اٹھا کر لاکھوں کی تعداد میں چلے آتے ہیں۔ہم تمہارے نوکر ہیں کہ تمہارے احترام میں کاؤنٹر پر بیٹھ جائیں آئے ہو تو اب بھگتو۔''

''یہ لمبے تڑنگے مصری مرد اور عورتیں عربی زبان میں بحیرہ عرب کی سی طغیانی کے ساتھ پتہ نہیں کیا بولتے، کہنیاں دھکے مارتے پیچھے سے آتے اور پوری لائن کو تتر بتر کرتے سیدھے کاؤنٹر پر پہنچ جاتے نریمان ایسی بھیڑ اور گھٹن میں عموماً بے ہوش ہو جایا کرتی ہے اور میں خوف زدہ تھی اگر یہاں یہ گر گئی تو پھر قدموں کی لتاڑ تلے سے یہ کیسے اٹھ سکے گی۔اس کی سانسوں میں پھونکنے کے لیے آکسیجن کا چلو بھر کہاں سے ملے گا۔زردی اس کے سفید اسکارف پر کھنڈ رہی تھی۔''

''خاموش سب کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے اس راہ میں جتنی مشقت جتنی ذلت اٹھا سکو اٹھاؤ اتنا ہی ثواب زیادہ ملے گا تو پھر عمرے کی نیت میں یہ کیوں شامل کیا گیا''قبول فرما، آسان فرما'' لیکن یہ پاکستانی عوام جو ٹھہرے۔جو پیدا ہی

اسی سلوک کے لیے کیے گئے ہیں اور ایک وہ بھی تو پاکستانی ہیں جو غریب عوام کے خون سے بنے پیٹرول سے چارٹر طیاروں پر تشریف لے جاتے ہیں جن کے لیے وی آئی پی لاؤنجز کھلتے ہیں جو شاہی محلات میں قیام فرماتے ہیں اور خانۂ خدا کے اندر جا کر نوافل ادا کرتے ہیں یا خدا تیری حکمتیں! دنیا کے نظارے بھی انہی کے لیے اور دین کے نظارے بھی انہی کے لیے۔''

انتہائی دلکش اسلوب، جذب و مستی میں گندھی ہوئی نثر اور حقیقت نگاری نے طاہرہ اقبال کے اس مبارک سفر کو اور مبارک اور ان کے سفر نامے کو منفرد بنا دیا ہے اسی طرح طاہرہ اقبال کا سفر نامہ بنگلہ دیش بھی اپنے منفرد اسلوب کے پیشِ نظر اہم ہے اگر اسے سقوطِ ڈھاکہ کے بعد کی مختصر تاریخ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ طاہرہ اقبال کا محبِّ وطن دل سابقہ مشرقی پاکستان کی محبت میں جگہ جگہ دھڑکتا ہے اور آنکھیں تحریکِ پاکستان کا باب پڑھ کر نم ہو جاتی ہیں مگر جگہ جگہ ایسے تلخ واقعات، تجربات اور مشاہدات سفر کا حصہ بنتے ہیں کہ ان کو احساس ہوتا ہے کہ اب وہ مشرقی پاکستان میں نہیں بلکہ نئے دیس بنگلہ دیش میں ہیں جن کے نزدیک پاکستان ان کا بدترین دشمن ہے۔ ان کے قومی ترانے میں بھی ایسے ہی جذبات کی ترجمانی ہے۔ طاہرہ اقبال کا دل اس وقت خون ہو جاتا ہے جب ان کو بمبئے سے آئے ہوئے انڈین مہمان سمجھ کر ان کی عزت افزائی کی جاتی ہے۔ طاہرہ اقبال نے بنگلہ دیش کی جھیلوں، کیلوں کے باغات کی خوبصوتیوں کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ بنگلہ دیش جانے کو جی چاہتا ہے اور بدصورتیوں کا نقشہ اس انداز میں کھینچا ہے کہ یہ ارادہ ملتوی کرنا پڑتا ہے میں ان خوبصورت ترین سفر ناموں کے لیے طاہرہ اقبال کا ممنون ہوں اور انہیں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

''جزئیات نگاری''

میں عام طور پر افسانے نہیں پڑھتا حالانکہ عبداللہ حسین کے ساتھ ایک گفتگو کے دوران میں نے کہا تھا کہ فکشن رائٹرز کو شاعری جبکہ شعرا کو فکشن ضرور پڑھنی چاہیے جس کے ساتھ موصوف نے اتفاق کیا تھا۔ بیشک افسانہ یا ناول قاری کے ساتھ وہ کچھ نہیں کرتا جو شاعری کر گزرتی ہے لیکن چونکہ افسانہ اب محض داستان گوئی نہیں رہ گیا بلکہ اپنی گونا گونی کے حوالے سے ایک ایسے ہتھیار کی حیثیت حاصل کر چکا ہے جس سے یہ شاید وہاں تک مار کر سکتا ہے جہاں شاعری بھی نہ کر سکتی ہو۔

بلکہ بعض افسانے تو آپ کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ اگلے روز ایسا ہی ایک افسانہ پڑھ کر اندازہ ہوا کہ محض ایک کہانی آپ کے ساتھ کیا کچھ کر سکتی ہے۔

''بوڑھی گنگا'' کے عنوان سے طاہرہ اقبال کا یہ افسانہ جو ماہنامہ ''الحمراء'' لاہور کے شمارہ اکتوبر میں شائع ہوا ہے اور جسے پڑھ کر خیال آیا کہ اگر میں ایسا افسانہ لکھنے پر قادر ہوتا تو مجھے شاعری میں وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس سے پہلے میں سہ ماہی ''تسطیر'' میں ''گلابوں والا ڈیرہ''، سہ ماہی تلازمہ ''پردہ'' اور سہ ماہی ''زرنگار'' میں اس کا رپورتاژ ''دہلی میں پانچ روز'' سے بھی تازہ تازہ سیراب ہو چکا ہوں۔

''بوڑھی گنگا'' بنگلہ دیش کے تناظر میں لکھا گیا ہے جہاں سٹیمر میں ایک عارضی سفر کی داستان قلمبند کی گئی ہے اور اس میں سے ایک ایسی کہانی برآمد کی گئی ہے جو آپ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے جبکہ ڈھاکہ کے مستقل سکونتی ہوئے بغیر یہ کہانی لکھی ہی نہیں جا سکتی حالانکہ طاہرہ اقبال فیصل آباد کی رہائشی ہے اور اگر اس نے ڈھاکہ کے چند روزہ دورہ کے نتیجے میں ہی یہ کہانی لکھ ماری ہے تو اسے ایک بڑی اور غیر معمولی افسانہ نگار تسلیم نہ کرنا پرلے درجے کی بددیانتی ہوگا۔

اس افسانے میں بنگلہ دیش کی مزدور پیشہ عورتوں کا احوال بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دریا میں چلتے ہوئے سٹیمر کے حوالے سے جو منظر کشی کی گئی ہے اور اس کی جزئیات کو طاہرہ اقبال نے اپنی آنکھ کے کیمرے سے جیسے دیکھا ہے اور قاری کو دکھایا ہے وہ ایک الگ اور ایسی ہنرمندی ہے جو اس افسانہ نگار کی تحریروں میں ہمیں جا بجا حیران کرتی دکھائی دیتی ہے۔ میں پریشان اور افسردہ ہوں کہ میں شاید اپنے قلیل مطالعے کی وجہ سے اس کی کوئی اور مثال دینے سے بھی قاصر ہوں کہ میں نے پہلے کہیں ایسی غیر معمولی کارگزاری کا مظاہرہ دیکھا ہو۔

کمال کی جزئیات نگاری کے ساتھ ساتھ اس کہانی میں ڈرامہ بھی ہے جو اپنی جگہ ایک دل دہلا دینے والے المیہ پر منتج ہوتا ہے۔ چنانچہ جہاں اس زبردست افسانہ نگار کے تیز مشاہدے کی داد دینا پڑتی ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ نگاری کا فن بھی ہر کوئی نہیں جانتا۔ یہ درست ہے کہ کہانیاں ہمارے اردگرد ہی بکھری ہوتی ہیں لیکن انہیں بیان کرنے کے لیے اس فن پر جس تحکمانہ عبور کی ضرورت ہے وہ بہت کم لوگوں کو ارزانی ہوتا ہے اور ایسے کہانی کاروں کی تعداد بھی کچھ اتنی زیادہ نہیں ہے جو اس کام کے ساتھ پورا پورا انصاف بھی کر سکتے ہیں۔

میں اس کہانی کا پلاٹ یا تفصیل بیان نہیں کروں گا کیونکہ اگر کوئی یہ جاننا چاہتا ہے کہ سعادت حسن منٹو سے لے کر افسانہ آج کہاں تک پہنچ چکا ہے تو اسے یہ افسانہ خود تلاش کر کے پڑھنا چاہیے بلکہ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ یہ افسانہ ہمارے معروف افسانہ نگاروں کے بھی دیکھنے کی چیز ہے تا کہ انہیں معلوم ہو سکے کہ یہ ہوتا ہے افسانہ۔ شعر ہو یا کہانی کچھ بھی نیا نہیں ہوتا۔ آپ صرف اسے اپنی ذات کا تڑکا لگا کر نیا اور زندہ کر دیتے ہیں۔ سو، طاہرہ اقبال ایسا افسانہ لکھنے کے لیے ہم سب تمہارے شکر گزار ہیں۔

ظفر اقبال

افسانے کی دنیا

تاج سعید (•)

ہمارے معاشرے کا سارا بوجھ مرد نے اپنے کاندھوں پر اٹھا رکھا ہے اور وہ کسی طرح بھی عورت کو اپنے معاملات میں دخل اندازی کرنے کا روادار نہیں ہے اور اگر کوئی عورت کسی طرح سے گھر کی چار دیواری سے باہر قدم نکال لیتی ہے تو اس پر لوگ سوطرح کی الزام تراشی کرنے لگتے ہیں لیکن یہ اس زمانے کی باتیں ہیں جب تعلیم عام نہیں تھی، مرد لڑکیوں کی تعلیم کے حامی نہیں تھے، عورت کو چادر اور چار دیواری میں مقید رکھنے کے خواہاں تھے اور یہ سب کچھ وہ اپنی انا کی تسکین کے لیے کرتے تھے۔ ہمارے ملک میں دیہاتی خواتین پہلے بھی مرد کے شانہ بشانہ کام کرتی تھیں۔ کھیتوں میں ہل جوتنا اور کھیت کھلیان کی حفاظت کرنے کے ساتھ ساتھ وہ گھر کی چکی اور چولہا بھی سنبھالتی تھیں لیکن شہروں میں رہائش پذیر لوگ اس وقت یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی آنکھیں بند کر کے اپنی خواتین کے لیے گھروں کے دروازے بند رکھتے تھے۔ زندگی کی یہ گاڑی چل ہی رہی تھی کہ تعلیم کی رفتار جب تھوڑی تیز ہوئی تو مرد کی عقل پر لگے ہوئے قفل بھی کھلنے لگے اور وہ لڑکیوں کی جہالت دور کرنے کے لیے انہیں اسکول بھجوانے پر آمادہ ہو گئے اور جب تعلیم نے زیادہ زور پکڑا تو عورت نے گھر سے نکل کر دفتروں، بنکوں، سکولوں اور کالجوں میں کام کرنا شروع کر دیا۔ ہوائی جہاز اڑانے اور ڈاکٹر بن کر انسانیت کی خدمت کرنے پر کمر ہمت باندھ لی۔ ایسے ہی ترقی پاتے پاتے خاتون خانہ نے اپنی اور اپنے خاندان کی ذمہ داریاں بھی سنبھال کر اپنی ذہانت اور فکانت کا سکہ جمایا لیکن اب جبکہ ہم اکیسویں صدی کی دہلیز پر کھڑے ہیں ہمارے کئی شہروں اور دیہاتوں میں اب بھی تعلیم عام نہیں ہوئی خاص کر لڑکیوں کی تعلیم کو اب بھی بعض گھرانے برا سمجھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے دل و دماغ کی کھڑکیاں بند کر رکھی ہیں اس دور نا پرساں میں بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو تعلیم کے فروغ کے ساتھ ساتھ خواتین کی زندگیوں میں انقلاب برپا کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور اپنے علم اور قلم دونوں کے ذریعے خواتین میں جذبہ بیداری پیدا کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں میں بہت سی خواتین و حضرات شامل ہیں لیکن ان کے نام گنوانے کا یہاں محل نہیں ہے۔

طاہرہ اقبال کی ابتدائی زندگی بھی ہماری عام خواتین کی طرح تھی اور افسانہ لکھنے سے پہلے اس کے حالات بھی کسی قلعہ بندی پری کی طرح تھے سو وہ اپنے بارے میں بتاتی ہیں کہ ''میرا تعلق میاں چنوں اور چیچہ وطنی کے نزدیک ایک چھوٹے سے گاؤں سے ہے جہاں ایک قلعہ بند گھر میں زندگی کے شب و روز مثل قید تنہائی گزارے۔ پتہ نہیں دنیا اپنے محور کے گرد گھوم رہی ہے یا پتھرا چکی ہے۔ ان فصیلوں کے اندر محیط سارا منظر بس پتھر کا تھا۔ سنگ بستہ کی کہانیاں اسی عہد کی یادگار ہیں لیکن اس وقت کوئی ایسی صورت ممکن نہ تھی کہ انہیں کسی ادبی منظر نامے میں لا سکتی۔ اس وقت سان گمان کہاں تھا کہ کہیں چھپیں گے یا ان کی کوئی ادبی حیثیت بھی تسلیم کی جائے گی۔ خیالات بڑے انقلابی تھے جذبے بڑے بلند، کسی سکول، کالج کی شکل نہ دیکھی۔ پرائیویٹ ایم اے اردو تک پڑھا۔ کالج میں پہلی بار بحیثیت لیکچرر دیکھا انہی دنوں ۱۹۹۲ء میں شادی ہو گئی لکھنا بالکل چھوڑ دیا فائدہ؟ کوئی پذیرائی بھی ہو۔ لکھواتی تو وہ بند حویلی تھی نہ لکھتی تو گھٹ کے مر جاتی۔ یہاں فضا کھلی تھی وسیع دل و دماغ والا شوہر، پیارے پیارے بچے، پتہ نہیں کیوں پھر بھی کسک سی رہی۔ بہت سے خدشات، مطالعہ محدود، وسعت نگاہ مفقود، ایک چادر دیواری کے پار نگاہ کو کبھی رسائی نہ ملی۔''

طاہرہ اقبال باہمت نکلی اس نے حرف و قلم کے ذریعے اپنا درد دل قرطاس کے حوالے کیا اور یوں اسے زندگی کر گزرنے کا قرینہ آ گیا۔ طاہرہ سے پہلے نیلوفر اقبال اور فرحت پروین ایک دھماکے کے ساتھ افسانوی دنیا میں داخل ہوئیں لیکن طاہرہ اقبال کا یہ مجموعہ ''سنگ بستہ'' بھی کسی دھماکے سے کم نہیں ہے اس میں کل پندرہ افسانے شامل ہیں جن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ طاہرہ کا مشاہدہ بڑا تیز ہے اور اس کو فن افسانہ پن مکمل عبور حاصل ہے۔ جب تک افسانے کی بنت کاری کرنے کا ہنر نہ آتا ہو اس طرح کے اعلیٰ پائے کے افسانے لکھے ہی نہیں جا سکتے۔ دیہاتی ماحول میں خواتین جس گھٹن کا شکار ہیں اور انہیں مردوں کے جو ستم برداشت کرنے اور ان کی خدمت گزاری کرنے میں جس قسم کی مصیبتیں اٹھانی پڑتی ہیں ان کا ادراک کسی ایسی خاتون کو ہی ہو سکتا ہے جو اس ماحول کی پروردہ ہو، ان لوگوں میں رچ بس کر ان کے مسائل سے آشنا ہو چکی ہو، تب ہی وہ اتنی دلگداز اور پراثر کہانیاں لکھ سکتی ہے۔ شب خون کی رابعہ، تپسیا کی زینہ اور آپے رانجھا ہوئی کی زہرہ زندہ رہ جانے والے کردار ہیں اور اپنی تخلیق کار کے فن کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی نے خود بھی اپنے افسانوں میں دیہاتی زندگی کی جھلکیاں پیش کی ہیں وہ بھی طاہرہ اقبال کے فن افسانہ کے قدردان ہیں وہ لکھتے ہیں کہ ''اردو افسانہ نگاری کے دور زریں میں بھی مجھے راجندر سنگھ بیدی سے بڑھ کر مشاہدے کی سچائی، گہرائی اور ہمہ گیری کم ہی کہیں ملی مگر طاہرہ اقبال کے چند افسانے پڑھنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ گہرے اور کھرے مشاہدے کے ذریعے اپنے افسانے کو موثر بنانے کا سلسلہ بیدی پر ختم نہیں ہو گیا تھا۔ طاہرہ اقبال کے ہاں مجھے حیرت انگیز باریک بینی نظر آتی ہے۔ غربت و افلاس سے روندے اور کچلے ہوئے ماحول اور اس کے کرداروں کا اتنا قریبی مشاہدہ اور مطالعہ طاہرہ اقبال کی ایک ایسی خصوصیت ہے جو بہت حد تک منفرد ہے۔''

طاہرہ اقبال نے دیہاتی زندگی کا بڑا گہری نظر سے مشاہدہ کیا ہے اور اس معاشرے کی جڑوں کو اکھیڑنے کے لیے اپنے قلم سے شمشیر کا کام لیا ہے۔ زندگی کی حقیقتوں سے مالا مال یہ افسانے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ حقیقت نگاری کا کمال دیکھنا ہو تو سنگ بستہ کے افسانوں کا مطالعہ کیجیے۔ دکھ، تضادات،

ناہمواریاں، فرسودہ رسم و رواج اور نفسیاتی مسائل کو بڑے فنکارانہ انداز میں ان افسانوں میں سمویا گیا ہے اور طاہرہ کا کمال یہ ہے کہ اس نے ان سب کی بڑی ہنر مندی سے تصویر کشی کی ہے جبکہ وہ خود بتاتی ہیں کہ اُنھوں نے بڑے کرب ناک اور قلعہ بند ماحول میں زندگی کا آغاز کیا تھا لیکن لگتا ہے کہ اس کی پیدائش کے ساتھ ساتھ ایک فنکار کا جنم بھی ہوا تھا جس نے آگے چل کر ہمارے لئے اتنے دلگداز اور دلخراش واقعات کو قلم بند کرنا تھا اور افسانے کی دنیا میں اس نے طاہرہ اقبال کے نام کی تختی لگانی تھی۔ یونس جاوید افسانہ نگار ہے، ڈراما نگار ہے اور اس نے بھی کئی عمدہ تخلیقات ادب کے حوالے کی ہیں وہ طاہرہ اقبال کے بارے میں لکھتا ہے'' طاہرہ اقبال ایک ایسی جری اور جرأت مند کہانی کار ہے جس نے جاگیرداری نظام کے جبر اور جہالت پر مبنی رویوں کے حصار میں دراڑ پیدا کر کے پیچھے کے مناظر فوکس کئے ہیں۔ فوکس ہی نہیں پوری جزئیات کے ساتھ ان مناظر کو بھی اجاگر کیا ہے۔ طاہرہ کی کہانیوں کا بنیادی نکتہ عورت اور اس کی محکومیت ہے۔''

''سنگ بستہ'' کے افسانوں میں زندگی نوحہ کناں نظر آتی ہے کہ اس کا ایک بڑا دلگداز روپ یہی ہے اس لئے کہ مردوں کے معاشرے میں عورت کا ہر پل آنسوؤں کی رم جھم میں بسر ہوتا ہے۔

☆

''خالص سونا''

اردو میں دیہات کو۔۔۔ پنجاب کے دیہات کو بہت سوں نے لکھا ہے اور خوب خوب لکھا ہے۔ لیکن طاہرہ اقبال کا دیہات (شاید گنجی بار کا علاقہ) تیز و تند قدرتی چشمے کی طرح مٹی سے پھوٹتا ہے اور پڑھنے والے کو۔۔۔ بلکہ پاس کھڑے لوگوں تک کو شرابور کر دیتا ہے۔

دیہات سے اٹھائے ہوئے ان کے کردار ''اگلے وقتوں کی'' دیہات کی کہانیوں کے سخت رومانی کردار نہیں ہوتے بلکہ وہ آج کی چار پانچ دہائیوں کے مسلے مسلائے کچلے ہوئے ''اصلی تے وڈّے'' فرزند زمیں کی کاری ہوتی ہیں جن کا پُرسانِ حال (شاید خدا کے سوا) ابھی تک تو کہیں کوئی ہوا نہیں ہے۔ لفظ ''فرزند'' اپنی روانی میں لکھ گیا ہوں ورنہ ان کے بیشتر کردار تو دُختران زمین ہوتی ہیں جنھیں ان کی بے بس ماؤں نے جنما اور مسلے اور پیسے اور رڑکے جانے، خرچ کر دیئے جانے اور بالآخر کوڑے کے ساتھ پھینک دیے جانے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ یہاں تو ایک دو بار کے سوا، ایسی روحوں کے لیے کبھی کسی نے مغفرت کی دعا بھی نہ کی ہوگی۔ کسی ادبی تحریک نے پچھلے تیس چالیس برسوں میں، یہ کہہ کر انہیں کبھی تسلی نہیں دی ہوگی کہ اے مظلوم بی بیو! تمہارے بعد اندھیرا نہیں، اجالا ہے۔ یہ سب اسی طرح۔۔۔ بلکہ شاید اور بھی بھیانک انداز میں جاری رہے گا۔ آثار یہی بتاتے ہیں۔

تاہم جاری زندگی کی حقیقی دہشت ناکی میں ایک بات بڑی حوصلہ دینے والی ہے۔ وہ یہ کہ طاہرہ اقبال کی کہانی کا ہر کردار چاہے وہ کیسا ہی شکست خوردہ اور پِٹا پٹایا کیوں نہ ہو، کیسی ہی گند اور کیچڑ میں لتھڑا ہوا کیوں نہ پڑا ہو، وہ کسمساتا اور کروٹ لے کر اٹھ بیٹھنے جیسے تیور رکھتا ہے۔ یہ بات میں نے بین السطور دیکھی ہے یہ بہت زیادہ Pronounced شاید نہ ہو کیوں کہ ان بی بی نے کسی Subtle انداز میں ایسا کچھ ضرور کر دیا ہے کہ مجھے ان کے کچلے ہوئے کردار بھی پوری طرح ہارے ہوئے نہیں لگتے۔ اور یہ بات انھوں نے بہت سے لفظوں میں نہیں کہی۔

یہی ان کا کمال فن ہے اور یہی انہیں اور بھی آگے لے جائے گا۔ کہ اک بے خوفی اور اعتماد ان کی تحریروں میں برابر ملتا ہے شہر کے مڈل کلاس لوگوں کی جھجک ان کی کہانی Grow کرنے سے نہیں روک سکتی۔ ان کے توانا بیانیے کے آگے کسی بھی طرح کی یہ جعلی Moralist ٹک نہیں سکتی کیونکہ طاہرہ نے جو کچھ جتنا بھیانک دیکھا اور سمجھا ہے وہ اپنا بے محابا اظہار چاہتا ہے۔ اگر طاہرہ اسپینش زبان میں لکھ رہی ہوتیں اور وسطی امریکی ریاستوں کے براعظم جنوبی امریکہ کے پٹے ہوئے لوگوں کی بپتا بیان کرتیں تو اس وقت دنیا کی درجنوں زبانوں میں یہ کہانیاں ترجمہ ہو چکی ہوتیں۔ بہرحال اردو ادب اتنی غریب غربا زبان بھی نہیں ہے۔ البتہ لوگ ان کی کہانی Locale سمجھنا چاہتے ہیں۔ طاہرہ ان پنجابی زبان کے مانوس لفظوں کو اس مخصوص گرد و پیش میں لکھتی ہیں۔ اس زبان کا محاورہ زندہ، توانا اور Expressive ہے۔ طاہرہ یہ سب الفاظ جس طرح اپنی کہانیوں میں سناتی ہیں اس طرح ایک قدیم اور مضبوط زبان سے قارئین اور مانوس ہوتے چلے جائیں گے اور اس عمل کے دوران اردو لفظیات کا سرمایہ بھی بڑھے گا۔۔۔ بڑھتا چلا جائے گا۔ میں کسی بھی طرح کے مبالغے کو مسترد کرتے ہوئے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پنجابی زبان نہ صرف صوفی شاعری میں پوری توانائی کے ساتھ ظہور کرتی ہے بلکہ دیہات کی کہانیوں میں بھی قیامت ڈھا رہی ہے۔ میں اردو کہانی سے Creative پنجاب نویسی کی بے شمار مثالیں دے سکتا ہوں۔

طاہرہ سونے کے ان ہی مدفون ذخائر پر بیٹھی ہیں۔ اسے کان Sort of Gold (Mine) کہہ لیجیے۔ یہ خالص سونا ہے جو انہوں نے کھود نکالا ہے۔ جسے کٹھالی میں پگھلا کر بار بار Purify کرنا ہوتا ہے۔ طاہرہ نے اسے اپنے جوہر سے بے شک چمک اور آب دی ہے۔

اسد محمد خان

سنگ بستہ کے افسانے

حمید شاہد
(اسلام آباد)

جب آپ ٹھوس کہانی پر انحصار کرتی ایسی کہانی پر بات کرنا چاہیں گے جو کچھ کچھ باغی ہو، ذرا سی رومانی ہو، جس کے بہاؤ میں نفسیاتی الجھنوں کی جھن جھن ہو اور سماج سے کلی طور پر یوں جڑی ہوئی ہو کہ اس کی حقیقت ہی نہ کھلے اور اس کے بخیے بھی ادھڑتی چلی جائے تو سعادت حسن منٹو کو آپ وہیں پائیں گے ۔۔۔راہ روکے ہوئے۔۔۔اور کچھ نہ کچھ کہتے ہوئے۔منٹو کو حق پہنچتا ہے کہ وہ یوں راہ روک کر کھڑا ہو جائے۔اور جو چاہے جیسے چاہے کہہ دے۔آپ اس سے اختلاف کرنا چاہیں سو بار کریں مگر اس کی بات سننا ہم پر لازم ہے۔کہ یہ حق اس نے کہانی کے بیانیے کی طنابیں کھینچ کر اور اس کی روشن لکیر کے سامنے موضوعات کا پرزم رکھ کر حاصل کیا ہے۔

گذشتہ دنوں میرے ساتھ یہ ہوا کہ جب میں ایک مرد افسانہ نگار کی وہ کہانیاں پڑھ رہا تھا جو عورت ذات کے گنجھل کھولنے کے لیے لکھی گئی تھیں، منٹو آ موجود ہوا تھا۔

منٹو پھر آموجود ہوا جب میں طاہرہ اقبال کے پندرہ افسانوں کا مجموعہ ''سنگ بستہ'' پڑھ رہا تھا۔

لطف کی بات یہ ہے کہ دونوں مرتبہ منٹو کے ہونٹوں پر وہی جملے تھرتھرا رہے تھے جو اس نے امودر گپت کی قدیم سنسکرت کتاب ''نٹنی متم'' کے اردو ترجمہ ''نگار خانہ'' کے دیباچے میں لکھے تھے میں منٹو کے الفاظ دہرا دیتا ہوں:

''۔۔۔اور سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ ان تمام باتوں کو قلم بند کرنے والا ایک مرد ہے۔۔۔یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے۔اس لئے کہ عورت چاہے بازاری ہو یا گھریلو، خود کو اتنا نہیں جانتی جتنا کہ مرد اس کو جانتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ عورت آج تک اپنے متعلق حقیقت نگاری نہیں کر سکی اس کے متعلق اگر کوئی انکشاف کرے گا تو مرد ہی کرے گا۔''

لیجیے صاحب! جو منٹو نے کہا تھا میں نے ہو بہو دہرا دیا۔لفظ لفظ اسی کا ہے۔لہٰذا سارے گناہ ثواب کا حق دار بھی وہی۔میں نے دہرایا بھی تو کلیجہ ہلتا ہے۔

تاہم مجھے ان کلمات سے ہونٹوں کو یوں آلودہ کرنا پڑا ہے کہ یہ منٹو نے ایسے ہی کہے تھے۔

عورت اپنے بدن کی کھال کے اندر کیوں نہیں اترتی۔شاید اس لئے کہ باہر ٹھہرنے اور ٹھہرے رہنے، اسے سجانے، چمکانے اور جاذبِ نظر بنانے ہی میں اسے لطف آنے لگتا ہے۔

میں جب بھی عورتوں کی لکھی ہوئی عورتوں کے بارے میں کہانیاں پڑھتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے ان کے جملے اس پڑچھے کی مانند ہو گئے ہیں جس میں ماہل سے بندھے پانی سے بھرے ٹینڈے ایک ایک کر کے خالی ہوتے رہتے ہیں مگر اس کے اندر ایک قطرہ پانی بھی نہیں ٹھہرتا۔

تاہم میں بہت سے مرد افسانہ نگار گنوا سکتا ہوں جو عورت ذات کے خوب صورت پہناوے الگ کرتے ہیں، ان کی چکنی کھال کھرچ ڈالتے ہیں اور بدن کی پہنائیوں میں اتر کر روح پر لگے زخموں کو کاغذ پر اتار دیتے ہیں۔

ایسے میں منٹو کا کہا ہوا ایک ایک لفظ بہت یاد آتا ہے۔

تاہم گذشتہ کچھ عرصے سے یہ روایت ٹوٹی ہے اور ایسی خواتین افسانہ نگار تواتر سے سامنے آ رہی ہیں جو صرف آئینہ ہی نہیں دیکھتیں اپنا وجود بھی دیکھتی ہیں۔اپنا وجود جس کے اندر وہ اپنے تمام تر جذبوں، حسرتوں، ناکامیوں اور خامیوں کے ساتھ موجود ہیں۔

طاہرہ اقبال کی کہانیوں کو پڑھتے ہوئے مجھے یوں لگا ہے جیسے وہ عورت کے بھیدوں کو جاننے، اسے سمجھنے اور اس کے بھارت وجود کو بوجھنے کا صدق دل سے تہیہ کیے ہوئے ہیں۔''سنگ بستہ'' کی کہانیاں پڑھتے ہوئے ایسے مواقع آتے ہی چلے جاتے ہیں۔کہ آپ چونکتے ہیں۔دکھی ہوتے ہیں یا فقط لمبی سانس لے کر رہ جاتے ہیں۔کہیں کہیں تو کہانی کی عورتوں کے ساتھ آپ افسانہ نگار خاتون کو بھی صاف صاف محسوس کرتے ہیں اس کے کردار کے پلڑے میں اپنا وزن ڈالتے ہوئے اسے ایک نئی راہ بجھاتے ہوئے یا پھر مرد کو زیر کرنے کا ایک نیا گُر بتاتے ہوئے۔افسانہ ''شب خون'' کے ظالم جاگیر دار باپ شہباز خان کی حویلی میں سسک سسک کر مرنے والی عورتوں میں سے ایک لڑکی رابعہ ہی کو لے لیں، طاہرہ اقبال نے اس کا دل اتنا مضبوط بنا دیا کہ وہ حویلی کا بیرونی دروازہ کھول کر باہر نکل گئی حالانکہ اونچی دیواروں والی حویلی میں یا تو عورتوں کو پاگل ہوتے دکھایا گیا ہے یا پھر موت کا لقمہ بنتے ہوئے۔

عورت ذات کو کریدتی ان کہانیوں میں افسانہ نگار خاتون کے قلم کرشمے نے ''تپسیا'' کی بوڑھی دلہن زینب کا ایک ایسا کردار بھی تراشا ہے جو اپنے اٹھارہ سالہ شوہر سانول کو نکال کر لے جاتی ہے۔کہانی کار کے قلم کا سارا وزن بوڑھی زینب کے پلڑے میں ہے۔

کہانی ''آپے رانجھا ہوئی'' کی خوبروز ہرہ جب رحیم داد کو اکھاڑے سے نکال کر اپنے وجود کے اندر سما لیتی ہے اس وجود کے اندر کہ جس میں طلب کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہوتا ہے تو اسے پروا نہیں ہوتی کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔''اسیر ذات'' کی نومی کو بھی کسی اور کی پروا نہیں ہے حتیٰ کہ اپنے شوہر معروف ڈاکٹر رحمٰن آفریدی کی بھی نہیں تبھی تو وہ اٹھارہ سالہ طالب علم ''علی'' کو اپنی تنہائیوں کا ساتھی بنا لیتی ہے۔جب رحیم داد قتل ہو گیا یا پھر نومی، نوعمر علی کا ہم شکل بچہ جن کر اسے آزاد کر رہی تھی تو میں سوچ رہا تھا کہ آخر افسانہ نگار خاتون نے یہ دونوں کردار اس قدر ظالم

کیوں بنائے ہیں؟ ایک عورت عورت کے ایسے ہی کردار بناتی ہے مرد کو چیر پھاڑ ڈالنے والے اس کو قدموں کی مٹی چاٹنے پر مجبور کر دینے والے۔

اپنے حسن میں سب کو روند کر گزر جانے والی عورت کے کردار ''مرقد شب'' کی ''باجو'' بھی کچھ ایسی ہی ہے نذیرے کے بیمار وجود کو روند کر بشیرے کے صحت مند جسم پر نظر رکھنے والی۔۔۔افسانہ ''یہ عشق نہیں آساں'' کی عاشی اس سے بھی حوصلے والی اور خود غرض نکلتی ہے اتنے حوصلے والی اور اتنی خود غرض کہ ماں باپ کی اکلوتی اولاد شہزاد کو گذر سے ساتھ بھگا لے جاتی ہے اور یہ بھی نہیں سوچتی کہ یوں نہ صرف وہ خود تباہ ہو گی، ایک اور پورا گھرانہ بھی تباہ ہو جائے گا۔

آپ کہانیاں پڑھتے جاتے ہیں۔ بظاہر مظلوم عورت کو بیان کرتی کہانیاں۔ اور سطروں کے بیچ سے عورت ایک اور روپ لے کر جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ وہ روپ جو شاید طاہرہ اقبال نے قصداً نہیں لکھا ہے۔ اس کی عورت ذات سے خود بخود سرزد ہو گیا ہے۔ ہر کہانی کے اندر بیان ہوتی ان کہانیوں میں عورت کہیں کہیں تو بہت ظالم ہو جاتی ہے اتنی ظالم کہ ہمیں یہ مردوں کا معاشرہ دکھتا ہی نہیں ہے۔ ''بھوک بھنور'' کی سیانی کے بارے میں آپ کیا فیصلہ دیں گے جو سوہنے سے کہتی ہے۔

''سوہنے تو بھی چھڑا ہے، میں بھی بڈھے سے کہہ آئی ہوں کہ اب کے تیرے پاس لوٹوں تو موئے کتے کا ماس کھاؤں۔۔۔چل دونوں مل کر رہیں۔''

اور اسی افسانے کی ایک اور کردار چاچی چنو کے بارے میں آپ کا فیصلہ کیا ہے جو سوہنے کے لیے حیا کی سرخی اپنے بوڑھے چہرے پر سجا کر اس کی اچھی چنو بن جاتی ہے۔

مرد گر جاتا ہے کہ عورت اسے گرا دیتی ہے۔ اپنے زور سے نہیں۔ داؤ سے، تدبیر سے اور اپنی چالوں سے۔

''خواب کہانی'' کی طلعت کو بظاہر بہت مظلوم دکھایا گیا ہے۔ تین منزلے مکاں میں رہ کر اُجلے خواب دیکھنے والی معلّمہ، جو اپنے محبوب کے دوستوں سے بال بال بچتی ہے۔ شادی شدہ شہباز کی دوسری بیوی بن جانے سے بچنے کے لیے بھی اسے بھاگنا پڑتا ہے۔ مگر ہمت والی ہے اپنے غرور سمیت بچ نکلتی ہے۔ اور پھر جب اس کی بہن ایک ایسے نوجوان کا رشتہ تجویز کرتی ہے جو بے ساکھی کا سہارا لے کر چلتا ہے تو وہ اسے ناقبول کی سطح پر رکھ کر قبول کرتی ہے۔

مرد میں نقص ہو تو مرد مردود ہو جاتا ہے۔ عورت معذور ہو تو مظلوم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اسے وہ ملنا چاہیے جس کے وہ خواب دیکھتی ہے۔

طاہرہ اقبال کہانیوں کی عورتوں کے خوابوں کو اجالتی چلی جاتی ہے۔ اس کے لیے وہ فضا ایسی بناتی ہے کہ پڑھنے والا بھی عورت کے ساتھ ساتھ چلنے لگتا ہے۔

کہانی ''حسن کی دیوی'' کی رانو کو لے لیں کیسے بجلی کے کوندے کی طرح امتیاز پر برستی ہے اور کیسے اس کے بھائی افتخار کی تسکین کا سامان ہوتی ہے وہ حویلی سے باہر اپنے لئے لڑنے والوں کی طرف بھاگتی نہیں حتیٰ کہ ملک صاب سے اپنے حسن کا خراج پا لیتی ہے۔۔۔افسانہ نگار کا قلم اسے مظلوم بنا دیتا ہے اس قدر مظلوم کہ یہی رانو بی بی کے اس کردار پر چھا جاتی ہے جو اپنے بیٹے کے سر پر چپت لگا کر حویلی کے مردوں کو اپنا شغل جاری رکھے چلے جانے کا حوصلہ دیتی ہے۔

طاہرہ اقبال نے اپنے افسانے کی ایک ایک عورت میں کمال کا گھمنڈ ڈال دیا ہے، وہی گھمنڈ جو عورت میں آ ہی جایا کرتا ہے۔ بظاہر اس کی کہانیاں اس غرور اور گھمنڈ کو موضوع نہیں بناتیں بس ہوتا یوں ہے کہ یہی موضوع کہانی کے بھید کی طرح ان کے بیچ سے برآمد ہو جاتا ہے۔ ''خراج'' کی آمنہ علی اپنے جیسا پس منظر رکھنے والے معمولی شکل و صورت کے غفور احمد کا رشتہ اس برتے پر تو ٹھکرائے چلے جاتی ہے اور قبول کرنے کا سے تو دیکھیے۔۔۔ اور کراہت کی انتہا کو تو محسوس کیجیے۔ کیا معمولی شکل و صورت کا پیدا ہونا اور عام پس منظر رکھنا غفور احمد کی مرضی سے تھا۔ کیا اس جبر کے سلسلے سے نکل آنا اس کے بس میں تھا۔ شاید نہیں بلکہ یقیناً نہیں۔ ہاں محبت کرنا اس کے بس میں تھا لہٰذا اس نے محبت کی مگر ایک خوبصورت لڑکی کے لیے صرف محبت شاید کوئی معنی نہیں ہوتے۔۔۔

کہانی ''سڈن ڈیتھ'' کا مرد کردار ڈاکٹر عامر خوب صورت ہے۔ مگر اس کا جرم یہ ہے کہ وہ مرد ہے لہٰذا ایک عورت کا دل جیتنے سے قاصر رہتا ہے۔ وہ تب ہی قابل قبول ہو سکتا تھا کہ وہیل چیئر کے سہارے حرکت کرنے والی ثمینہ سے وہ وعدہ نبھاتا جو اس نے کبھی کیا ہی نہیں تھا لہٰذا وہ ناہید کو شادی کا پیغام دے کر ذلیل کمینہ اور فریبی جیسے القابات کا حق دار ٹھہرتا ہے۔

کہانی ''راکھ ہوتی زندگی کا منظر نامہ'' ہو یا ''پتھر دھڑ والی شہزادی'' اور ''پٹھانی'' مرد سے برتر عورت کا یہی پر غرور روپ کہانی کے عین وسط سے چھلک پڑتا ہے۔

طاہرہ اقبال کے تراشے ہوئے عورتوں کے یہ کردار منٹو کا جملہ بار بار میرے ذہن میں پھینکتے رہے ہیں تاہم مجھے خوشگوار حیرت ہوئی جب میں نے اس کے مرد کرداروں کو دیکھا۔ مرد کی نفسیات کا کمال باریک بینی سے مشاہدہ کیا گیا ہے ان کے بدن کھانچے میں بیٹھ کر، اس کے وجود میں اتر کر اور اس کی رگ رگ میں دوڑ کر۔

مرد کیسے بنتا ہے اور کیسے بگڑتا ہے۔ کیسے ظالم ہو جاتا ہے اور کیوں سہم جاتا ہے صرف ایک کہانی ''شب خون'' پڑھ لیں سارا عقدہ وا ہو جائے گا۔

شہباز خان کو ثریا بیگم جیسی بیوی نہ ملتی تو وہ کیسے ظالم بن سکتا تھا۔ اس کے بیٹے ناصر خان کو نجمہ جیسی عورت کس طرح بدل کر رکھ دیتی ہے۔ ''تپسیا'' کا سانول ہو یا ''اسیر ذات'' کا ڈاکٹر رحمٰن اور علی، ''مرقد شب'' کا نذیر ہو یا ''آپے رانجھا ہوئی'' کا رحیم داد اور نذیر ایا پھر ''یہ عشق نہیں آساں'' کا شہزادا اور دوسرے افسانوں کے مرد کردار، عورت کے وجود سے محبت، خوف، طاقت حتیٰ کہ زندگی اور موت کشید کرتے نظر آتے ہیں۔ اور یہ ان کہانیوں کا سچ ہے۔

ایسا سچ جو بولے اور لکھے جانے والے سچ سے کہیں زیادہ راسخ ہے۔

طاہرہ اقبال کی کہانیوں میں عورت کا کردار مرکزی ہو جاتا ہے۔ تصویر کائنات میں

محض رنگ بھرنے والے نہیں، پورے سماج کو اپنے محور پر گھمانے والا۔ عورت کے
کردار ہوں یا مرد کے، طاہرہ نے انہیں تراشا بہت محبت اور خلوص سے ہے یوں کہ
وہ اپنی شباہت مکمل کرتے ہیں۔ اپنے قدموں پر کھڑے ہوتے ہیں، کہانی کے بہاؤ
میں چلتے پھرتے ہیں اور کہانی ختم ہونے کے فوراً بعد تحلیل نہیں ہوتے کچھ نہ کچھ
پڑھنے والے کی وجود میں رہ جاتے ہیں۔ یہی طاہرہ اقبال کا فن کمال ہے۔
یہ وصف اسے بہت آگے لے جائے گا۔ یقین کیا جانا چاہیے کہ وہ
ایسے کردار تخلیق کرنے میں ضرور کامیاب ہوجائے گی جو لمبی عمر پالیا کرتے ہیں اور
اگلے زمانوں میں جا بستے ہیں۔ بس شرط محنت، حوصلے اور صبر کی ہے۔

''تین آزاد ملک''

''ادیب کا قلم رامش ورنگ کا استعارہ ہے عہدِ موجود کی حقیقی عکاسی اگر افسانہ غزل یا رپورتاژ کے ذریعے سے ہوسکتی ہے تو اس کا ایک رنگ وآہنگ سفرنامہ بھی ہے اور اب یہ اندازِ تحریر صنف کی صورت میں ادبی طرزِ تخلیق کا متقاضی بھی ہے۔''

یہ الفاظ محترمہ طاہرہ اقبال کے چار سفرناموں کے مجموعے ''نگین گم گشتہ'' کے آخری صفحے کے فلیپ پر ڈاکٹر انوار احمد زئی نے لکھے ہیں جن کا خیال یہ ہے کہ اس وقت سفرناموں کی صورت میں آنے والی کتابیں کم ہی ایسی ہیں جنہیں صنف کے اعتبار سے ''سفرنامہ'' کہا جائے۔ لیکن طاہرہ اقبال کو جو اردو افسانے میں ''سنگ بستہ''، ''ریخت''، ''گنجی بار'' اور ناولٹ ''مٹی کی سانجھ'' اور ''رئیس اعظم'' پیش کر کے اپنی انفرادیت قائم کرچکی ہیں۔ ڈاکٹر انوار احمد زئی نے جادو جگانے والی سفرنامہ نگار شمار کیا ہے۔ اب اتفاق کی بات یہ ہے کہ میں نے سنگ بستہ سے ناولٹ ''رئیس اعظم'' تک طاہرہ اقبال کی سب کتابیں پڑھی ہیں اور ان کی فنی اور فکری نشو ونما کو افسانے سے سفرنامے کی طرف اور اب تنقید کی طرف (ان کی تازہ ترین کتاب ''منٹو کا افسانوی اسلوب'' ہے) پیش قدمی کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور طاہرہ نے غلام الثقلین نقوی، بلونت سنگھ، جمیلہ ہاشمی اور احمد ندیم قاسمی وغیرہ دیہات نگاروں کی مقبولیت کے دور میں اپنا منفرد نقش گنجی بار اور نیلی بار کے ثقافتی تناظر سے ابھارا تو اسد محمد خان، یونس جاوید، سجاد نقوی اور نوید سروش جیسے نامور نقادوں نے ان کی عکاسی، نقاشی اور مصوری پر جو الفاظ کی صورت میں اپنی بوقلمونی ظاہر کر رہی تھی مہر تصدیق ثبت کردی۔ لیکن متذکرہ بالا عنوان کی کتاب میں طاہرہ اقبال نے ایک ایسی اقلیم سخن میں قدم رکھا ہے جس میں متخیلہ بہت کم مدد دیتا ہے اور سچے اور کھرے مشاہدے کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر احمد زئی نے ان کے بارے میں جو رائے دی ہے وہ مبنی برحقیقت ہے کہ ''یہ کتاب طاہرہ اقبال کی بوقلمونی تحریروں کا استعارہ ہے۔''

اس کتاب کی اہمیت یہ ہے کہ انہوں نے ایک بڑا سفر برصغیر ہندوستان کے جغرافیے میں کیا اور تاریخ کو ہم رکاب رکھا۔ ان کے زیرِ قدم تین آزاد ملک ۔۔۔ بنگلہ دیش، بھارت اور پاکستان آئے۔ اور ہر سفر جذبات کی ایک انوکھی فضا کی تشکیل کرتا نظر آیا۔ بلاشبہ ان تینوں ملکوں کے تناظر میں طاہرہ اقبال نے حیرتوں کو جگانے کی سعی کی ہے لیکن ان میں دل کے خون ہوجانے کی داستان بھی موجود ہے۔ ''نگین گم گشتہ'' بنگلہ دیش کی سرزمین کا استعارہ ہے جو ذہن کے افق پر اب بھی مشرقی پاکستان کے نام سے ابھرآتا ہے اور یادآئے تو دل سے ٹیس سی اٹھتی ہے جس کی گونج اس سفرنامے میں موجود ہے اور پڑھنے والوں کے دل میں بھی طوفان بپا کردیتی ہے۔ بھارت اور بنگلہ دیش کے سفر میں طاہرہ اقبال نے ہر جگہ مغربی پاکستان کو اپنے دل کے قریب رکھا اور حقیقتوں کے انکشاف پر ''موازنے'' کے عمل سے اولاً عبرت پیدا کی اور ثانیاً یہ باور کرایا کہ ''اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے'' اس قسم کے مقامات پر مجھے چسٹرٹن یاد آتا رہا جس نے کہا تھا کہ سفر کا مقصد ایک انجانی سرزمین پر قدم دھرنا نہیں۔ دراصل یہ اپنے وطن کی بازیافت ہے۔ طاہرہ اقبال کی کیفیت یہ ہے کہ وہ اپنے وطن کو ''بازیافت'' نہیں کررہیں بلکہ اپنی ''پاکستانیت'' کو تحفظ فراہم کررہی ہیں۔

''حرمین شریفین'' کا سفرنامہ قلب ونظر کی اس کیفیت کا آئینہ ہے جس سے عقیدت ومحبت کے جذبات منعکس ہوتے ہیں لیکن طاہرہ اقبال کی مشاہدہ بین آنکھ نے حرم کعبہ اور مسجد نبوی سے باہر معاملات جہاں میں الجھے ہوئے اور دینِ حق کے آفاقی پیغام کو بھلا دینے والے لوگوں کو بھی دیکھا اور انہیں زائرین مصائب میں الجھے نظر آئے تو دلدوز واقعات کے تذکرے سے گریز نہیں کیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ ہر سرزمین کو افسانہ نگار کی آنکھ سے دیکھ رہی ہیں اور حقیقتیں اور حیرتیں ان کو اپنا ہمدرد سمجھ کر تہہ میں اترنے کی اجازت دے رہی ہیں۔

انور سدید

گنجی بار کی ''کینی''

رضوانہ نقوی
(سرگودھا)

کسی بھی فنکار کے فن کی معراج اس کے ہنر کی گہرائی وسچائی پر انحصار کرتی ہے۔ دورِ جدید کے نامور قلم کاروں میں طاہرہ اقبال کا نام اندھوں کی بستی میں ضیاء پاشی کرتا نظر آتا ہے۔ مصنفہ کی ذات سے بحث نہیں وگرنہ کشا کشِ حیات کے صبر آزما لمحوں میں لیکھیکا کی ذات کسی ''افسانوی کردار'' سے کم نہیں۔

کردار نگاری کسی بھی فنکار کے فن کو حیاتِ دوام بخشنے کا باعث ہے کیونکہ یہ کردار ہی ہیں جو داستانیں جنم دیتے ہیں، فرد اور سماج، ظاہر و باطن، خلوت وجلوت کے بھید کھولتے ہیں۔ وقت کے دھارے پر بہتے ہیں تو کبھی اس دھارے کو موڑنے کی کوشش میں ہلکان ہو جاتے ہیں۔ کبھی ہونٹوں پر ہنسی کی صورت بکھر جاتے ہیں اور کبھی آنکھ سے آنسو بن کر چھلک پڑتے ہیں۔۔۔ طاہرہ اقبال کے قلم نے بے مثال کردار تخلیق کیے ہیں۔ ان کے کردار نیلی بار، ساندل بار، گنجی بار اور ساندل بار کی مٹی سے جنم لیتے ہیں اور پھر اسی میں گھل مل کر مٹی ہو جاتے ہیں۔ ان کی کردار نگاری پر دھرتی کے رنگ وخوشبو اس قدر غالب ہیں کہ اگر انہیں ان کرداروں سے جدا کیا جائے تو یہ کردار بے نام ونشان ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کے افسانوں کے بیشتر کامیاب کردار وسطی پنجاب کے انہی علاقوں سے متعلق ہیں۔ ان کے افسانوں کا خاص موضوع دھرتی اور دھرتی کی خلقت ہے اور ان کا قلم اردگرد بکھرے کرداروں کو زندہ متحرک کر دینے کا فن جانتا ہے۔

ان کے کردار سچے بھی ہیں اور سُچے بھی بلکہ ان کرداروں سے مل کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے زندگی اور اس کے تمام پہلوؤں کو اپنے قلم و قرطاس میں سمیٹ لیا ہے اور اپنے کرداروں کی صورت خالص ترین شکل میں ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔

''گنجی بار'' طاہرہ اقبال کا حیرت انگیز افسانہ ہے جس کی فضا کا درد وکرب اسے منٹو اور پریم چند کے شاہکار افسانوں کے برابر لا کھڑا کرتا ہے۔ محرومی، پسماندگی اور جہالت کے اندھیروں سے اُبھرتے اور پھر سے اسی میں ڈوبتے خطے کے منظر نامے میں دُکھ، بے حیثیتی، بے بسی، لاچاری اور مظلومیت کا مرقع افسانے کا مرکزی کردار ''کینی'' بلاشبہ ناقابل فراموش ہے۔ طاہرہ اقبال نے زندگی کے اس رُخ کو جس سے شاید بیشتر لوگ ناواقف ہیں بنا غازہ آلود کیے ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔

طاہرہ اقبال کا یہ کردار نگاری کی خصوصیات سے متصف ہے، کردار افسانے کی فضا سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔ اس کا عمل، ردِعمل، زبان و بیان، اٹھان، انجام، کہانی سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے پھر یہ کردار ذہنی وجذباتی جرأت کے ساتھ ساتھ حالات کے مدمقابل اپنے اندر آنے والی تبدیلیوں اور انقلابات کے باعث بھی کردار نگاری کے فن میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اس کردار کی پیش کش سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ طاہرہ اقبال اپنے کرداروں کو اپنے تابع رکھنا یا کٹھ پتلی بنانا پسند نہیں کرتیں بلکہ وہ انہیں ان کے مخصوص ماحول میں ان کی خاص فطرت وجبلت کے حوالے سے پیش کرتی ہیں۔ ان کے کردار آزاد ہوتے ہیں اپنی فطرت میں بالکل آزاد اور پھر رفتہ رفتہ اپنی جبلت، حالات، خدوخال، نفسیاتی افتاد اور سماجی فطرت کے تحت مائل بہ تغیر اور ''کینی'' کا کردار اس بات کا واضح ثبوت ہے۔

''گنجی بار'' کہانی ہے ایک ایسے سماج کی جہاں قیمت میں اشیاء وجودِ انسانی سے مہنگی ہیں۔ جہاں رشتے تڑخ گئے ہیں اور اعتبار زندہ درگور ہو گیا ہے۔ جہاں ایک ''ماں'' اپنے قریب المرگ بیٹے کی نعش اپنی چند سالہ معصوم بچی کی گود میں ڈال کر کہیں فرار ہو جاتی ہے۔ ''کینی کا کردار'' انسانی فطرت، محبت، معصومیت، ہمدردی اور عظمت کے حوالے سے نہایت اہم ہے۔ ''کینی'' کوئی پڑھی لکھی، باشعور اور اعلیٰ اقدار کی حامل لڑکی نہیں بلکہ چند سال کی معصوم اور غریب بچی ہے مگر افسانے کی ابتداء میں (عالمِ ناسمجھ میں بھی) اپنے بھائی سے اس کی ہمدردی اور محبت اسے اس حقیقی وازلی وجود انسانی کا نمائندہ بنا دیتی ہے جس میں شاید اللہ رب العزت نے سب سے پہلے الفت واحساس ہی پھونکا تھا اور یہ معصوم بہن، اس بہن کی یاد تازہ کر دیتی ہے جو دریائے نیل کی لہروں کے ساتھ ساتھ بھائی کی الفت کی ڈور سے بندھی فرعون کے محل تک دوڑی چلی گئی تھی۔ اس کے کردار کا یہ پہلو اس حقیقت کے تناظر میں روشن تر ہو جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ''ماں'' جیسی ہستی اپنے جگر گوشوں کو موت کے منہ اور زمانے کے خونخوار پنجوں میں دے کر کہیں ''منہ کر جاتی'' ہے۔۔۔ تو ایسے عالم میں ایک بہن اپنے فرض کی بجا آوری سے خون کی کشش اور احساسِ انسانیت سے دستبردار نہیں ہوتی بلکہ وہ بھوکی پیاسی ننھا سا نیم مردہ وجود اپنی ''غلیظ جھولی'' میں سمیٹے ماں کو آوازیں دیتی اور اس کا کھرا تلاش کرتی پھرتی ہے۔

''دِتو! تجھے بھوک لگی وے دتو اماں آ، دتو کو دودھ پلا'' دتو اماں کو کہاں سے ڈھونڈوں وے دتو، کوٹھڑی میں تجھے چھوڑوں تو سپ لڑ جائے۔ باہر موٹے کتے شکرے ڈیلے نکال لے جائیں۔ ونڑ اماں! مڑ آ، ونڑ! اماں۔'' (ص۔۱۲۹)

کینی وارثوں کے ہوتے ہوئے بھی لاوارث ہے اور اسی لاوارثی میں اس کا بھائی اُسی کی جھولی میں دم توڑ دیتا ہے۔ اس رشتے کے ختم ہونے کے بعد اس کے رشتہ دار، معاشرے کا کوئی فرد آگے بڑھ کر اس معصوم بچی کو پناہ دینے کو تیار نہیں۔ زندگی کا بھید بھرا سفر جاری رہتا ہے اور وہ جانوروں سے بھی بدتر حالات میں زندگی گزارے جاتی ہے۔ وہ نہ تو زندگی کے راستوں سے آشنا ہے اور نہ ہی

زندگی گزارنے کا ہنر سیکھ پائی ہے۔اس کے لیے تو زندگی فقط ''ڈھائی والے ٹبے'' سے سورج کا طلوع و غروب ہے۔اگر یہ کہا جائے کہ وہ زندگی کو نہیں بلکہ زندگی اُسے گزارے چلی جارہی تھی تو بالکل درست ہوگا اور پھر بھوک، غلاظت اور ذلت کی ''اروڑی'' (گندگی کا ڈھیر) پر گُر لاتے اور اُسے جانوروں کی طرح کریدتے کریدتے وہ ''جوانی'' کی شاہراہ پہ قدم رکھ دیتی ہے۔لیکن اس کا جوبن لوگوں کو حیران کرڈالتا ہے۔

مگر اس کے لیے وقت نہایت بے رحم اور تقدیر بے حد بھیانک ہے۔اس لیے کہ اس کے سر پر کوئی سائبان نہیں۔اس کے اردگرد مضبوط دیواریں نہیں، اس کی کوئی جائے پناہ نہیں کہ وہ لاوارث ہے اور دنیا لاوارثوں کے ساتھ وہی سلوک کرتی ہے جو اس کے ساتھ کیا گیا۔۔۔زندگی کی ایک بھیانک رات اس پر عذاب بن کر ٹوٹی۔۔۔جب چند شیطان مزاج اس کی جھگی پر مل کر حملہ آور ہوئے اور۔۔۔

''اور لمس کا پیاسا وجود لمس کے افراط میں غوطا گیا۔پیاس بجھانے اور ڈوب مرنے میں شاید ایسا ہی فرق ہے۔'' (ص۔۱۳۹)

اور اس مقام پر زندگی کی ایک نئی حقیقت (اذیت ناک حقیقت) حیات کی اندھی و ویران گلی میں اک نیا در اور زندگی گزارنے کا اک نیا طور اس پر آشکار ہوتا ہے۔اس کی بے نور، ویران جھگی روشن ہو جاتی ہے۔ پھیکے پن کے آبلوں سے چھلنی دین ان کے ذائقوں سے اور خالی وجود سیر حاصلی کی لذت سے لبریز ہو جاتا ہے۔۔۔بدن بیچنا وہ سبق ہے جو اُسے اس کے سماج نے سکھایا ہے اور اس سبق کی مسلسل دہرائی اُس کے ''تن'' اور ''من'' دونوں کی مجبوری بن جاتی ہے۔مگر یہاں ''کینی'' کے کردار کی صورت میں انسانی جبلت اور احتیاج زیست کا نہایت اہم نکتہ سامنے آتا ہے کہ ''انسانی وجود تنہا نہیں رہ سکتا اُسے اپنے جیسے، اپنے سے برتر یا کمتر کسی نہ کسی وجود کی ضرورت بہر حال رہتی ہے اور جسم اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ ''کینی کے وجود کی تنہائی اور خوف کا تریاق لمس ہے اور جب لمس کا بھوکا لُوں لُوں منہ کھولے زبان چاٹنے لگتا ہے تو وہ بار بار اپنے ہی بدن کی بغاوت کے ہاتھوں پسپا ہو جاتی ہے۔۔

کینی کے کردار میں ایک رد کی گئی، پامال کی گئی، مسلی ہوئی عورت ہمارے سامنے آتی ہے مگر یہ عورت ہر خالص عورت کی طرح ایک مضبوط پناہ گاہ کی چاہے جانے کی متمنی ہے۔

اپنے بچپن کے ساتھی اور ہمدرد ''نھو'' کی محبت اس کے رگیدے ہوئے وجود میں مسلسل سانس لے رہی ہے۔ یہ نام بچپن سے جوانی تک اس کی کربناک تنہائیوں کا ساتھی رہا ہے جسے وہ مسلسل پکارتی رہی لیکن محبت نباہنے کے لیے تو اُسے حالات میسر آئے نہ ماحول ملا نہ ہی ایسا قیمتی جھبہ اس کی کمزور و آلودہ مٹھیوں میں قید ہو سکا اور نہ ہی یہ انمول نعمت اس کا دریدہ دامن بھر سکی مگر پھر بھی وہ درِ اُلفت پہ بصورتِ سوالی آئی ضرور، کہ اس نے سوائے نھو کے کسی اور کو چاہا ہی نہ تھا۔

''میرا جی تیرا پرنا اوڑھنے کو چاہتا ہے وے نھو۔''
''میرا جی تیرے نام کی چوڑی پہننے کو چاہتا ہے وے نھو۔''
(ص۱۴۳)

مگر اس در سے اس کے کاسۂ دل میں وہی خیرات گری جو اس جیسی عورتوں کا مقدر ہے۔وہ ''بے خبر'' ہی رہی۔غیرت مند معاشرے کا غیرت مند جوان ایک گناہ آلود بازاری عورت کو کیسے قبول کرسکتا تھا؟

''میرا پرنا تیرے جیسی کے لیے نہیں ہے۔ تجھے پرنوں کی تھوڑ ہے کیا؟ تیری وینی تو ہر رنگ کی چوڑی سے بھری ہے۔''

کینی کا کردار گناہ آلود ہونے کے باوجود مکروہ نہیں ہے۔افسانے کے آخر میں اس کے گناہ کا پھل جب سامنے آتا ہے تو ہاہا کار مچ جاتی ہے۔وہ سماج جس نے اُسے ''کرم زدہ کتیا'' سمجھ کر ٹھوکریں مار مار کر خود سے دور جا پھینکا تھا آج احتساب کے لیے اُسے کٹہرے میں گھسیٹ لایا ہے۔وہ بے گناہ ہو کر بھی (کہ گناہ اس پر مسلط کیا گیا تھا وہ خود مائل بہ گناہ نہ تھی اور آنے والے وقت میں یہی گناہ اس کی مجبوری بن گیا) قابلِ سنگساری ہے جبکہ گناہ گار نا صرف بے عیب و پاک دامن ہیں بلکہ مصنفین میں بھی شامل ہیں۔ایک طرف مرد طبقہ ہے۔جس میں اُسے پامال کرنے والے، پامالی پہ ہنسنے والے، اس کی چیخوں پہ بہرے ہو جانے والے اور منبر پر بیٹھ کر فقط وعظ کرنے والے شامل ہیں جبکہ دوسری طرف عورتوں کا وہ طبقہ ہے جس میں سے بیشتر اسی کی طرح گناہ گار ہیں جن میں مولوی صاب کی ملوک بیٹی، ماسی ستاں، پھتاں، ماسی بگھاں اور ان جیسی کئی اور شامل ہیں مگر چونکہ وہ اپنے سر پر مرد کی مضبوط چھایا اور خاندان کی پناہ گاہ رکھتی ہیں سو وہ بھی بے عیب و عزت دار ہیں اور یہ حق رکھتی ہیں کہ اپنے آلودہ ہاتھوں سے گناہ گنہگار دونوں سے دھرتی کو پاک کردیں۔مگر کینی ایسا نہیں چاہتی۔

''نہ کر کملی نہ کر ہٹ تو سچی ہے پر یہ بڑا پاپ ہے، مسیت کا مینار ڈھے جائے گا۔ڈھور ڈنگر کو منہ خور آجائے گا، نہریں سوکھ جائیں گی۔۔۔موبی کہتا ہے پتھر روڑے مار مار ماردی جائے گی۔''

''موبی جیڑا آپ۔۔۔ آپ میری کوٹھڑی کا بوھا بھن (دروازہ توڑ) گیا۔''

''نمبردار بھی یہی کہتا ہے۔''

''دونوں رل کے آتے تھے۔'' (ص۱۴۷۔۱۴۶)

کینی کا کردار اپنی تمام تر لغزشوں، گناہوں اور بدنصیبوں کے باوجود انسانیت کا نمائندہ کردار ہے۔کینی نے زندگی جرم مسلسل کی طرح کاٹی۔وہ راستے کا پتھر ثابت ہوئی جس کا نصیب ٹھوکروں کے سوا کچھ نہ تھا اور وہ ٹھوکروں پر ہی رہی۔اس کے سامنے سماج کے وہ ٹھیکیدار تھے جو اس کے لٹنے پہ مطمئن اس کی بربادی و گناہ میں برابر کے شریک تھے۔معاشرے کے طاقتور اور عزت دار لوگ خواہ

وہ کمّی تھے یا وڈیرے اوران کے مقابل اس کی اپنی ذات تھی شکستہ، لاچار، لاوارث ایک مظلوم، سچی عورت جس کی انسانیت اور خالص فطرت اپنے جسم میں پلتے ناپاک وجود کواپنے لہو سے نا صرف سینچے بلکہ چاہے جارہی ہے۔ وہ نہ تو شرع وقانون سے پوری طرح واقف ہے نہ زندگی وموت کے حقیقی فلسفے سے اور نہ ہی گناہ وثواب کے اصلی مفہوم سے وہ تو بس اتنا جانتی ہے کہ اس کے بطن میں پلنے والا وجود ایک انسانی جان ہے، اس کے خون کی سانجھ ایک معصوم پیکر جس کا اس گناہ میں کوئی حصہ نہیں مگر وہ بے جرم مارا جائے گا اور اُس کی ماں۔۔۔اس کے قتل پہ کسی طور راضی نہیں۔ (حالانکہ یہ عورت اس ماں کی بیٹی ہے جو ہر رشتے کی زنجیر توڑ دو ننھی جانوں کو حالات کے گرداب میں چھوڑ کہیں ''اُوھل'' گئی تھی (فرار ہوگئی تھی))

وہ اپنے بچے کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے اور اسی کشمکش میں زندگی کی بازی ہار جاتی ہے۔

کینی بظاہر کسی بلند نصب العین، عظیم آدرش یا عمیق فلسفے کا حامل کردار نہیں مگر ژرف نگاہی سے دیکھا جائے تو یہ کردار انسانیت اور خصوصاً عورت کا نمائندہ کردار بن جاتا ہے۔ دھرتی کی وہ بیٹی جو مجبور ہے، لاچار ہے، مظلوم ہے جس کی موت وحیات کا فیصلہ کسی اور کے اختیار میں ہے۔

کینی زندگی کا وہ عظیم درس بن جاتی ہے جس کا کہنا یہ ہے کہ حالات جیسے بھی ہوں زندگی موت سے ہار نہیں مانتی بلکہ وہ اس سے مسلسل پنجہ آزما رہتی ہے اور یہ بھی کہ انسان ہونے اور ''انسان بننے'' میں فرق بہر حال موجود ہے۔ وہ تمام لوگ ''انسان'' تھے جنہوں نے کینی کو ''جانور'' کا درجہ دیا مگر وہ ''جانور صفت'' اوصاف انسانی میں سب سے بڑھ کر تھی کہ جس نے پہلے اپنے بھائی کو اپنی آغوش میں اور بعد میں ایک ''مجرم زندگی'' کو اپنی کوکھ میں پناہ دی۔

کینی کا انجام وہی ہوا جو اس جیسی کمزور اور لاوارث عورتوں کا ہوا کرتا ہے مگر یہ انجام نہایت دردناک ہے اور تمام حالات کے تناظر میں اُس کا کردار اتنا بے گناہ نظر آتا ہے کہ دو بوند آنسو اس کے بے وقعت اور پامال وجود پر بصورت گریہ آن ٹھہرتے ہیں اور وہ استعارۂ درد بن کر قاری کی ذہنی وقلبی فضا کو دھواں دھواں کر جاتی ہے۔

''انشا کی رانی''

میں نے اس سے پہلے بھی طاہرہ اقبال کے کئی طویل افسانے پڑھے ہیں مگر یہ ان کے ناولٹ ''نیلی بار'' کا ابتدائی باب اس کے بارے میں تو یہی کہوں گی کہ ایں کا گراں۔۔۔تو بس ایں چیزے دِگراست۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے قلم میں نہ اتنی طاقت ہے اور نہ ہی وہ الفاظ کہ میں اس کے بارے میں کچھ کہنے کی ہمت کرسکوں۔ کوئی ایک بات ہو تو مجھ جیسی کوتاہ قلم کے قابو آئے۔ کیا سراسر فصاحت وبلاغت کیا گاتی گنگناتی مدھر عبارت ہے جس کی لہروں کا سارا اتار چڑھاؤ اور بدلتے تیوروں کا بیان طاہرہ کے قلم کی کرامت کہی جاسکتی ہے۔ ''گِراں'' زندگی کے ایک ایک پل بدلتے روز وشب کے جلو میں لمحہ لمحہ بدلتی موہوم سے موہوم کیفیتوں کا بیان پوری رنگارنگ جزئیات اور صوتی تاثرات قائم کرنا، اس انداز کی خلاقی اور تخلیقی ہنر کسی کسی کا ہی نصیب ہوتی ہے۔ ''گراں'' ناولٹ کیا ہے ایک جیدّ میموریل ہے جس میں رنگ بھرنے والی کے قلم (قلم ہے یا موقلم) نے گراں اور اس کے تناظر میں پھیلی نباتی اور حیاتی زندگی کے خفیف سے خفیف گوشے کو نظر انداز نہیں کیا۔ حد یہ کہ چوہے کہ ٹھہرے پانی کی تہہ میں جمی کائی کی تہہ سے پھوٹتے پودوں اور کناروں پر لٹکتے جالوں کے کتھئی رنگ اور لمبی لمبی ٹانگوں والے مینڈکوں کے رنگوں کو بھی نظر انداز کرنے کا کیا سوال، وہ تو مکئی اور باجرے کی گرم گرم بھاپ چھوڑتی روٹیوں پر مکھن کی سفید جھاگ سے پگھلتی رنگوں کو بھی رنگ دیتی ہیں۔ میں کہتی ہوں اس خاتون نے اپنی نوک قلم کے اندر کتنے پیلٹوں اور رنگ کی کتنی پیالیوں میں کیسے کیسے اور کتنے رنگ بھر رکھے ہیں۔ کبھی بھلا ہی کی لکڑی کے کوئلوں کی آگ پر جمی سفید راکھ ہے۔ کہیں کہیں مونگ پھلی کی کھیت کھودنے اور سرخ سرخ مٹی پر چھائی ہری ہری بیلوں کے رنگ ہیں۔ میں خود سے پوچھتی ہوں اور پھر اس تمام رنگارنگ بنت کے تارو پود سے بنتی اور ابھرتی ہوئی ''گراں'' زندگی کی ہمہ رنگی کہانی۔ حرکات وجزئیات کی خفیف سے خفیف کیفیت کو ایک راگ، ایک لَے، سُر اور رنگ کے ساتھ کہانی میں سراسر بغیر تکلف یا کسی کوشش کے سموتے جانا۔

اور طاہرہ کا ذخیرۂ الفاظ ہے۔ مجھے تو انشا کی رانی کیتکی کے بعد اسی ڈکشن نے متاثر کیا ہے۔ بس اب کیا کہوں اور کیا لکھوں، میرے قلم میں تو سکت نہیں۔ اس ظالم نے تو رفتہ وگزشتہ کو حال اور آنے والے وقت کو اس طور اور انداز سے پاپا کیا ہے کہ ہر ہر زمانے کے قدموں کی چاپ آنے اور گزر جانے والے سایوں کے موہوم مسکن اس طرح موجود ہیں کہ کچھ کہنے کی حاجت ہی نہیں رہتی۔

میں نہیں کہہ سکتی کہ میرے تاثرات صحیح ہیں یا غلط، پر میں نے اس کو پڑھ کر یہ دعا کی ہے کہ اس اسٹیج پر آ کر زندگی پر بھروسہ کرنا عقلمندی نہیں مگر یااللہ اس ناولٹ کو مکمل طور پر پڑھنے کے لیے ضرور زندہ رکھنا۔

الطاف فاطمہ

''رئیس اعظم''

نوید سروش
(میر پور خاص)

طاہرہ اقبال کا ناولٹ ''رئیس اعظم'' گہرے مشاہدے، فنی پختگی اور اسلوب کی انفرادیت کے حوالے سے بہت اہم ہے۔ یہ اپنے موضوع میں بڑی وسعت اور گہرائی رکھتا ہے۔ پلاٹ کی پیچیدگی کے باوجود یہ ناولٹ پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں آغاز سے انجام تک لیے رکھتا ہے۔ مصنفہ نے دیکھے ہوئے حالات و واقعات کو اپنے اندر سمو کر جس باریک بینی، جزئیات اور مہارت سے پیش کیا ہے وہ لاجواب ہے۔ طاہرہ اقبال نے ''رئیس اعظم'' میں ہمارے معاشرے کے چار طبقوں کی عجیب و غریب کیفیات اور زندگی کی مختلف تلخیوں کو ادبی سچائی کے ساتھ بڑے سلیقے اور بے باکی سے موضوع بنایا ہے۔ ان میں تین طبقے تو بہت طاقت ور اور بااختیار دکھائی دیتے ہیں۔ چوتھا طبقہ بظاہر کمزور، یک طرفہ وفادار اور بے ضرر نظر آتا ہے مگر درحقیقت وہی طبقہ بااثر اور زیادہ خطرناک ثابت ہوتا ہے۔

پہلا طبقہ زمین دار اور جاگیرداری نظام اور اس سے وابستہ جسم و روح کو زخمی اور ذہن کو مفلوج کر دینے والی خرافات، دوسرا طبقہ مصنوعی خانقاہی نظام، پیر و مریدین کے ظاہری اور پوشیدہ معاملات، توہم پرستی، اندھی عقیدت، تیسرا طبقہ سیاست دانوں، اعلیٰ سرکاری افسران اور بے شمار دولت رکھنے تاجروں کی گھریلو زندگیاں اور مختلف الجھنیں اور چوتھا طبقہ وہ ہے جو زمین دار اور جاگیردار کے نجی معاملات کے گواہ اور راز دار ہوتا ہے خانقاہی نظام، پیر و مرشد اور مریدین کے درمیان رابطہ کار، توہم پرستی اور من گھڑت کرامات کا مبلغ ہوتا ہے اور سیاست دانوں، اعلیٰ سرکاری افسران اور ارب پتی لوگوں کے ذاتی معاملات اور مفاد پرستی میں مشیر خاص ہوتا ہے ان کی فرسٹیٹڈ بیویوں تک رسائی حاصل کرتا ہے چوتھا طبقہ ہی خاص حد تک پہلے تین طبقوں سے اچھے اور برے اعمال کروانے کا سبب بنتا ہے۔

طاہرہ اقبال نے زمین داری ذہنیت کا بہت قریب سے مشاہدہ کرنے کے بعد دیہی زندگی میں رونما ہونے والے بظاہر ہر عام یا معمولی سانحات کے مختصر مختصر واقعات پیش کر کے درد اور تکلیف کی شدت کو نمایاں کیا ہے۔ کرداروں کا عمل، واقعات کی سنگینی، بے حسی اور بے بسی کو ظاہر کرتا ہے۔ بڑی ملکانی کا اصل روپ اس وقت سامنے آتا ہے جب رئیس اعظم کو کتا کاٹ لیتا ہے۔ حویلی کے اندر غلام نما خاندانی نوکرانیوں اور خدمت گزار بڑی ملکانی کے غصے کے سامنے خوف سے کانپ رہے ہوتے ہیں۔ حویلی میں سوگ کا عالم ہوتا ہے ہر جانب چیخ و پکار اور ہر چہرہ افسردہ نظر آتا ہے۔ کیفیت دیکھئے:

''ہوا کچھ بھی نہیں ذرا کتا۔۔۔ دانتوں کی وس چڑھ رہی تھی۔ زخم کے کنارے نیلے پڑ گئے تھے۔'' ہائے کتا موا کتا'' (ص۔۱۱۴)

زہری، فاطمہ اور ناجو، جو حویلی کی ملازم ہیں وہ بین کرتی جاتی اور کوسنے دیتی جاتی۔

''ہائے کتا سور۔۔۔ حرامی کی اولاد کتا۔ اجو جٹ کیرن کا جنا ہوا کتا۔ حرامی اجو کی اولاد کتا۔۔۔ تو سلامت کھڑا رہا اور کتا رئیس اعظم کو'' (ص۔۱۱۵)

''اجو کا نطفہ کتا'' (ص۔۱۱۵)

بڑی ملکانی جب سکتے کی کیفیت سے باہر آتی ہے تو عادو سے بدلہ کس طرح لیتی ہے۔

''ملکانی نے چھری چھپٹی جس کے دہکتے انگاروں جیسے خونی ڈیلوں کا عکس چھری کی دھار پر مرتعش تھا۔۔۔ بٹ بٹ کھڑے عادو کی ران میں چھری گھسیڑی اور دستی کے رخ سیدھی کھڑی ہوگئی۔ ٹھیک اسی جگہ پر جہاں رئیس اعظم کو کتے نے کاٹ کھایا تھا۔'' (ص۔۱۱۵)

اسی واقعے سے فاطی کے الفاظ بڑے ملک صاحب کے کردار کو بھی سامنے لاتے ہیں۔

''آج وڈے ملک جی ہوتے تو بھون کے رکھ دیتے سارے چک کو'' (ص۔۱۱۵)

طاہرہ اقبال نے رئیس اعظم کے کردار پر خاص محنت کی ہے بہت وقت اس کے ساتھ گزارا ہے مجھے کئی جگہ یہ محسوس ہوا کہ یہ کردار صرف تخیل کی دین نہیں ہے بلکہ مصنفہ اصل زندگی میں بھی اس سے مل چکی ہیں۔ رئیس اعظم ایک ناز و نعم میں پلا لاڈلا اور حسن و جمال کا پیکر ہے۔ وہ جہاں جاتا ہے وہاں مرکز نگاہ ہوتا ہے عورتیں تو عورتیں مردوں کی بھی اسے دیکھ کر سانسیں رک جاتی ہیں۔ مصنفہ نے رئیس اعظم کی کردار نگاری اس فن کاری سے کی ہے کہ اس کی زندگی کا ہر پہلو پڑھنے والوں کے سامنے روشن ہو جاتا ہے۔ بچپن کی ناز برداریاں، لڑکپن میں ہر خواہش کی تکمیل اور نوجوانی کے جذبات و وجاہت یعنی حویلی کی شاہانہ زندگی سے لے کر خانقاہ کی مایوس زدہ زندگی تک کالج کی مطعون زندگی سے لے کر پاگل خانے کی دل خراش زندگی تک۔ آہستہ آہستہ سب منظر سامنے آتے رہتے ہیں ان میں حسن، شرافت اور نیکی کی ہار اور دھوکہ دہی، جھوٹ اور مفاد پرستی کی جیت ہوتی رہتی ہے۔

رئیس اعظم کا کردار پورے قصے پر چھایا ہوا ہے یہ شخص اوصاف کے حوالے سے ایک مضبوط اور متوازن کردار ہے۔ پورے قصے میں صرف ایک جگہ ذرا حقیقت سے دوری نظر آئی جب وہ اپنے ہم جماعت دبلے پتلے عمر وجٹ کو دوست کہتا ہوا گلے ملتا ہے اور زور لگا کر اس کی پانچ پسلیاں توڑ دیتا ہے اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ عمر جٹ نے غریبوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور اپنے ماحول کے خلاف بغاوت کی آگ جل رہی تھی وہ جب اپنی سوچ کے مطابق آواز بلند کرتا ہے تو رئیس اعظم کا جاگیردرانہ مزاج جوش میں آجاتا ہے۔

''زہری'' ناولٹ کا ایک ایسا کردار ہے۔جس کا خیال کہانی کے ساتھ ساتھ سفر کرتا ہے۔یہ کردار کہانی میں کچھ دیر اپنی آب وتاب دکھا کر ختم ہوجاتا ہے مگر اس کی بازگشت پوری کہانی میں سنائی دیتی ہے۔رئیس اعظم سے وقتی یک طرفہ والہانہ عشق نہ صرف اس کی بے رحمانہ موت کا سبب بنتا ہے بلکہ کہانی کا رخ بھی موڑ دیتا ہے۔زہری کی موت، لاشعوری طور پر رئیس اعظم کی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔حسین اور لاوارث زہری مرنے کے بعد بھی حویلی میں کوئی آسیبی روح بن کر رئیس اعظم کو تنگ کرتی ہے اور رئیس اعظم بھی چھیڑ خانی کرتے ہیں۔عشق کی شرارت اور اٹھکیلیاں ذرا ملاحظہ کیجیے۔

''ذرا باہر نکل کر ایک گیٹی کے بدلے دس چٹکیاں'' (ص۔۱۳۴)

''ایک چٹکی سے دہری تہری ہوتی زہری چھاجوں بھر لذت درد میں غوطائی اوندھی مونڈھی چار پائی کی سمت لڑھکی۔'' (ص۱۳۵)

''ہنسی کی تھار تھار کرتی مشک لہریں کھاتی پلنگ پر بجھ بجھ اٹھتی کسے ہوئے سوت کی چڑ چڑاہٹ چیخی۔۔۔''دس۔۔۔گیارہ۔۔۔بارہ'' (ص۔۱۳۵)

''چٹکیوں کے ساون بھی بھیگتی زہری حضرت صاحب کے پلنگ پر لیٹ کر بجھتی ذرا سی اٹھتی پھر بجھتی حضرت صاحب کے پلنگ کی چڑ چڑاہٹ وڈی ملکانی نے گھٹنا سیدھا کیا، کڑاکا نکلا، لیکن دور کہیں جا کر دماغ کو چڑھا۔گلو کا ہاتھ جھٹکا۔زہری کی ہنسی کی چادر میں بندھی پلنگ پر ٹھپے کھاتی تھی اور رئیس اعظم کے ہاتھ چٹکیوں کی برسات بلا امتیاز برسا رہے تھے۔ (ص۔۱۳۵)

زہری کی کھل کھلاہٹ اور حضرت صاحب کے پلنگ کی چڑ چڑاہٹ زہری کی موت کا آلارم ثابت ہوتا ہے۔بڑی ملکانی کے غصے اور شدت پسندی کا دوسرا انداز، وہ یہاں دقیانوسی اور تکبرانہ سوچ کی ظالم عورت نظر آتی ہے۔بڑی ملکانی اپنے بیٹے کے ساتھ زہری کی یہ شوخی، برداشت نہیں کر پاتی اور چلاتے ہوئے اس پر ٹوٹ پڑتی ہے۔ایک کردار گلو بھی جلتی پر تیل کا کام کرتی ہے۔

''مار ملکانی مار اور مار اس کی جوانی کی تڑ نکال دے آج بڑی آگ اس کے لگی ہے انگ انگ جلتا ہے اس کا رئیس اعظم کا نیل مانگتی ہے۔ہائے ظلمی، حضرت صاحب کا پلنگ، حضرت صاحب کے پیروں کی خاک۔تونے حضرت صاحب کا پلنگ پلید کیا۔'' (ص۔۱۳۵)

بڑی ملکانی کا غصہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

''ہلی سی سفید پتلیوں پر اب خون دھاریاں بنانے لگا تھا بالکل ویسا جیسا زہری کے منہ ناک سے چھٹتا فرش پر دائروں، تکونوں، لوتھڑوں اور دھبوں کی شکل میں گر رہا تھا۔رئیس اعظم باہر نکلا چبوترے پر چڑھا پھر اندر آیا۔۔۔''بے جی چھوڑ دُ'' (ص۱۳۶۔۱۳۵)

یہ منظر دیکھتے ہوئے حویلی کی نوکرانیاں خوف سے کانپ رہی ہیں۔رئیس اعظم بڑی مشکل سے بڑی ملکانی کی مضبوط گرفت سے زہری کو الگ کرتا ہے۔اسے دیوار کے سہارے کھڑا کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ حضرت صاحب کی چار پائی پر بے دم ہو کر گر جاتی ہے۔رئیس اعظم کا باہر جا کر واپس آنا، زہری کو ملکانی سے چھڑوانا، یہ عمل رئیس اعظم کی لاشعوری اپنائیت اور اضطرابی کیفیت کو نمایاں کرتا ہے۔

''بے جی مر گئی، آپ نے اسے مار دیا۔'' (ص۔۱۳۶)

رئیس اعظم یہ خبر انتہائی سنجیدگی سے دیتا ہے ماحول پر افسردگی سے زیادہ خوف کی ایک نئی لہر پھیل جاتی ہے۔حویلی میں نوکرانیوں کو اپنی زندگیوں کا خوف۔زہری کی موت کے دکھ پر حاوی ہو جاتا ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

''نوکرانیاں اپنے اپنے کاموں میں یوں مصروف تھیں جیسے ان کے علم میں کوئی وقوعہ نہ آیا ہو۔جھاڑو لگاتی، برتن مانجھتی، ساگ مدتی، مرغے لوتی، اندر ہی اندر دھک دھک بجتیں جیسے لوں لوں میں دل اُگ آئے ہوں۔پوری بستی چپ تھی جیسے زہری کا نام جس زبان پر آیا اسی پر گولا پھٹ جائے گا۔'' (ص۔۱۳۶)

رئیس اعظم، زہری کی موت کا اثر لیتا ہے، زہری کی قبر پر جا کر دیر دیر تک بیٹھا رہتا ہے یہی تڑپ اور دیوانہ پن رئیس اعظم کے خانقاہ اور پیر صاحب تک جانے کا سبب بنتا ہے۔یہاں سے قصے میں کہانی اور دوسرا طبقہ سامنے آتا ہے۔طاہرہ اقبال نے خانقاہ، پیر صاحب اور مریدین کی حرکات وسکنات، ملنگنیاں، آسیب زدہ خواتین کی چیخ وپکار، قوالیاں، وظیفوں کا ورد اور حجروں میں ہونے والے واقعات کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ قابل توجہ اور حیران کن ہے۔

بڑی ملکانی اپنے بیٹے کے سکون ذہن وقلب کے لیے پیر صاحب کے دربار میں حاضر ہو کر التجا کرتی ہے کہ میرے بیٹے پر نظر کرم کیجیے اور خاص مریدین میں شامل کر لیجیے وہ پیر صاحب کو یاد کرواتی ہے۔

''میرے خاوند مرحوم ملک محمد اعظم رئیس فرید آباد نے اس لڑکے کا بازو آپ کے ہاتھ میں دیا تھا۔آپ کو یاد ہوگا۔'' (ص۔۱۳۹)

بڑی ملکانی برقعے سے نکال کر نوٹوں کی تھیلی پیر صاحب کے سامنے رکھتی ہے۔

''خلیفہ عبدالرحمان نے وصول کیا اور بے اعتنائی سے نذرانوں سے ٹھنسی صندوقچی میں ڈال دیا۔'' (ص۱۳۹۔۱۳۸)

پیر صاحب رئیس اعظم کا حسن و جمال دیکھ کر اور نواب کی اولاد ہونے کی وجہ سے فوراً اُسے خاص مرید کے درجے پر فائز کر دیتے ہیں۔بڑی ملکانی پھر التجا کرتی ہے کہ بس یہ وسوسوں اور خوف سے نکل آئے خلیفہ عبدالرحمان لقمہ دیتا ہے۔

''بی بی محترمہ یہاں بدروحوں کا گزر ممکن ہی نہیں۔دافع جنّات و بلیات، حاشیہ چاروں طرف کھینچا ہے۔ہر ہر اینٹ پر آیت الکرسی اور چاروں قل پڑھ کر پھر چنی گئی ہیں۔سب دیواروں پر رد بلا نقش کندہ ہیں۔'' (ص۔۱۳۹)

رئیس اعظم کو خانقاہ میں ذہنی سکون ملنا تو دور کی بات تھی یہاں کے معاملات اس کی آئندہ کی زندگی کی تباہی کا سبب ثابت ہوتے ہیں۔رئیس اعظم یہاں

اپنی آنکھوں سے ایسے واقعات دیکھتا ہے جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔

طاہرہ اقبال نے پیر صاحب، صاحب زادہ صاحب اور ان کے خاندان اور خانقاہ کے روز و شب کا منظر نامہ جس بے باکی اور ادبی سچائی سے پیش کیا ہے وہ بہت کم دیکھنے اور پڑھنے میں آیا ہے۔ نام نہاد مذہبی ماحول، مصنوعی صوفیانہ زندگی کا لبادہ اوڑھے، ترکِ دنیا کا سبق دیتے ہوئے ہر وقت انگلیوں سے تسبیح کے دانے گھماتے ہوئے اور خانقاہ کو مقدس جگہ قرار دینے اور پیر صاحب کو فرشتہ صفت اور پہنچی ہوئی ہستی قرار دینے والوں کے کرتوت کیا ہیں۔ قابلِ مذمت اور شرمناک، اکثر باتوں کا نہ شریعت سے تعلق اور نہ ہی انسانی اقدار و شرافت سے، پیر صاحب کے غیر شرعی اور غیر انسانی فعل، اپنی جوان خوبصورت بیٹی کو اس کی پھوپھیوں اور بہنوں کی طرح مصلّے پر بیٹھا دیا جاتا ہے اور یہ غیر اسلامی رسم بڑی ڈھٹائی سے رشتے داروں اور مولویوں کے سامنے ادا کر کے اسے متبرک قرار دے دیا جاتا ہے۔ مصلاً صرف پانچ وقت کھلتا ہے اور پھر لپیٹ دیا جاتا ہے۔ قرآن سے نکاح کر کے اسے قرآنی نسخوں کے درمیان زندگی گزارنے کے لیے ''آزاد'' چھوڑ دیا جاتا ہے۔ پیر صاحب کی بیٹی کا جب رئیس اعظم سے سامنا ہوتا ہے تو وہ اپنے جذبات کو اس طرح بیان کرتی ہے۔

طاہرہ اقبال نے یہاں علامتوں، تشبیہات اور استعارات کا سہارا لیا ہے اور مائی جی کے جذبات و احساسات کو زبان دی ہے۔

''مائی جی نے اپنے بدن سے لپٹی چادر اتار دی اور شلفوں پر ڈال دی۔ مہین ململ کا، سفید چنا ہوا دوپٹہ گردن کے گرد لپٹا تھا جس کا کلف عنابی ریشمی جلد پر سرخ دھاری بنا گیا تھا۔ رئیس اعظم کو لگا جیسے کوئی نادر نسخہ شوکیس سے باہر آ گیا ہو۔'' (ص۔۱۴۵)

رئیس اعظم کے یہ الفاظ کہ ''مائی جی میں جاؤں'' مائی جی پر بجلی بن کر گرتے ہیں اور وہ تلخی کے ساتھ اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافی کا اظہار اس طرح کرتی ہے کہ بآسانی طنز کی کاٹ محسوس کی جا سکتی ہے۔

''مائی جی سب کی مائی جی باپ کے لیے بھی مائی جی ماں کی بھی مائی جی متبرک مقدس۔ اس مقدس کتاب جیسی جسے کبھی کوئی نہیں پڑھتا جو بلوریں شوکیس میں محض مرعوب کرنے کے لیے رکھی جاتی ہے یا جسے فنِ خطاطی کا نمونہ بنا کر نمائش کے لیے سجایا جاتا ہے۔'' (ص۔۱۴۶)

رئیس اعظم، گم سم اور گھبراہٹ میں پھر وہی الفاظ ''مائی جی میں جاؤں'' کہتا ہے تو مائی جی کو اپنی بے عزتی کا احساس ہوتا ہے اور وہ چلاتی ہوئی کہتی ہے۔

''میں عمر میں تجھ سے بڑی سہی لیکن جسم میں تجھ سے کم شاداب نہیں لیکن یہ جسم مصلے پر بٹھا دیا گیا۔۔۔ تجھے پتا ہے باقاعدہ جشن مان کر اور رشتے داروں اور علمائے دین کے بیچ یہ رسم ادا کی گئی۔'' (ص۔۱۴۶)

''مت کہو مائی جی۔۔۔ یہ کس آیت میں لکھا ہے کہ لڑکیوں کو مصلے پر بٹھا دیا جائے۔'' (ص۔۱۴۶)

ان معاملات، کیفیات اور کردار سے درگاہ کے اندرونی ماحول کو سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ پیر صاحب کے گھر کا حال یہ ہے تو وہاں آنے والی عقیدت مند خواتین، جن زدہ عورتوں اور دیگر کا کیا حال ہوگا۔

رئیس اعظم اس دعوتِ گناہ سے بچ نکلتا ہے مگر ایک نئی پریشانی کے انتظار میں ہے۔ صاحب زادہ پچکے گال اور چھوٹے قد کا پیر صاحب کا بیٹا جو بد فعلیوں کا عادی ہے رئیس اعظم کو دیکھ کر کہتا ہے۔

''پتھروں کو بوسے دے دے ہونٹ ہی پھٹ گئے جتنا بھی پیو وہی کڑوا کسیلا ذائقہ'' (ص۔۱۴۹)

''تیرا بھی یہی حال ہے نا اگر میں لڑکی ہوتا تو پھر تو پتھر کو نہ چاٹتا'' (ص۔۱۵۰)

رئیس اعظم یہ سن کر حیران ہوتا ہے کہ اس کی کنپٹیاں سنسنا جاتی ہیں۔

صاحب زادہ کے کردار کی ایک جھلک اور ملاحظہ کیجیے جب وہ رئیس اعظم پر فریفتہ ہو رہا ہوتا ہے۔

''اگر میں لڑکی ہوتا تو ساری زندگی تیرے بال بناتا رہتا۔۔۔ کبوتری ہوتا تو تیرے پھیرے لیتا۔ پر میں بدنصیب لڑکا ہوں جسے تو دھتکار دے گا تھوک دے گا۔'' (ص۔۱۵۰)

ناولٹ کا یہ حصہ انتہائی اہم اور نازک ہے۔ ایک تو جنسی معاملات (ہر قسم کے) بیان اور دوسرے کسی خانقاہ میں ایسے مناظر یا واقعات کا اظہار مشکل عمل ہے۔ مصنفہ نے کمال مہارت سے تشبیہات، استعارات اور علامات کے پردے میں سب کچھ سمجھا دیا ہے۔ کرداروں کی حرکات، کیفیات، جملے اور مکالمے قاری کو اندھیرے میں دیکھنے کی صلاحیت دے دیتے ہیں۔ مثلاً صاحب زادہ کے یہ جملے دیکھیے۔

''کبھی کسی لڑکے کو چکھو، بڑا وحشی ذائقہ ہوتا ہے۔ جنگلی پھل جیسا جسے چھری سے نہیں۔۔۔ دانتوں سے کاٹ کھایا جاتا ہے جیسے ادھ پکی ککڑی، ادھ کچری کیری جیسے دن کی پھلیوں، شرینہہ کے پھولوں اور جنگلی کنیر کی شرابور بو۔۔۔ جیسے کستوری مہک'' (ص۔۱۵۰)

ایک مثال اور ملاحظہ کیجیے۔

''غفلت کے پردے سے تہجد کی اذانیں بلند ہوئیں۔ محل کے برآمدے میں لگی وضو والی ٹونٹیوں سے پانی گرنے کی شڑاپ شپاک کی آوازیں۔'' (ص۔۱۵۱)

اس ماحول اور ان واقعات سے رئیس اعظم کو احساسِ گناہ ہوتا ہے تو وہ شرمندہ ہوتے ہوئے معافی کا طلب گار ہوتا ہے جس پر صاحب زادے کا جواب سنیے۔

''ہاں پر جہاں ایسا ممکن نہ ہو وہاں معافی کا در کھلا ہے آج نماز جمعہ کے بعد معافی کی دعا کریں گے ہم دونوں۔۔۔ وہ غفار ہے ستار ہے۔ ہمارے ہر

گناہ کو درگزر کرتا ہے۔ ہر عیب کی پردہ پوشی کرتا ہے۔ رئیس اعظم ! اسے پوشیدگی پسند ہے کیونکہ انسان خطا کا پتلا ہے۔ پردہ پوشی مصلحت ہے۔"

دیکھا کس طرح اپنے ناپاک مقاصد کے لیے مذہب کو استعمال کیا جا رہا ہے نعوذ باللہ معافی کے یقین میں گناہ کبیرہ کیے جا رہے ہیں۔ یہ خانقاہ کا دوسرا روپ تھا تیسرے روپ میں پیر صاحب خود ایک عیش طرب مزاج رکھنے والی شخصیت کے طور پر سامنے آتے ہیں اور خوب صورت رئیس اعظم پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ اپنی تسکین کے لیے سلام میں خود گھڑے ہوئے جواز پیدا کر لیتے ہیں۔ پیر صاحب ارشاد فرماتے ہیں۔

"صاحب زادہ صاحب کی بدعادت نے ہمیں کہیں کا نہ چھوڑا۔" (ص۔۱۵۴)

"قصاص بنتا ہے قصاص بنتا ہے۔ خود رب تعالیٰ نے قصاص کا حکم دیا ہے جان کا بدلہ جان، عزت کا بدلہ عزت۔" (ص۔۱۵۴)

"ہم کتنے مجبور ہیں، یہ قصاص جائز ہے رب کعبہ کا یہی حکم ہے۔ ہم مجبور ہیں۔" (ص۔۱۵۵)

ایسے نہ جانے کتنے واقعات عقیدت اور ضرورت مندوں کے ساتھ رونما ہوتے ہوں گے اور عام لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ ان کی مکمل پردہ پوشی کرنے والے اور انہیں محبت و نظر کرم کا نام دینے والے خلیفہ عبدالرحمان جیسے کردار (ناولٹ میں ایسے ہی کرداروں کو میں نے چوتھا طبقہ کہا ہے) ہمیں ہر شعبے میں نظر آتے ہیں۔ خلیفہ عبدالرحمان کی فتویٰ نما گفتگو دیکھئے۔

"پیر خانے کے کچھ اسرار اور بھید ہیں جنہیں تیری عقل ناقص سمجھنے سے معذور ہے جس طرح رب تعالیٰ کی ذات کے ادراک کی کوشش کم فہم کے لیے الحاد کا راستہ کھول دیتی ہے اسی طرح درگاہ کے اسرار تجھے اوہام کا شکار کر سکتے ہیں تیرے لیے سوچ کی معطلی بہتر ہے زبان بند رکھنا مرید کا فرض عین ہے ورنہ اعمال خاص زبان بند کروانے پر مامور ہیں۔" (ص۔۱۵۵)

ایسے حالات میں رئیس اعظم کس کیفیت کا شکار رہا ہوگا وہ ایک عام سمجھ بوجھ رکھنے والا شخص بھی بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ رئیس اعظم کی شخصیت پر اگلا جھٹکا بڑی ملکانی کی موت سے لگتا ہے پیر صاحب حرم پاک روانہ ہو جاتے ہیں۔ ڈرائیور رئیس اعظم کو گاؤں لے آتا ہے۔

"رئیس اعظم ماں کی چادر آنکھوں پر رکھ کر رویا اور بین کیا۔" (ص۔۱۵۶)

"میں یتیم ہو گیا۔۔۔ بے جی۔۔۔ میرا انتظار تو کیا ہوتا۔ میں تجھے یورپ لے جاتا۔ امریکہ لے جاتا۔ مرنے نہ دیتا۔" (ص۔۱۵۷)

رئیس اعظم کو اپنے ساتھ ہونے والے غیر فطری عمل پر شدید غصہ، دکھ اور شرمندگی تھی وہ ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہے اور خواب آور گولیاں کھا لیتا ہے۔

"کیا مرد کی کوئی عصمت نہیں ہوتی۔ اگر غیرت مند عورتیں ریپ کے بعد زندگی پر موت کو ترجیح دیتی ہیں تو مرد کے ساتھ ہونے والا غیر فطری فعل اس سے کہیں زیادہ بھیانک زیادہ کریہہ ہے۔" (ص۔۱۵۸)

رئیس اعظم کی ذہنی کشمکش سے وہ ہمت ہار بیٹھتا ہے اس میں جینے کا حوصلہ اور امنگ نہیں، لوگوں کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں۔

"میں کیسا بدنصیب ہوں، مر بھی نہ سکا۔۔۔ بھاپا جی مرنے کے فیصلے پر مستحکم رہ کر عمل کر جانے والے کو بچانا، درست نہیں ہوا کرتا۔ باقی پوری زندگی اسے ادھار ملا بوجھ معلوم ہوتی رہتی ہے اچھا نہیں کیا آپ نے۔۔۔" (ص۔۱۵۸)

زہری کی جوانی میں عجیب و غریب موت (قتل) درگاہ کا واقعہ اور ماحول، مذہب اور تصوف کے نام پر دھوکا اور ماں کی موت نے رئیس اعظم کو مکمل طور پر ذہنی مریض بنا دیا تھا وہ شدید قسم کے ذہنی بحران کا شکار تھا۔ وہ اپنے بھائی کے کہنے پر شہر کالج چلا آتا ہے اور اپنے آپ کو نصاب اور ہم نصابی سرگرمیوں میں مصروف رکھنے کی کوشش کرتا ہے مگر یہاں قادر اصفہانی جیسے کردار اس کی راہ میں بڑی رکاوٹ بنتے ہیں اور اس کے لیے نئی نئی پریشانیاں پیدا کرتے ہیں جس سے اس کی آئندہ کی زندگی بالکل مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے۔ کالج میں قادر اصفہانی اس کا مذاق اڑاتا ہے۔ طعنے دیتا ہے۔ رئیس اعظم اپنا ردعمل ظاہر کرتا ہے۔

"رئیس اعظم نے بوٹ کی ٹو اس کی ناف پر ماری اور چبوترے پر اوندھا گیا۔" (ص۔۱۵۹)

قادر اصفہانی یہ کہتے ہوئے کہ "بڑا زور ہے تجھ میں" اپنی دونوں ٹانگیں، رئیس اعظم کے سینے پر مار کر کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے۔

"بھول گیا وہ درگاہ والی رات کیسے کنڈ لگی تھی۔۔۔ کھول دوں سارے کالج کے سامنے تیرے زور کی کتھا۔ بتا دوں تیری حقیقت، تیری زور آوری کی کہانی۔" (ص۔۱۵۹)

جسم کی مار تو رئیس اعظم برداشت کر سکتا تھا مگر یہ الفاظ اس کی روح کو چھلنی کر جاتے ہیں یکدم منظر بدل جاتا ہے اور وہ زمیں پر پڑا مٹی چاٹتا نظر آتا ہے۔ یہ واقعہ کالج میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتا ہے۔ کالج کے لڑکے اس پر جملے کستے ہیں مذاق اڑاتے ہیں۔ رئیس اعظم جو نصابی و ہم نصابی اور کھیلوں کی سرگرمیوں میں پیش پیش ہوتا تھا کالج کا مشہور طالب تھا اب وہ اپنے آپ کو سب سے کمزور اور بے عزت طالب علم تصور کرتا۔ خانقاہ کے مصنوعی نظام کو گالیاں دیتا اور اپنے ساتھ ہونے والے حادثے پر پیچ و تاب کھاتا۔ اس کی زندگی کو شدید احساس ندامت اور تذبذب کی کیفیت نے بہت مشکل کر دیا تھا۔ اس کے اندر شدید نفرت کا جذبہ پنپ رہا تھا اسے شرافت نیکی اور خوبصورتی سے نفرت ہونے لگی تھی۔ وہ مرنے میں تو کامیاب نہ ہو سکا تھا اب اُس نے اپنی بقا نشہ آور ادویات میں تلاش کر لی تھی۔ وہ مکمل طور پر ذہنی مریض بن چکا تھا۔ ڈرائیور امام دین، رئیس اعظم کا کالج سے واپس لاتا ہے۔ پورے راستے امام دین اور رئیس اعظم کی گفتگو کا ایک ایک لفظ رئیس اعظم کی ذہنی کیفیت، باغی سوچ اور نفرت کے جذبے سے پر ہے۔

ایک موقعے پر گاڑی کے سامنے آتے ہوئے ایک بچے کو ڈرائیور بچانے کی کوشش میں بریک لگاتا ہے اس پر رئیس اعظم کا ردعمل دیکھئے۔

''امام دین اسے مار دو، مار دواسے کچل دو۔ خوبصورت بچے کو دنیا جینے کا حق نہیں دیتی۔ مار دوورنہ دنیا اسے تڑپا تڑپا کے مارے گی۔ امام دین بڑا نیکی کا کام ہے۔ تم اس پر بڑا احسان کرو گے۔ اللہ تم سے خوش ہوگا۔ گاڑی موڑ واس کے پیچھے لگا دو۔ مارو امام دین اسے مار دو، مت چھوڑو۔'' (ص۔۱۷۳)

رئیس اعظم کو حسین چہروں اور خوبصورت سراپا سے ایک عجیب قسم کی نفرت ہو چکی تھی اس کا خیال تھا کہ یہ دنیا حسین لوگوں کے لیے نہیں ہے۔ ایسے ہی ایک دن شدید ردعمل کے طور پر اپنے حسین و جمیل بھتیجے معاذ اعظم کو گلا گھونٹ کے مار دیتا ہے۔

رئیس اعظم کا حویلی سے خانقاہ جانا، بڑی ملکانی کی موت، خودکشی کی کوشش، حویلی میں واپسی اور نشہ آور گولیوں کا استعمال، اس پورے سفر میں ہمیں توہم پرستی کے واقعے ملتے ہیں۔ مثلاً

''حضرت صاحب بدروحیں ڈراتی ہیں انہیں۔'' (ص۔۱۳۹)

''میرے شہزادے کے پیچھے جن بھوت لگے ہوئے ہیں۔'' (ص۔۱۵۷)

مصنفہ نے ایک ایک دو دو جملوں میں ایسے واقعے بھی سنائے جیسا کہ عام زندگی میں ہوتا ہے مثلاً ''سناونی ہے ولی داد صوبے دار کا لڑکا راجو جٹی کو نکال لے گیا۔'' (ص۔۱۱۹)

ناولٹ کا ایک بالکل مختلف تیسرا رخ اشرافیہ کا ہے اس طبقے میں سرکاری افسران، جاگیرداروں اور سیاست دانوں کی بیگمات کے بے باک انداز اور عجیب و غریب مسائل نظر آئیں گے یہ مسائل مالی، نفسیاتی سیاسی اور جنسی ہیں۔ ظاہری ٹھاٹ باٹ کی زندگی، قیمتی ملبوسات، میک اپ زدہ چہروں، مصنوعی مسکراہٹ، کھوکھلے قہقہوں سے پر پارٹیوں اور بے مقصد شاپنگ میں یہ بیگمات اپنے غم چھپاتی اور مسائل کے وقتی حل تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور اسی عمل میں اکثر بہک جاتی ہیں۔ طاہرہ اقبال نے اشرافیہ طبقے کے مختلف کرداروں کی کمال مہارت سے عکاسی کی ہے ان کی شاہ خرچیوں اور عیاشیوں کے قصے سنائے ہیں۔ سیاست دانوں کے ایک روپ کی جھلک ملاحظہ کیجیے۔

''ان ایکٹرسوں کا شاید ایک ہی مصرف ہے کہ جس طرح ایم این ایز ہوسٹل میں کمرے الاٹ ہوتے ہیں اسی طرح یہ بھی الاٹی ہیں۔ ہر نئے آنے والے منسٹرز کے لیے ایم این اے اور ایم پی ایز کے لیے'' (ص۔۱۶۴)

اس طبقے کی خاندانی بیویوں کے مسائل اور جذبات کی جھلک دیکھئے۔

''ہم ساری خاندانی بیویاں خالی کمروں اور خالی ڈبل بیڈ کی تنہا وسعتوں میں بھٹکتی ہیں اور یہ نچنیا کنگال بھی کرتی ہیں اور ان عزت داروں کی عزت اتار ہاتھ میں پکڑاتی ہیں اور یہ عزت اتروا کر ایسے ہی خوش جیسے آئی ایم ایف سے قرضہ لے کر حکمران خوش۔'' (ص۔۱۶۴)

جاگیرداروں کی بیویوں کے اپنے احساسات ہیں اپنی کہانیاں ہیں کوئی خوش اور مطمئن نظر نہیں آ رہا۔ مصنفہ نے اشرافیہ طبقے کی بیویوں کی بے باک گفتگو اور جنسی مسائل اور خواہشات کو بڑی خوبی سے علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ خاندانی (دیہاتی) اور شہری بیویوں کی آپس میں جیلسی اور سرد جنگ کو بھی عورت کی نفسیات کے مطابق پیش کیا ہے۔

''جاگیرداروں کی شہری بیویاں جن کے شوہر جاگیر کے معاملات سنبھالنے گئے اور مہینوں پلٹ کر خبر نہ لی۔ اب اسی وقت لوٹیں گے جب دیہاتی ذائقے سے سیر ہو کر منہ کا سواد بدلنا مجبوری ہو جائے گا۔ بس انتظار کرو سیر چشمی کا، سیر شکمی کا اور انتظار کرنے والیوں کی اپنی بھوک اس سیر چشمی، سیر شکمی سے کیوں کر مشروط ہو جائے؟ ہمارے لیے چھ ماہی روزے اور اپنے لیے روز روز عید، شب شب رات'' (ص۔۱۶۴)

یہ فرسٹیٹڈ اور مختلف مسائل اور عجیب و غریب احساس محرومی کی ماری ہوئی خواتین (بیگمات) میں ایک کردار نازیہ کا بھی ہے جو رئیس اعظم پر فریفتہ ہو جاتی ہے اور رئیس اعظم سے بڑی بے باکی سے کہتی ہے۔ نازیہ وفاقی وزیر کی بیگم ہے۔

''آؤ متعہ کر لیں۔'' (ص۔۱۶۷)

''پر میں شیعہ نہیں ہوں'' رئیس اعظم جواب دیتا ہے۔ جس پر نازیہ اپنے خاص انداز سے کہتی ہے ''تو ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے۔'' (ص۔۱۶۷)

نازیہ اپنے حق میں دلائل دیتی ہے اور اس نتیجے پر پہنچتی ہے۔

''بیماری میں ہر قسم کی دوا جائز ہو جاتی ہے۔'' (ص۔۱۶۸)

رئیس اعظم جیسا حسن کا دیوتا نظر آتا ہے ویسا ہی مصنفہ نے اس کے باطن کو صاف اور حسین پینٹ کیا۔ نازیہ اپنے مکمل جنسی جذبات کے ساتھ رئیس کے سامنے موجود ہی نہیں راضی بھی ہے اس ہیجانی کیفیت میں رئیس اعظم کو اپنا ماضی یاد آتا ہے۔ اسے قصاص کے عمل سے گزرنا نڈھال کر دیتا ہے۔ دوسری طرف بیگم نازیہ وحشیانہ طریقے سے اسے اپنی بانہوں میں دبوچنا چاہتی ہے۔

''اس نے دونوں ہاتھ وحشیانہ بڑھائے۔ ایسا ہی ایک پیالہ اسے پہلے بھی پینا پڑا تھا جو خود کو چھلک چھلک کر پیش کرتا تھا۔ جس نے اس کی پیاس نا قابل برداشت بنا دی تھی اور پھر اس پیاس کے جرم میں اسے قصاص کے عمل سے گزرنا پڑا تھا۔ رئیس اعظم کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔'' (ص۔۱۶۹)

یہاں بھی وفاقی وزیر کی بیگم نازیہ کی کیفیت کو تشبیہات اور اشاروں میں پیش کیا۔ رئیس اعظم ایک مردے کی طرح کرسی پر بے سدھ پڑا رہتا ہے۔ مسز نازیہ، اس پر برس پڑتی ہے۔

''اتنا خوبصورت، اتنا تنومند جسم، نرادھوکا فریب پھوکا گنا، دیمک لگا کھوکھلا بانس، کس نے تجھے یہ حق دیا تھا۔ میری انسلٹ کرنے کا۔ مجھے ڈاج کرنے کا۔۔۔ یہاں قدم رکھنے کا۔'' (ص۔۱۶۹)

مسز نازیہ اپنے لباس اور بالوں کو درست کرتی ہوئی غسل خانے جاتی ہے۔ پانی اور پسینے کے چھینٹے اڑاتے ہوئے اس بددعا کے انداز میں نصیحت کرتی ہے۔

''سنو میں تمہیں نصیحت کرتی ہوں کبھی شادی نہ کرنا مگر تم کرو گے تم جیسے ناخلف ایک عورت کو قربان گاہ پر ضرور چڑھاتے ہیں اور پھر اسے بچہ نہ جننے کے جرم میں طلاق بھی دیتے ہیں اور پھر دوسری۔۔۔سن رہے ہو تم Scare crow آرٹی فیشل سورڈ''(ص۔۱۶۹)

رئیس اعظم کے لیے یہ عمل اور تجربہ بھی انتہائی کرب ناک ثابت ہوتا ہے۔ قادر اصفہانی دوسرے دن کالج میں اس پر طنز کرتا ہے۔ اسے ''پاگل گنجا'' کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ رئیس اعظم کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے وہ قادر اصفہانی پر گولیاں برساتا ہوا گاڑی میں آ بیٹھتا ہے اور پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا اگر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو پتھر کا بن جائے گا۔ گاڑی میں بیٹھا ہوا ڈرائیور امام دین سے جذباتی ہو کر کہتا ہے۔

''امام دین قصاص بنتا ہے بالکل بنتا ہے جس نے میری تعلیم چھڑوا دی۔ میری سوشل لائف ختم کر دی، قصاص قصاص۔''(ص۔۱۷۱)

رئیس اعظم حویلی میں تنہائی کی زندگی گزارتا ہے وہ ذہنی طور پر مفلوج ہو چکا ہے کبھی کبھی اس کی باتیں اور حرکتیں پاگلوں جیسی ہو جاتی ہیں۔ وہ نشہ آور ادویات کے سہارے زندگی کے دن پورے کر رہا ہے اس ہڈیوں کے ڈھانچے کا خیال اس کا بھائی انیس اعظم رکھتا ہے دل جوئی کرتا ہے۔

''انیس اعظم نے ٹیکے کی سوئی بازو کی مچھلی میں چبھوئی۔'' برسوں پہلے سوئی چبھوتے ہوئے انیس اعظم کو پورا زور لگانا پڑا تھا۔ سوئی کی نوک ٹیڑھی ہو گئی تھی، بازو کی پتھر مچھلی نے باہر اگل دی تھی اب سوئیوں سے چھید چھید بازو جیسے مردہ گوشت ہو جو کئی روز سے گرمی میں پڑا رہا ہو۔''(ص۔۱۸۲)

رئیس اعظم بظاہر بہکی بہکی باتیں کرتا ہے مگر دراصل یہ باتیں بہت بامعنی ہوتی ہیں جن کی پوری حقیقت سے رئیس اعظم ہی واقف ہے مثلاً:

''میرا قتل کیا گیا۔ مجھے مار دیا گیا۔''(ص۔۱۸۲)

''درگاہ کے کچھ راز ہیں۔''

''موت بہت پرسکون اور خوبصورت ہے نجات چین سکھ، کوئی پریشانی نہیں۔ کوئی اذیت نہیں۔''(ص۔۱۸۲)

وہ اپنے بھائی انیس اعظم سے خود کو مار دینے کی التجائیں کرتا ہے۔

زہری اور مسز منسٹر کو یاد کرتا ہے۔

''موت بہت خوبصورت ہے، زہری سے بھی خوبصورت مسز منسٹر سے بھی۔۔۔ وہ گرتا اٹھتا پیر پکڑتا، ہاتھ جوڑتا، پتلیوں کا سلیٹی غبار پوری آنکھ کو لپیٹ گیا تھا۔''(ص۔۱۸۳)

یہاں ایک کردار فیروزے کی بیوی کا ہے جو حویلی کی خدمت گزار ہے مگر انتقام کی آگ سینے میں جل رہی ہے۔

''اللہ ایسے سڑ سڑ کے مرے جیسے مجھے جلایا۔ پاگل کتے کی طرح بھونک بھونک مرے۔ تعویذ سائیں یہی میری یہی بددعا ہے۔ تیرا عمل میں آج ہی دیکھوں تعویذ سائیں۔ میری رضا تو جانتا ہے شالا اسے موت آئے جوانیو تڑے آج ہی حویلی سے جنازہ اٹھے۔ گور کھدے۔''(ص۔۱۸۳)

توہم پرستی بھی ہر شخص کی اپنی سوچ اور معیار زندگی کے اعتبار سے جنم لیتی ہے یہاں فیروزے کی بیوی کی توہم پرستی ''بے بسی'' کی وجہ سے وجود میں آئی ہے ایک مجبور و بے بس ایسے ہی ہتھکنڈے استعمال کر سکتا ہے۔

رئیس اعظم کی زندگی کا یہ حصہ بڑا کرب ناک ہے ایک دن اس کا خوبصورت بھتیجا معاذ اعظم حسب معمول اس کے کمرے میں آ کر اس سے باتیں کرتا ہے اس کی ذہانت اور صلاحیتوں کی تعریف کرتے ہوئے اسے شادی کا مشورہ دیتا ہے۔ یہ سن کر رئیس اعظم پر ایک جنونی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ ایک جوان بھتیجے کو گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیتا ہے۔

انیس اعظم اپنے بیٹے کی قبر پر بیٹھا اور ملازموں سے کہتا ہے ہمارے خاندان کے بزرگوں نے تو کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی، کوئی زیادتی تو نہیں کی مگر

''ہو سکتا ہے ہمارے بزرگوں میں کسی سے کوئی ایسا فعل ہوا ہو جس کی سزا اب ہم تک پہنچی ہو۔۔۔ بہت دیر میں آئی ہو۔''(ص۔۱۹۵)

عمرو جلتی پر تیل کا کام کرتا ہے۔

''پیر خانے کی بے حرمتی کی سزا ہی آئی ہے ورنہ کوئی گناہ ہمارے پرکھوں سے سرزد نہ ہوا تھا۔''(ص۔۱۹۶)

رئیس اعظم، معاذ اعظم کو مارنے کی پاداش میں پاگل خانے بھیج دیا جاتا ہے وہ چلاتا ہے۔ ''میں پاگل نہیں ہوں۔ نہیں ہوں میں پاگل''(ص۔۱۹۰)

ہماری یہاں ملاقات ایک ہمدرد بوڑھے چوکی دار سے ہوتی ہے جو انسان کو پرکھنے میں ماہر ہے وہ خاصی حد تک رئیس اعظم کی کیفیات اور معاملات سمجھ جاتا ہے۔ تین چار دن بعد جب رئیس اعظم سے نشہ آور ادویات کا اثر ختم ہو جاتا ہے تو وہ بیدار ہوتا ہے یہاں چوکی دار اور رئیس اعظم کی گفتگو بہت اہم اور بامعنی ہے۔ چوکی دار کہتا ہے کہہ دے جو تیرے دل میں ہے۔

''ان سلاخوں سے کچھ باہر نہیں جاتا۔ سب کچھ انہی میں غرق ہو جاتا ہے۔''(ص۱۹۱)

''دل کی کہنے کی اجازت کب کسی کو ملی باباجی۔''

''یہی تو تیرا مرض ہے۔ دل کا روگ سنبھال کے رکھ دیا تو نے یہ بچھو اندر ہی اندر ڈستا رہتا ہے سارا بھیتر نیلو نیل کر دیتا ہے یہاں ہیں تیرے جیسے، بہت آتے ہیں کچھ اپنے ہی دفاع کے ڈسے ہوئے کچھ جگ کے ڈسے ہوئے کچھ اپنے ہی دل کے ڈسے ہوئے۔''(ص۔۱۹۱)

چوکی دار، رئیس اعظم کی کیفیت دیکھ کر اپنی ٹارچ بند کرتے ہوئے کہتا ہے۔

''رولے، رولے کملے۔ اندھیرے کی بکل میں ٹپکا دے اندر کا گند۔ یہ ضبط ہی تو وجود کے راجباہ کی بھل بنتا ہے جو بہاؤ کو روکتا ہے اور آخر پانی کنارے توڑ کر بے سمت بہہ نکلتا ہے۔ معاشرے کا ضبط، مذہب کا ضبط اپنی انا اور عزت کا ضبط۔ اس بھل کی صفائی ضرور ہونی چاہیے جو کچرا اندر جمع ہے نکال دے اسے باہر۔۔۔''(ص۔۱۹۱)

آنسوؤں سے تر چہرے کے ساتھ رئیس اعظم، چوکی دار سے التجا کرتا ہے:

''باباجی آپ نماز پڑھتے ہو نا دعا کیا کرو کبھی کوئی لڑکا خوبصورت نہ پیدا ہو، لولہ ہو، لنگڑا ہو، کالا مُھکنا ہو پر خوبصورت نہ ہو۔''

پاگل خانے میں رئیس اعظم ہوش مندی کی باتیں کرتا ہے کبھی کبھی خود کلامی کرنے لگتا ہے وہ سمجھ جاتا ہے کہ اس پاگل خانے میں اکثر ایسے افراد ہیں جو جرائم پیشہ ہیں اور سزا سے بچنے کے لیے یہاں پناہ لی ہوئی ہے اسی خود کلامی میں رئیس اعظم کی زبانی ہماری ملاقات معاشرے کے اہم طبقے کے ایک کردار سے ہوتی ہے۔

''وہ سب بھی ایسے ہی تھے جنہوں نے مجھ جیسے۔۔۔ مجھ جیسے، اسٹوڈنٹ کی تعلیم چھڑوادی۔ ہر لڑکا ہر پروفیسر ایسے دیکھتا جیسے میں دکان پر سجی ہوئی پراسیچوٹ ہوں میں جو اڑتی مرغابی کو بھون ڈالتا تھا ایک چھرا بھی کسی کے نہ لگا۔۔۔ اس پروفیسر کے بھی نہ لگا جو نوٹس دینے کے بہانے کمرے میں لے گیا اور دروازہ بھیڑ دیا تھا''(ص۔۱۹۳)

پاگل خانے کا عملہ اور بظاہر پاگل اسے پاگل ثابت کرنے پر تلے ہوتے ہیں۔ آخر میں نفسیات کی ایک طالبہ اسما عزیز اپنے ایم اے کے مقالے کے سلسلے میں رئیس اعظم سے ملاقات کرتی ہے اور کچھ سوالات کے جوابات کی طلب گار ہوتی ہے۔ وہ بڑبڑاہٹ کے انداز میں اس قسم کے جوابات دیتا ہے۔

''وہ قادر اصفہانی، بیگم منسٹر اور۔۔۔ اور۔۔۔ حضرت صاحب'' (ص۔۱۹۸)

''وہ ریکارڈ کر رہے ہیں۔ میری ہر ہر بات ہر ہر حرکت، سنو، سنو آواز آرہی ہے۔''(ص۔۱۹۹)

''وہ تمہیں مار ڈالیں گے وہ جو فیل ہو جائیں گے کہ تم پاس کیوں ہو گئی ہو۔''(ص۔۱۹۹)

عجیب کیفیت میں کہے ہوئے جملے ہمیں آئینہ دکھا رہے ہیں وہ یہ کہتے کہتے خاموش ہو جاتا ہے اور کہانی کا اختتام اس سطر پر ہوتا ہے۔

''اسما عزیز نے بیچارگی کے اس ڈھیر کو ہم دردی سے دیکھا اور ڈاکٹر کو بلانے چلی''(ص۔۲۰۰)

''چلا جا حسن سواہ ہے۔ حد سواہ ہے حق سے بھی بچ ناحق سے بھی جا پیچھے نہ مڑ کر دیکھ، پیچھے دیکھنے والا سواہ ہو جاتا ہے چلا جا۔''(ص۔۱۴۴)

دیہات کی معاشرت پر پریم چند، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، علی عباس حسینی، شمس آغا، بلونت سنگھ، جمیلہ ہاشمی، غلام الثقلین اور چند ایک نے بڑی توجہ سے ادب تخلیق کیا ہے طاہرہ اقبال بھی اسی تسلسل کی جدید شکل ہیں وہ دیہات کے دکھوں اور محرومیوں کی پوٹلی سے ایک ایک دکھ کو نئے انداز اور مختلف زاویے سے پیش کر رہی ہیں۔ وہ پنجاب کے دیہات کی سماجیت اور ذہنیت کو گہرے مشاہدے کے بعد قرطاس پر منتقل کرتی ہیں۔ ان کے اکثر افسانوں اور اس ناولٹ (خاصی حد تک) بھی دیہات کا پراسرار ماحول، ضعیف الاعتقادی اور اوہام پرستی کی فضا نظر آتی ہے۔ طاہرہ اقبال دیہات کے زیادہ تر ایسے کرداروں کو اپنا موضوع بناتی ہیں جنہیں اپنے دکھوں اور پریشانیوں کی آگ میں جلنے کے سوا کوئی چارا نہیں ہوتا جنہیں معاشرہ قبول نہیں کرتا جو کسی آسیبی طاقت یا ظلم کا شکار ہو جاتے ہیں بقول ڈاکٹر یونس جاوید:

''طاہرہ اقبال ایک ایسی جری اور جرأت مند کہانی کار ہیں جس نے جاگیرداری نظام کے جبر اور جہالت پر مبنی روایتوں کے حصار میں دراڑیں پیدا کر کے پیچھے کے مناظر فوکس کیے ہیں۔ فوکس ہی نہیں پوری جزئیات کے ساتھ ان مناظر کو اجاگر کیا ہے۔''[۱]

طاہرہ اقبال سے پوچھے گئے ایک سوال کہ آپ نے دیہات کو کیوں منتخب کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ:

''میں سمجھتی ہوں انسان اسی مٹی کے خمیر سے بخوبی آگاہ ہوتا ہے جس سے اس کا اپنا خمیر اٹھا ہوتا ہے اسی زندگی کو سمجھنے کا داعی ہو سکتا ہے۔۔۔ اسی زمین کا حق ادا کر سکتا ہے۔۔۔ میں نے دیہات کو فیشن کے طور پر نہیں لکھا یہ میری روح اور بدن میں رچا ہے۔''[۲]

ناولٹ ''رئیس اعظم'' میں دیہاتی زندگی کے ساتھ ساتھ طاہرا اقبال نے اپنے خاص مربوط انداز میں اعلیٰ شہری زندگی کی جھلک بھی نمایاں کی ہے۔ ''رئیس اعظم'' میں ہمیں کہانی کے چار مناظر نظر آتے ہیں۔ پہلا حویلی کے اندر اور باہر کی زندگی، دوسرا منظر خانقاہ کی مصنوعی فضا اور واقعات، تیسرا منظر کالج کا ماحول، اعلیٰ طبقے کی سرگرمیاں اور بیگمات کے مختلف مسائل اور آخری منظر حویلی میں رئیس اعظم کی ڈیپریس زندگی اور پاگل خانہ۔ میں نے مناظر کا لفظ شعوری طور پر استعمال کیا ہے کہ مجھے ناولٹ میں ''ڈرامائیت'' کی جھلک نظر آتی ہے۔

مکالمہ نگاری، جملوں کی ساخت، لفظوں کی نشست اور کسی حد تک کرداروں کے افعال (حرکات) کی کیفیات پر ڈرامے کے کرداروں کی کچھ کچھ خوبی نظر آتی ہے۔ ان چار مناظر میں تیزی سے بدلتے ہوئے حالات و واقعات اور تجسس، اسے ''ڈرامے'' کے قریب کرتے ہیں۔

طاہرہ اقبال نے کہانی کے پہلے منظر میں حویلی کے اندر اور دیہات کے مجموعی ماحول کو بڑی سچائی سے پیش کیا حویلی کے اندر غلام نما نوکرانیوں اور نوکروں کا وہی حال ہے جو کسی ریاست کے نوابوں کے محلوں اور حویلیوں میں ہوتا

ہے۔ بیگمات، شہزادوں اور شہزادیوں کی مبالغہ آمیز تعریفیں، خوشامدیں، نازنخرے اور دوسری جانب غلاموں اور کنیزوں کے لیے بے رحمی، بے حسی، توہم پرستی، امرد پرستی، خدمت پرستی وغیرہ اور اگر باہر ملک صاحب زمین پر جا رہے ہیں تو آگے پیچھے حفاظت کے لیے سوار موجود ہوتے ملازموں کی حالت حویلی کے اندر اور باہر جانوروں جیسی ہے۔ طاہرہ اقبال نے رئیس اعظم (خصوصاً اس منظر میں) وسطی پنجاب کے علاقے چیچہ وطنی، وہاڑی اور ساہیوال کے قرب وجوار میں بولے جانے والے لب ولہجے کو اردو انداز میں کامیابی سے برتا ہے مشکل پنجابی لفظوں اور جملوں کے قوسین میں اردو ترجمہ دے کر آسانی پیدا کر دی ہے۔

ناولٹ کے اس منظر کے اہم کرداروں میں رئیس اعظم، بڑی ملکانی، انیس اعظم، گلو، میراثن، بھابی، زہری اور دیگر کرداروں میں فاطی، عمر جٹ، ستو مصلن، ماسی گلو، فاجو، عادو، اوجٹ اور مرد وخواتین، حویلی کے ملازم اور مزارے وغیرہ۔

ناولٹ کے دوسرے منظر (طبقے) میں طاہرہ اقبال نے خانقاہ اور وہاں کے کرداروں کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ بلا کا ہے مصنفہ نے اپنے زورِ قلم سے درگاہ کے حالات و واقعات کیا بیان کیے ہیں تصویریں کھینچ کر رکھ دی ہیں۔ خانقہ میں تقدس کی ایک مصنوعی فضا ہے۔ مذہب کے نام پر اپنے مفادات کا حل، حجروں کے دروازوں اور کھڑکیوں کے اوپر چاروں قُل اور دیگر قرآنی آیات کندہ ہیں۔ مریدین درگاہ کی چوکھٹ کو بوسہ دینا مقدس فریضہ تصور کرتے ہیں۔ اور درگاہ پر حاضری نصیب سے حاصل ہوتی ہے خانہ کعبہ کی طرز پر درگاہ کو غسل دیا جاتا ہے۔ بھاری نذرانے وصول کیے جاتے ہیں۔ توہم پرستی اور اندھی عقیدت کا یہ عالم ہے کہ ایک عقیدت مند کہتا ہے۔

''درگاہ مبارک کو ایک غسل آنسوؤں کا بھی دینا چاہیے''

خلیفہ عبدالرحمان کا بیان ملاحظہ فرمائیے۔

''یہ ملنگ اور ملنگنیاں فنافی درگاہ ہیں۔''

خانقاہ میں مختلف علاقوں کے رئیس آتے ہیں ان کی ہر خواہش کا احترام کیا جاتا ہے ہر طرح کی خدمت کی جاتی ہے وہ نواب خوب دادِ عیش دے کر لوٹ جاتے ہیں اور ہر برائی کو مذہب کی آڑ میں چھپا دیا جاتا ہے۔ اس منظر کے اہم کرداروں میں رئیس اعظم، پیر صاحب، خلیفہ عبدالرحمان، صاحبزادہ صاحب، صاحبزادی (مائی جی) بڑی ملکانی دیگر کرداروں میں قوال، جن زدہ عورتیں، فقیر، فقیرنیاں، ملنگ، ملنگنیاں، خدام، مریدین، خاص مرید، ضرورت وعقیدت مند۔

تیسرے منظر کا پہلا حصہ کالج کی سرگرمیاں ہیں۔ دوسرا حصہ ملک کی سیاست کا حال، سیاست دانوں اور بیوروکریٹ کی لاقانونیت اور شاہ خرچیاں، جاگیرداروں کی چال بازیاں اور عیاشیاں اور بیگمات کے مختلف مسائل کو مشاہدے کی گہرائی مگر احتیاط سے پیش کیا ہے۔ ماحول کے مطابق بے باکی کا انداز بھی ہے۔ طاہرہ اقبال نے اس منظر میں جنسی معاملات کو بڑی ہنرمندی سے کہانی کی ضرورت کے مطابق پیش کیا ہے۔ اس معاملے میں وہ عصمت چغتائی کی پیروکار نظر نہیں آتی بلکہ وہ اس نظریے کی قائل ہیں بقول ممتاز شیریں:

''جنسی مضامین میں تفصیلی حقیقت نگاری نہ سائنسی اہمیت رکھتی ہے نہ ادبی، جنس کی تفصیلی حقیقت نگاری کا مقصد محض شہوانی ہو سکتا ہے۔''[1]

مصنفہ جنسی مسائل اور پیچیدگیوں میں اپنے پڑھنے والوں کو اتنی دیر نہیں الجھنے دیتیں کہ وہ قصے میں دلچسپی لینے کے بجائے جنسی لذت کی طرف مائل ہو جائیں اور کہانی کا سرا ان کے ہاتھ سے نکل جائے اس منظر کے پہلے حصے کے کرداروں میں رئیس اعظم، قادر اصفہانی، عادل یعقوب، کامران نقوی، آصف کمال اور کالج کے لڑکے وغیرہ۔ دوسرے حصے کے کرداروں میں رئیس اعظم، مسز نازیہ، ایم این اے کی بیگم، مسز سردار بلال خان، میڈم رنگیلی کوٹھی والی، مسز ڈاکٹر، ڈرائیور امام دین وغیرہ۔

آخری منظر حویلی اور پاگل خانے کا ہے پاگل خانے کی مکمل منظر کشی مصنفہ کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اس منظر کے اہم کرداروں میں رئیس اعظم، معاذ اعظم، چوکی دار، سعود اعظم، ڈاکٹر، جیلاں، ریٹائرڈ ماسٹر فضل دین، عمرو جٹ جبکہ دیگر کرداروں میں گلو معافو، منشی فیروزے، چھوٹی ملکانی، اسما عزیز، پاگل وغیرہ۔

طاہرہ اقبال نے کہانی کے پلاٹ اور اس کی بنت پر خاصی محنت کی ہے۔ کہانی ''رئیس اعظم'' کا پلاٹ بیانیہ ہونے کے باوجود اکہرا اور سپاٹ نہیں ہے۔ اس میں تشبیہات، استعارات اور علامات میں بہت سے اشارے ملتے ہیں یہ بیانیہ انداز ایک نئی راہ اور نئی توانائی کا پتہ دیتا ہے۔ اسلوب کی دل کشی اور پلاٹ کی چستی پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لیے رکھتی ہے۔

طاہرہ اقبال کسی مشاہدے، واقعے یا حادثے کو کہانی میں تبدیل کرنے میں جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرتیں بلکہ اسے سوچتی رہتی ہیں، اسے اپنی زندگی میں شامل کر لیتی ہیں پھر کہیں اسے کاغذ پر منتقل کرتی ہیں جب ان سے سوال کیا گیا کہ ''کیا ہر خیال کہانی بن جاتا ہے؟'' تو طاہرہ اقبال نے کہا:

''جس خیال کو ایک عرصے اپنے اندر بسنے کا موقع دیا جائے اس کے ساتھ وقت گزارا جائے یہاں تک کہ وہ اپنے دل کی دھڑکن بن جائے پھر اسے صفحہ قرطاس پر اتارا جا سکتا ہے کبھی سنا ہوا کوئی جملہ دیکھا ہوا ایک منظر کسی کردار کی ایک جھلک تخلیقی عمل کا محرک بن جاتا ہے لیکن اک عرصہ ریاضت چاہتا ہے۔''

طاہرہ اقبال اس ہنر سے بخوبی واقف ہیں کہ کس موضوع پر کس طرح اور کتنا لکھنا ہے کہانی کا اختتام کہاں کرنا ہے وہ کہانی کی ضرورت کے مطابق ماحول تخلیق کرتی ہیں اور ضرورت کے مطابق اسلوب اپناتی ہیں۔ وہ مسلسل محنت کر کے مختصر لکھنے کو ترجیح دیتی ہیں جو کہ ایک مشکل عمل ہے۔ طاہرہ اقبال نے ایک سوال کہ آپ کو افسانہ نگاری پر قدرت حاصل ہے۔ آپ نے ناول نگاری کی طرف دھیان کیوں نہیں دیا؟ جواب دیا۔

''ابھی دو ناولٹس ''مٹی کی سانجھ'' اور ''رئیس اعظم'' چھپے ہیں ابتدائیہ

بھی دوبھر پورناول تھے لیکن تراش خراش اور مسلسل تنقیدی عمل والی عادت کی وجہ سے یہ سوسوصفحات میں سمٹ کرناولٹس بن گئے۔''

یہ ناولٹ پڑھتے ہوئے مجھے بارہا یہ احساس ہوا کہ ''رئیس اعظم'' کے اہم کرداروں میں طاہرہ اقبال کی روح اتر آئی ہے۔ کہیں وہ نوجوان رئیس اعظم کی طرح حسین اور مظلوم دکھائی دیتی ہیں، کہیں بڑی ملکانی کی طرح روایتی ماں اور ظالم جاگیردارنی نظر آتی ہیں کبھی پیر صاحب کا روپ دھار لیتی ہیں، کہیں صاحب زادی کی طرح معصوم اور قابل رحم نظر آتی ہیں کبھی رنگیلی کی طرح شوخ و چنچل دکھائی دیتی ہیں، کہیں مسز منسٹر کی طرح بے باک اور خواہشات کی اسیر نظر آتی ہیں اور کبھی اسما عزیز کی طرح اسکالر بن کر ہمارے سامنے آتی ہیں۔ مصنفہ نے ہر کردار کو خود پر حاوی کر کے اوراس کا دیرتک اثر قبول کر کے پینٹ کیا ہے۔

''رئیس اعظم'' میں وہ اپنے بنیادی موضوع دیہات کی معاشرت کے مختلف انداز اور ''عورت'' کی مظلومیت سے بھی کچھ باہر آئی ہیں اور رئیس اعظم میں ایک مرد کی عجیب مظلومیت کی درد بھری کہانی اور اشرافیہ کی زندگی کی جھلک نمایاں کی ہے جس سے میرے خیال میں وہ ایک مکمل کہانی کار بن گئی ہیں۔

''اہم افسانہ نگار''

سنگ بستہ میں شامل طاہرہ اقبال کے بیش تر افسانے دیہاتی معاشرے کو اپنا موضوع بناتے ہیں مگر بہ اندازِ دگر۔۔۔ اپنے زمانے میں پریم چند نے بھی دیہاتی زندگی کو اپنا موضوع بنایا تھا مگراس نے دیہاتی زندگی کے معاشی اور معاشرتی مسائل کے حوالے سے افسانے لکھے تھے۔ بعد ازاں احمد ندیم قاسمی نے زیادہ تر طبقاتی کشمکش کے حوالے سے دیہات کو دیکھا جب کہ غلام الثقلین نقوی نے دیہاتی کرداروں کی معصومیت، قوتِ برداشت نیز دیہات کی ثقافت میں موجود خیر کے عناصر کو منظرِ عام پر لانے میں بے مثال کامیابی حاصل کی۔ ان کے برعکس بلونت سنگھ نے دیہات کے متشدد روپ کو افسانوں میں اجاگر کیا۔ طاہرہ اقبال کی خوبی یہ ہے کہ اس نے دیہات کی تہہ میں مستور ''جنگل'' کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی۔ اس نے دیہات کے زیادہ تر ایسے کرداروں کے بارے میں لکھا ہے جو معاشرتی دائرے کے محیط سے چمٹے، آسیب زدہ لہوا گلتے یا اپنے اندر کے تنور میں بھسم ہوتے ہوئے کردار ہیں۔ ان افسانوں کی ایک اضافی خوبی یہ بھی ہے کہ ان میں قدیم جادوئی فضا اوراس کی پراسراریت اور ضعیف الاعتقادی کو آج کی دیہاتی زندگی میں کارفرما دکھایا گیا ہے۔ مختصراً یہ کہ طاہرہ اقبال نے گاؤں کو عمومی طور پر بھی دیکھا ہے اور افقی طور پر بھی! میرا خیال ہے کہ اس نے اسلوب کو اور نکھارنے پر توجہ دی تو وہ دن زیادہ دور نہیں جب وہ ایک اہم افسانہ نگار کے روپ میں ہمارے سامنے آ جائے گی۔

وزیر آغا

''اُسلوبیاتی تنوع''

ادبی دنیا میں طاہرہ اقبال کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ انہوں نے بہت کم عرصے میں اپنے متنوع موضوعات اور خوبصورت اسلوب کے سبب سنجیدہ ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کی بنیادی اور پہلی شناخت افسانہ نگار کی ہے مگر ان کی تخلیقی شخصیت دیگر اصناف تک بھی اپنا پھیلاؤ رکھتی ہے جس میں کالم نگاری، تنقید اور تحقیق سبھی شامل ہیں۔

''سعادت حسن منٹو کے افسانوں میں اسلوبیاتی تنوّع'' اُن کا پہلا تنقیدی تحقیقی معرکہ ہے۔ منٹو کا شمار اُن خوش نصیب ادیبوں میں ہوتا ہے جن پر بے شمار کُتب لکھی گئیں۔ یہی نہیں بلکہ اعلیٰ سطح پر ہر پہلو سے تحقیقی مقالہ جات بھی تحریر ہوئے۔ اور یہ عمل اب بھی جاری ہے مگر باوجود اس کے کہ ان پر بہت لکھا گیا ہے ایک پہلو ضرور ایسا رہا ہے جس پر کام کرنے کی اب بھی گنجائش موجود تھی۔ منٹو کے موضوعات چونکہ بہت اہم اور سنجیدہ ہیں لہٰذا اُن پر لکھنے والوں کی پہلی توجہ اسی طرف جاتی ہے۔ اُن کی تکنیک اور اسلوب پر گہرائی اور گیرائی کے ساتھ کام کرنے کا رویہ بہت کم دکھائی دیتا ہے۔ منٹو کا شمار صاحب اسلوب افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے اور منٹو کے ناقدین اور شارحین اس کا تذکرہ بھی کرتے ہیں مگر اُن کا اسلوب ہے کیا؟ اور وہ کس طرح اُن کے موضوعات کی سمت متعین کرتا ہے اس موضوع پر ہمیں کوئی تحقیقی اور تجزیاتی کتاب دستیاب نہیں جو تمام سوالات کا احاطہ کرتی ہو۔ طاہرہ اقبال کی کتاب نہ صرف اس کمی کو پورا کرتی ہے بلکہ آئندہ لکھنے والوں کے لیے بعض سنجیدہ معاملات بھی سامنے لاتی ہے۔

احمد جاوید

تاج محل —— محبت کا کنول

-سفرنامہ-

طاہرہ اقبال

اُمر ہوٹل آگرہ کا کشادہ ڈائننگ ہال کھچا کھچ بھرا رہتا تھا۔ بریک فاسٹ کے وقت کوئی نشست خالی نہ ملتی تھی۔ قطار در قطار بوفے میں مختلف ناشتے سجے ہوتے ٹھنڈے جوسز کی مشینیں، چائے کافی کی گرم بھاپ چھوڑتی ہوئی مشینیں مختلف فلیورز کے سریل، دودھ دلیا، بریڈ، آملیٹ، فرائی بائلڈ ایگز، کیک مٹھیاں بسکٹ، تازہ پھل، ڈرائی فروٹ، پوری، حلوہ، پراٹھے، آلو کی بھجیا، چنے اور نجانے کس کس انداز کی پکی سبزیاں اور دالیں، ان فور فائیو سٹارز ہوٹلز میں ویجی بوفے میں ڈشیز کی تعداد پوری کرنے کے لیے نجانے کیسے کیسے پاپڑ بیلنے پڑتے تھے۔ ہاں پاپڑ بھی موجود رہتے تھے۔ گوشت کی شان تو پھر نرالی ہے ایک جانور سے بیسیوں کھانے تیار کرلو، قیمہ، کوفتے، پسندے، کڑاہی گوشت، بالٹی گوشت، اچار گوشت، قورمہ، شوربہ، سبزی گوشت، روسٹ بروسٹ، بھی، سٹیم، تنوری، چرغہ، حلیم، نہاری، گردے، کلیجی کتنی قسموں کے کباب، چاول، سالن، چاہے دس فائیو سٹارز کی متعین ڈشز پوری کرلو، جو ایک دوسری سے مختلف بھی ہوں، یہاں ہندوستان میں یہی کام دالوں اور سبزیوں سے لیا جاتا ہے جو سلوک گوشت کے ساتھ ہم پاکستانی کرتے ہیں وہی سلوک ان غریب النہاد جانوں یعنی دالوں، سبزیوں کے ساتھ وہاں ہوتا ہے۔

ناشتے میں مجھے تو اٹلی پسند آیا، جسے سانبھڑ کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔ مختلف دالوں اور آلوؤں کے قتلوں کا پتلا سا آمیزہ، سانبھڑ غالباً چاول کے آٹے سے بنی مخروطی مرکز والی ٹکیاں اٹلی اس میں ڈبو کر کھائی جاتی ہیں، جسے گورے بھی شوق سے کھا رہے ہوتے، ہر صبح یہ ڈائننگ ہال مہمانوں سے بھرا ہوتا، جن کے لیے انڈین، عربی اور مغربی طرز کے ناشتے سجے رہتے، مہمان جلدی جلدی ناشتے سے نمٹ کر بیرونی دروازے کی سمت بڑھتے، جہاں کسی ہندو دیوی کا طویل قامت بت ایستادہ تھا، جس کے پہلوؤں سے مصنوعی آبشاریں بہتی تھیں اور جس سے پرے ٹورسٹ بسیں اور ٹیکسیاں کھڑی ہوتیں اور یہ سبھی بس ایک ہی رُوٹ پر جاتی تھیں ''تاج محل''

آگرہ کا یہ تاریخی شہر مغلوں کی پہلی راج دھانی، جس کی شکستہ حال سڑکوں کے گرد غلاظتوں کے ڈھیر لگے رہتے تھے کھیاں بھنبھناتی تھیں۔ کج مج بازاروں میں ہتھ ریڑھیوں، سائیکل رکشوں، آٹو رکشوں کی بے ہنگم بھیڑ اور شور لیکن سیاح ہیں کہ اسی شہد کے چھتے پر اُمڈے پڑ رہے ہیں کیونکہ اسی گدڑی میں وہ لعل چھپا ہے جس کی کشش سے سارک رائٹرز فیسٹول اس سال یہاں منعقد کیا گیا تھا، کسی دُکان دار سے، کسی رِکشہ ڈرائیور سے کسی بھی شخص سے وہاں بات کرو تو ایک ہی سوال منتظر ہوتا۔

''پاکستان سے آئے ہیں تاج دیکھ لیا۔''

''ابھی نہیں دیکھا۔''

پوچھنے والا جیسے ہماری گستاخی پر حیرتوں میں ڈوب جھنجھلا جاتا۔

''ارے یہ کیسے ممکن ہے آگرہ پہنچ کر تاج دیکھے بنا کوئی کیسے رہ سکتا ہے۔''

جیسے آگرہ پہنچتے ہی تاج پر حاضری نہ دینا سوءِ ادب ہو۔ آگرہ کے شہری قوانین کی محبت کے آداب کی سخت خلاف ورزی ہو لیکن سارک فیسٹیول کے شرکاء کو صبر کا باٹ لگایا گیا تھا کہ کانفرنس کے اختتام پر تاج محل لے جانے کا پروگرام ابتداء میں ہی دے دیا گیا تھا۔ اسی لیے تاج سے پہلے ہم نے فتح پور سیکری کا قلعہ دیکھ لیا، جسے شہنشاہِ اکبر نے صوفی سلیم چشتی سے ارادت کے جذبے کے تحت اُن کی درگاہ کے قصبے میں تعمیر کروایا تھا۔ اس قلعے کا بھی عجب ماجرہ ہے۔ میلوں پھیلے قلعے کے اندر پورا دارالخلافہ بسایا گیا تھا۔ یہ ۱۵۷۱ء سے ۱۵۸۵ء تک مغلیہ دارالحکومت رہا۔ فصیلِ شہر کے اندر وزیروں، امیروں، لشکریوں اور دیگر حکام کی رہائش گاہیں بنائی گئی تھیں، یہاں دفاتر، عدالتیں دیگر سرکاری عمارتوں کے علاوہ شاہی محل، حرم گاہیں اور مسجد تعمیر ہوئیں۔ ہم جس طویل وعریض دروازے سے داخل ہوئے وہ شکست وریخت کے آخری مراحل سے دوچار تھا۔ فصیل کے ساتھ ساتھ شکستہ تاریخی عمارتیں اب غریب بستی کی شکل اختیار کر چکی تھیں۔ ایک ایک کمرے میں بڑے بڑے کنبے آباد تھے۔ اُکھڑے ہوئے فرش، دھوئیں سے سیاہ پڑی سرخ اینٹیں، غربت وافلاس کے گرد بار کی بھوت نگری جیسے کوئی۔

پرانے بوسیدہ درختوں تلے کئی مرد بےکار بیٹھے جیسے تاریخ کے بوسیدہ اوراق کی جگالی کرتے ہوں اور ان کے نہائے دھوئے بچے دھما چوکڑی مچا رہے تھے۔ عورتیں موٹی موٹی قدیم چوکھٹوں والے کالک زدہ دروازوں کی اوٹ سے جھانکتی تھیں۔ پُرشکوہ تاریخ اور عسرت کا عجب بے ہنگم، ملاپ شاہی محلات اور تاریخی قلعوں پر ایسا افلاس برستا ہوا کبھی نہ دیکھا۔ شاید یہ ناجائز قابضین تھے یا شاید انھی شہزادے شہزادیوں کی اولادیں جنھیں خواجہ حسن نظامی نے بھیک مانگتے، ٹھیلے لگاتے، بھٹیاں ہکاتے ہوئے دیکھا تھا۔ شاید انھی کے بھوت ان تاریخی عمارتوں کی شکستگی میں کہیں مقید ہو گئے ہیں۔ ہمارے گائیڈ نے خصوصاً تاکید کی تھی کہ ہمیں اپنی پاکستانی شناخت کو چھپانا ہے۔ اگرچہ فتح پور سیکری کا قصبہ آگرہ سے تقریباً بیس پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے لیکن آگرہ کی میونسپلٹی میں شامل نہیں ہے۔ اس لیے ہمارے پاسپورٹس پر اِس شہر کی سٹمپ موجود نہیں تھی لیکن پرانے برگد تلے بیٹھے سفید ٹوپی اور کُرتے پائجاموں میں ملبوس ان مسلمانوں نے دُور سے ہی خوشی کے نعرے بلند کیے۔

''آیئے آیئے پاکستان سے آئے ہیں خوش آمدید۔''

جیسے کہتے ہوں ہم تو آپ کی آمد کے منتظر نجانے کتنی صدیوں سے اس آسیب زدہ قلعے میں چشم براہ بیٹھے ہیں۔ اُنھی میں سے ایک صاحب ہمارے ساتھ گائیڈ کے طور پر چل پڑے۔ اس دارالخلافے کی بیشتر عمارتیں تو منہدم ہو چکی ہیں لیکن فصیلِ شہر بعد زمانہ کی دست برد کے سامنے ابھی ڈٹی کھڑی ہے۔ جس شہر کی حصار تھی وہ تو کب کا مٹ چکا لیکن یہ اپنے فرائض منصبی میں ابھی بھی مستعد کھڑی ہے۔ نجانے اس بیرونی دروازے کی اُونچائی کتنی تھی لیکن اتنی ضرور تھی کہ یہاں سے ہاتھی ہودوں سمیت گزرتے ہوں گے۔ ادھر دکن کی مہموں کے لیے لشکر، گھڑسواروں اور توپ خانوں کے ہمراہ روانہ ہوتے ہوں گے۔ شہزادیوں کی پالکیاں اور شہزادوں کے تخت تشریف لاتے ہوں گے لیکن ہماری چھوٹی سی ماروتی کار باہر ہی پارک ہوئی تھی جب کہ اندر میل ہا میل وسعت و کشادگی پھیلی تھی، جس میں پارک، لان گراسی پلاٹ، بوڑھے قدیمی درخت، تازہ کھلے پھول، نوخیز پودے تا حدِ نگاہ پھیلے تھے۔ بلند فصیل سے جُڑی کوٹھریاں فوجی چوکیاں رہی ہوں گی۔ شاید پورا لشکر یہیں قیام کرتا ہو گا۔ سرخ پتھر سے تعمیر کنگرے دار تاریخی فصیل کے ساتھ ساتھ آباد غریب بستی کو چھوڑ کر ہم تارکول کی کشادہ سڑکوں کی سمت نکل گئے۔ یہ سڑکیں ڈھلانی تھیں۔ شاید شاہی محل بہت اُونچائی پر بنایا گیا ہوگا۔ شاہی محل سے دارالخلافے کے دفاتر تک برق رفتار گھڑسوار پیغامات کی ترسیل انھی سڑکوں کے ذریعے کرتے ہوں گے۔ ان چڑھتی اُترتی سڑکوں پر مستعد غلام اور حسین کنیزیں چھلیں کرتے پھرتے ہوں گے۔ چھتنارے درختوں، کشادہ پارکوں اور باغوں میں کیسے معاملات، محبت وعناد، سازشیں اور منصوبے تیار ہوتے ہوں گے۔ یہ قلعہ بہت کم وقت کے لیے اکبر کا دارالخلافہ ہونے کا اعزاز حاصل کر سکا، پانی کی قلت کی وجہ سے دارالخلافہ لاہور منتقل کر دیا گیا۔ دکن کی مہموں کے دوران ۱۶۰۱ء میں اسے پھر تھوڑے عرصے کے لیے دارالخلافہ بنایا گیا۔ البتہ مغل بادشاہ محمد شاہ کے دور میں ۱۷۱۹ء سے ۱۷۴۸ء تک وہی پھر دارالخلافہ بنا، آج یہ دارالخلافہ بہت تنہا اور افسردہ تھا جیسے اپنے مکینوں کی یاد میں گم سم پچھلے پانچ سو برس تغیرات کا امین حیران و پریشان بڑے بڑے چمن زاروں اور کشادہ سڑکوں سے گزرتے ہوئے ہم اُس بس میں بیٹھے جو سیاحوں کو شاہی محل تک لے جاتی تھی۔ چاروں اطراف پھیلے سبزہ زار کہیں کہیں تاریخی عمارتوں کے خاموش آثار اکبر کے اس اُجڑے ہوئے شہر کی شام کو سوگوار بنا رہے تھے۔ دُور سے ہی قوالی کی مخصوص آوازیں اُجڑے ہوئے دارالخلافے میں زندگی کی گونج کی طرح اُبھر رہی تھیں۔ سفید سنگ ِمرمر کے اس چھوٹے سے مزار کے کشادہ صحن میں قوالوں کی جماعت اپنی بھرپور فنکاری کا مظاہرہ کر رہی تھی کیونکہ سلیم چشتی کے مزار کے تھڑے پر اُس وقت کے وزیرِ تجارت پاکستان امین فہیم اور ایک نوخیز حسین و جمیل لڑکی، غالباً سیکرٹری اور بہت سے دیگر ملازموں کے ہمراہ تشریف رکھتے تھے۔ اکبر کی سلیم چشتی سے عقیدت و محبت کی انتہا کہ اس کوچہ تصوف میں اپنا دارالحکومت قائم کر دیا۔ آج یہ شکستہ دارالحکومت تو ویران پڑا تھا لیکن کوچہ تصوف آج بھی زائرین سے بھرا تھا۔ پھول اور عقیدت بھری چادریں چڑھانے والوں کی کمی نہ تھی۔ عجب ماجرۂ عشق و عقیدت ہے یہ بھی، یہاں سے کوئی ایک کلومیٹر کی دُوری پر شاہی ایوان سنسان کھڑے ہیں۔ بہترین ترتیب اور نظم و نسق کے ساتھ یہاں کئی شاہی عمارتیں تعمیر کی گئی تھیں یہ انتہائی ویل پلینڈ شہر بنایا گیا تھا، یہیں اکبر کے نورتنوں کا ظہور بھی ہوا، یہیں ایرانی اسلامی طرزِ تعمیر میں مقامی اور ہندومت کے مظاہر کو بھی ہم آمیز کیا گیا۔ آگرہ کے قریب لال پتھر کے ذخائر موجود تھے۔ سو تمام عمارتیں اسی پتھر سے انڈین اور ایرانی طرزِ تعمیر کا نمونہ بنائی گئیں۔ شاہی محلات کئی ایوانوں پر مشتمل تھے، خیموں کا اسٹائل اسلامی طرزِ تعمیر کی یادگار ہے۔

ٹھہرے ہوئے پانی کے تالابوں پر تعمیر ایوانوں پر شام کے ڈھلتے سائے طلسم بن کر چھا رہے تھے۔ شاید یہ ایوانِ عام ہو جس کے مضبوط ستون پانیوں میں کھڑے تھے اور اُن کے اُوپر بے شمار دروں، زینوں، برآمدوں، غلام گردشوں، جالیوں، ستونوں، کشادہ محل کھڑا تھا، پھر اُس کے اُوپر شاندار تعمیر، پھر اُس کے اُوپر اس طرح کہ ہر ایک ایوان کے سامنے کشادہ صحن موجود رہتا، یوں ہر منزل دوسری سے بہت پیچھے ہٹتی چلی جاتی۔ ہر منزل پر اِکا دُکا سیاح گھوم رہے تھے۔ محل کے سرخ پتھروں پر ڈوبتے سورج کی شفق، اساطیر کے پرانے کھلے ورقوں میں آگ دہکا رہی تھی، جیسے یہ محل کے ایوان نہ ہوں کسی مصور کی تخلیق کو سرخ رنگوں نے سینچ دیا ہو۔ اسی ایوان میں خیموں کی عکاسی کا عنصر شامل ہے۔ جو گردشی نہر کے گرد تعمیر یہ ایوان کسی سوگوار نظم کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ کسی افسردہ دیوی کی طرح کسی خاموش مُغنیہ کی طرح۔ کسی اُداس سُر کی طرح، سورج ڈوب رہا تھا۔ تالابوں میں ٹھہرے کاہی زدہ سبز پانیوں میں سرخ پتھر کا عکس آگ دہکا رہا تھا۔

مختلف ایوانوں میں کتنی فن کاریاں، باریکیاں، نزاکتیں اور نفاستیں پتھروں کی نازک کٹائی، جالی ورک، گولائیاں اور چھدائیاں اتنی فن کاری اور خوبصورتی کہ لال قلعہ دِلّی مجھے تو اس کے مقابل بہت کم لگا اور لاہور کا شاہی قلعہ تو بس ایک قدیم تاریخی عمارت تخیل دھوکہ کھاتا تھا کہ قلعہ میں باقی بچ رہے یہ شاہی ایوان کیا حقیقی محلات ہیں یا مصورانہ تخیلات، سرخ پتھروں کا عجب آرٹ، جو اکبرِ اعظم کے گنگا جمنی عقائد کا عکاس ہے۔

دیوی دیوتاؤں کی شبہیوں سے مزین ایک عالی شان مندر بھی جو جودھا بائی کے لیے تعمیر ہوا تھا، جودھا بائی کا رہائشی محل بھی یہیں تھا جس کی طرزِ تعمیر میں سرخ پتھر کی عجب ماہرانہ کٹائی سے جھالریں، کنگرے، قوسیں اور Corves بنے تھے، یہاں تہاں کئی ایوان، لیکن تالابوں کے کناروں کھڑے محلات جن کے درمیان بنے تخت کو رواں پانیوں کے اُوپر سے گزرتی کشادہ سڑکیں مختلف ایوانوں سے ملاتی تھیں۔ یہاں شہزادیاں دبیز غالیچوں پر گاؤ تکیے لگا کے بیٹھتی ہوں گی اور نیچے بہتے حوضوں اور نہروں میں شنگرفی بجرے رواں رہتے ہوں گے۔ روشوں پر سے حسین کنیزیں کامدانی پشوازیں لہراتی کورنش بجالاتی ہوں گی۔ عجب منظر ہوگا۔ پُرشکوہ حسن، پُرجلال اقتدار، سب فنا، معدوم، قوالی کی صدا مزید تیز ہو گئی تھی۔ سبز پانیوں میں سُرمئی اندھیرا گھل رہا تھا۔ سُرخ پتھروں

سے تراشیدہ فن پارے، ماضی کی یاد میں عنابی اُداس چہرے لیے یہ محلات بالکل خالی اور تنہا کھڑے تھے، عجب سوگوار اور پُر وقار حسن، کیا روئے زمین پر کوئی چیز ان سے بھی خوبصورت ہوسکتی ہے۔

ارے تاج نہیں دیکھا آپ نے۔

عقب سے سفید ٹوپی اور کرتے پائجامے میں ملبوس گائیڈ سُرخ پتھروں کی شفق میں بھڑک اُٹھا۔

''نہیں ابھی نہیں۔''

''واہ کیسے صبر کیے بیٹھے ہو۔ تاج دیکھو گے تو باقی سب بھول جاؤ گے۔''

تاج محل برِعظیم کے ہر باشعور شخص کی فنٹسی جس سے وابستہ متھ نے دُور اُفتادہ اُس پسماندہ گاؤں میں بستے میرے بچپن پر بھی اپنے پروں کے سائے پھیلائے رکھے اور اب یہاں ہر ایک روک روک پوچھتا تھا۔

''تاج دیکھا۔''

شاپنگ کرتے ہوئے آگرہ کے بھیڑ بھرے بازاروں میں بھی، ہماری پاکستانی شناخت عیاں ہو جاتی اور ہر دُکان دار ایک ہی سوال بن کر سامنے کھڑا ہو جاتا۔

''تاج دیکھا۔''

جس رکشہ ڈرائیور نے ہمیں گرینڈ ہوٹل سے کانفرنس کے اختتام پر اُٹھایا۔ وہ مسلمان تھا۔ لگتا تھا، یہاں سفید ٹوپی پہن کر مسلمان اپنی شناخت کروانے کے درپے ہیں۔ اُس آٹو ڈرائیور نے ہمیں پاکستانی جان کر ہمارے اسلامی جذبات خوب مشتعل کیے۔

''ایک پاکستان تو وہ ہے جہاں سے آپ آئے ہیں اور ایک چھوٹا پاکستان یہاں آگرہ کے قلب میں واقع ہے، جہاں پاکستان کے یومِ آزادی پر جھنڈا لہرایا جاتا ہے کسی شیوسینا کی کسی اکالی دل کی جرأت نہیں کہ اس چھوٹے پاکستان کی حدود میں دخل اندازی کرے۔''

ہمیں معلوم تھا کہ وہ ہمارے جذبات کو کیوں بھڑکا رہا ہے، لیکن ہم میں سے کوئی بھی اُسے ٹپ دینے کے موڈ میں نہ تھا لیکن یہاں مسلمانوں کی مجموعی حالت انتہائی دگرگوں ہے۔ غربت، گندگی، جہالت ان چھوٹے پاکستانوں کا عمومی چہرہ ہے۔ ایسے ہی ایک چھوٹے پاکستان کی ایک تنگ و تاریک دکان کے سامنے اُس نے ہمیں جا اُتارا، اور اپنے بھائی بند کو آواز لگائی۔

''میم لوگ پاکستان سے آئے ہیں۔ کیلے کے چھلکے کی اچھی اچھی ساڑھیاں انھیں دکھاؤ۔'' وہ مصر تھا کہ ہم آگرہ کا یہ نایاب تحفہ ضرور خریدیں لیکن ہم کیلے کے چھلکے سے بنی ان اکڑی ہوئی گاڑھے رنگوں کی ساڑھیوں کو خریدنے میں کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے، پھر اُس نے آگرہ کا پسندیدہ سوال کیا۔

''تاج دیکھ آئے۔''

''نہیں ابھی نہیں۔''

''ارے نہیں دیکھا تو پہلے وہیں چلیے۔''

لگتا تھا جیسے سبھی کو ہمارے تاج نہ دیکھنے سے ڈپریشن لاحق ہو رہا ہے۔ ہم پچھلے پانچ دن سے آگرہ میں مقیم تھے لیکن تاج کے دیدار سے محروم تھے تو تعزیرات جمالیات کی رُو سے سنگین جرم کے مرتکب ٹھہرے تھے۔ اب تو تاج سے چڑ سی ہونے لگی تھی۔ جوابی وار کیا۔

''تاج سے بھی زیادہ خوبصورت چیز دیکھی ہے ہم نے۔''

سفید اسلامی ٹوپی کے نیچے لال لال آنکھیں پھٹ گئیں۔

''بھئی اس دُنیا میں تو تاج سے خوبصورت دوسری کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔''

''ہے نا فتح پور سیکری کا قلعہ۔''

''ارے وہ! ہندوانہ کلچر کی یادگار، جودھا بائی کا خوشامدی شہکار، اکبر کے دینِ الٰہی کی تعبیر۔''

وہ ہماری نالائقی پر اسلامی ٹوپی کے اندر اندر مسکرایا۔

''لیکن کاری گری تو دیکھو، پُرکاری اور فنکارانہ عظمت تو دیکھو۔۔۔''

اُس نے سامنے گاڑی میں ٹھکتے ٹھکتے زور سے بریک لگایا۔

''اُس کے بنانے والے تو انجینئرز ہوں گے نا، لیکن تاج محل تو کسی شاعر کا تخیل ہے کسی مصور کی تخلیق ہے کسی سنگ تراش کا الوہی مجسمہ ہے واہ! آپا آپ دیکھیئے تو سہی سب بھول جائیں گی، تاج عجب تعویذ ہے جس کسی کی آنکھوں سے مس ہوتا ہے تو باقی سب نظارے دُھندلا جاتے ہیں۔''

''ارے یہی تو۔۔۔ اس سے وابستہ رومانی داستانوں نے ہی تو اسے یوں بڑھا چڑھا کر پیش کر رکھا ہے کہ باقی سب کو کیموفلاج کر گیا ہے۔ دیکھیے اُن دیکھے اس عشق کی یادگار پر سب عاشق ہیں، ہم برصغیر کے باسی جس پتھر کو چاہیں خدا بنا لیں اور پھر اُس کی پرستش کے لیے جتنے چاہیں پجاری اکٹھا کر لیں۔ ہمارے عقائد جس قدر سخت ہیں۔ اُتنے ہی لچکیلے بھی۔''

اب تو اندر ہی اندر تاج سے مخالفانہ جذبات اُبھرنے لگے تھے جس نے فتح پور سیکری کے لامثال سوگوار حسن کو بھی کیموفلاج کر لیا تھا۔ ان آگرہ والوں کی گفتگو کا سوتا تو جیسے آگرہ کے منبع سے ہی پھوٹتا ہے، جس سے ملو ایک ہی سوال:

''تاج دیکھا، ارے ابھی تک نہیں دیکھا تو پھر کیا دیکھا۔''

سارک رائٹرز کانفرنس میں شرکت کی دعوت جب ملی تھی تو سب سے پہلا ردِعمل یہی تھا۔ نہیں فراغت نہیں ہے جانے کی، لیکن اس دعوت میں ایسا لاسہ چھپا رکھا تھا، کہ بال و پر پھڑ پھڑانے کی جرأت نہ ہو پائی تھی۔ اس بار یہ کانفرنس آگرہ میں منعقد ہونا تھی، جہاں کہیں تاج محل بستا ہے۔

کانفرنس کے اختتامی سیشن کے بعد معلوم ہوا کہ کل کا دن ہماری

زندگیوں میں بہت اہمیت اختیار کر جانے والا ہے کیونکہ ہم تاج محل کی سیر کو جا رہے ہیں۔

انتہائی گنجان آباد کوڑے کرکٹ اور مکھیوں سے بھری ٹوٹی پھوٹی سڑکوں والے علاقوں سے گزرنے کے بعد ہم ایک وسیع وعریض پارکنگ میں جا کر بسوں سے اُترے۔ یہاں سے بگھیوں پر سوار ہو کر لوگ کہیں کو جا رہے تھے۔ ہم سمجھے تاج محل کو یہ بگھیاں جاتی ہوں گی۔ اس شاہی یادگار تک شاہی سواروں کو ہی جانے کی اجازت ہو گی۔ یہ دھواں چھوڑتی پٹرول پیتی، شور مچاتی مشینیں تو شاہی جوڑے کی نیند میں مخل ہوتی ہوں گی لیکن جب بگھیوں سے اُترے تو معلوم ہوا کہ سامنے جو بلڈنگ موجود ہے۔ یہ تاج کو لپیٹے ہوئے نہیں ہے بلکہ تاج محل کو جانے والے وزٹرز کے پاسپورٹس اور دیگر شناختیں یہاں چیک کی جاتی ہیں اور جو شک و شبے سے بالاتر قرار پاتا ہے۔ اُسی کو تاج کی زیارت کا پروانہ جاری ہوتا ہے۔ بنگلہ دیش، بھوٹان، نیپال، مالدیپ، حدا فغانی بھی کلیئر ہو گئے لیکن سدا سدا کے مشکوک لوگ پاکستانی روک لیے گئے لیکن جانا تو سبھی کو اکٹھے ہی تھا۔ اس لیے کلیئر ہو چکے بھی وہیں رُک گئے۔

یہاں ایک ہجوم تھا جو کاغذات کلیئر کروا کر لمبی لمبی ٹرامز میں سوار فتح مندی کے پھریرے لہراتے ہوئے ہماری نگاہوں کے سامنے تاج کو جاتا تھا۔ ایک ہم تھے کہ عمارت کے سامنے بچھی فٹ پاتھوں پر اُداس اور ناکام بیٹھے تھے۔ تبھی ایک نوعمر لڑکا گھوڑے کے ماسک پر سوار کرتب دکھاتا اِدھر آ نکلا جس کا ساتھ ایک ڈھولچی دے رہا تھا۔ افغانیوں نے اس ڈھول کو اپنے قبضے میں لیا اور خٹک ڈانس کی بیٹ پر پورا افغانی گروپ رقص کرنے لگا۔ بس پھر کیا تھا پاکستانی دھمال پارٹی کو تو یوں لگا جیسے یہاں تاج محل کے شہر آگرہ میں اُن سے دوبارہ کشمیر چھن گیا ہو۔ وہ بس میں سے اپنا ذاتی ڈھول اُتار لائے اور اب جو بھنگڑے کی تھاپ بجی ہے تو دھمک دُور تک گئی۔ سیکڑوں ہزاروں کا مجمع پل بھر میں گرد جمع ہو گیا۔

عجب سماں بندھ چکا تھا۔ وہاں موجود بیشتر سیاح اپنے پاسپورٹس اور دیگر شناختی دستاویزات چیک کروانے کا عمل اِلتوا میں چھوڑ کر اس بھنگڑا ناچ میں شریک ہو چکے تھے۔ نیپال، بھوٹان، مالدیپ کی رائٹرز لڑکیاں جین شرٹس میں ملبوس، ساڑھی بندی والیاں چوڑی دار پائجاموں اور گھیر دار فراکوں والیاں ہم پاکستانی خواتین بھی ایک طرف دُبکی کھڑی تھیں۔ نیلی پیلی پگڑیوں والے سکھ، گھیر دار شلواروں والے افغانی، نیلی آنکھوں والے گورے اور گوریاں ایک انٹرنیشنل رقص کا نمونہ پیش کیا جا رہا تھا۔ رقاصوں کا دائرہ وسیع ہو رہا تھا۔ تالیاں بجانے والوں کی دیواریں کنکریٹ ہو چلی تھیں۔ نئے آنے والے ڈھول کی بیٹ سے بندھے انسانی دیواروں کے روزنوں سے جھانکتے اور بے اختیار رقص کے دائرے میں شامل ہو جاتے تو کچھ تالیاں بجانے والوں میں۔۔۔ بھنگڑا تھاپ نے ایک خود فراموشی کا ماحول طاری کر رکھا تھا۔ ہر سرگرمی تھم گئی تھی جاری کام اِلتوا میں چلا گیا تھا۔ بس ایک ہی ضروری کام بچا تھا۔ بھنگڑا، بھنگڑا، جھومر، گھومر، بے پناہ خوشی اور بے قابو جذبات کا بے اختیار اظہار بھنگڑا، جس کی نزاکتوں کو سیکھنے کے لیے برسوں کی ریاضتوں اور پیشہ ور اُستادوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بس اندر سے، دِل سے، رُوح سے کوئی الوہی سا جذبہ پھوٹتا ہے اور ہاتھ اور پیر دیوانہ وار ڈھول کی مخصوص بیٹ کا ساتھ دینے لگتے ہیں۔ مغلوں کی پہلی راج دھانی اُتر پردیش کے اس تاریخی شہر آگرہ میں پنجاب کے شوخ رنگ بکھرے تھے اور مادھو لال کے دربار کے دھمالی اپنے لمبے چمکدار پٹوں اور پھرتیلے جسموں کے ساتھ مرکزِ نگاہ تھے۔ گزشتہ شب سارک ممالک کے ثقافتی شو میں وہ صوفیانہ دھمال سے سبھی ثقافتی طائفوں کو پچھاڑ چکے تھے اس وقت بھی تماشائی تاج محل کی زیارت کے بے تابانہ دباؤ سے کسی حد تک باہر نکل آئے تھے۔

تبھی نور سجاد ظہیر سراسیمہ سی چلی آئی تھیں۔ رائٹرز فیسٹیول میں وہ کوچیئر پرسن تھیں، وہ پاکستانیوں کے پاسپورٹس اُٹھالائی تھیں اور تیر کی تیزی سے عمارت کے اندر چلی گئی تھیں۔ اب انتظار کی کوفت شروع ہو گئی تھی اِدھر اُدھر تانک جھانک، شاید کہیں سے تاج محل کی کوئی کترن کوئی جھلک پڑ جائے پارکنگ سے بگھیوں میں سوار ہو کر یہاں پہنچنے اور اس آفس کے اِرد گرد پچھلے ڈھائی تین گھنٹے گزارنے کے دوران ایک ہی سوال حیران کیے جاتا تھا۔ تاج محل ہے کہاں؟ کہاں چھپا رکھا ہے، اس تاج محل کو کہانیوں، روائتوں، شاعروں، مصوروں، سنگ تراشوں کے متخیّلہ کی مہمیز کو ہم میں سے ہر کسی کے بچپن کی طلسم نگری، نوعمری کا خواب نگر، پختہ عمری کا حیرت کدہ، تاج محل نظاروں کی پہلی چاہت، محلات کا تاج۔۔۔ تاج محل جس کی تعمیر، ڈیزائن، اخراجات، عرصۂ تعمیر، کاریگروں کی مہارت اور فن کاری، اتنی حیرت ناکیاں، متھ اور فنتسی ہمارے گوہرِ نایاب کو حافظوں کا سرمایہ تھی اور وہ سبھی احساسات جو حصول سے بالاتر چیزوں سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ آج ہم اس سب کا نظارہ کرنے والے تھے۔ اس احساس کا دباؤ ہی بدن میں سنسنی پیدا کرتا تھا اور متخیّلہ کو ایک مرکز پر لا کر جھنجھوڑ ڈالتا تھا۔ تاج محل محلوں کا تاج جسے ۱۹۸۳ء میں یونیسکو نے عجائبات زمانہ میں شامل کر لیا ہے، جس کی تعمیر ۱۶۳۲ء میں شروع ہوئی اور ۱۶۵۳ء میں مکمل ہوئی اور جس کے کاریگروں کی محنت یوں تمام ہوئی کہ اس کے بعد ان کی ہمتیں جواب دے گئیں۔ اسی لیے اس جیسا معجزہ دوبارہ ظہور پذیر نہ ہو سکا۔ اتنا سرمایہ صرف ہوا کہ مغلیہ خزانے خالی ہو گئے۔ ممتاز محل کی محبت نے جسے یوں سیراب کیا کہ لازوال بنا دیا۔ گوہر بیگم ایرانی شہزادی جو چودھویں بچے کی پیدائش کے دوران مر گئی تو شاہ جہاں دو مہینے تک اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلا اور جب اس حزن گاہ سے باہر آیا تو سر کے تمام بال سفید ہو چکے تھے، پھر اُس نے اپنی محبت کی اس انتہا کو رہتی دُنیا تک زمین کے سینے پر نقش کرنے کا فیصلہ کیا اور محبت کے غیر مرئی احساس کو مجسم شکل میں منتقل کر دیا۔ تاج محل بارگاہِ محبت، تاجوں کا تاج جس پر شاعروں نے شعر کہے انشاء پردازوں نے نثر پارے تخلیق کیے۔ مصوروں نے مرقع کھینچے، سنگ تراشوں نے مجسّمے تراشے، ہر پریمی نے اپنی پریمیکا کو تحفے میں اس ماڈل کو پیش کیا۔

گھروں میں اس کی شبیہ سجائی گئی، قالینوں، کپڑوں، برتنوں پر اس کا ڈیزائن کندہ کیا گیا، اس کی نقل میں عمارتیں تعمیر ہوئیں، محبوباؤں نے، بیویوں نے طعنہ دیا۔

''تم کونسا میرے لیے تاج محل بنالو گے۔''

تو ساحرلدھیانوی پکار اُٹھا۔

اِک شہنشاہ نے بنوا کے حسیں تاج محل
ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق

قصہ گوؤں نے کہا۔ تاج کو آپ دیکھیں گے، تو اُسے دل میں بسا کر ساتھ لے جائیں گے۔ تاج محل کو دیکھنا کوئی معمولی نظارہ نہیں ہے۔ وہ خوش قسمت اور مقدر کا دھنی ہے، جس کی نظریں اس عظیم نظارے سے ہم کنار ہوتی ہیں اور آج ہم یہ غیر معمولی نظارہ کرنے جارہے تھے۔ آج ہم بھی مقدر کے دھنی کہلانے والے تھے۔ آج ہماری نظریں اس عظیم نظارے سے گراں بار ہونے کو تھیں۔ نور سجادظہیر معاملات طے کرکے اس وسیع عمارت سے باہر نکل رہی تھیں۔

اب ہمیں اُن ٹرامز پر سوار ہونا تھا، جو ہماری نظروں کے سامنے پچھلے تین گھنٹے سے فاتحین کی شاہانہ سواریوں کی طرح رُخصت ہورہی تھیں۔ بگھیوں پر سوار ہوکر اِدھر اُدھر تاج کی متلاشی نگاہیں بھٹکتی رہی تھیں، شاید کہیں تاج کا کوئی ذرّہ کوئی کونا نگاہ کی حد کو چھوجائے، اور اب یہاں ٹرامز پر سوار متجسس نظروں سے تاج محل کو سب ڈھونڈتے تھے لیکن وہ تو محلوں کا تاج ہے۔ تاجوں کا تاج ہے۔ یوں آسانی سے نظر کے تیر کا شکار تھوڑی ہوگا۔

ٹرام نے جہاں اُتارا وہاں سڑک کے اطراف بنی دُکانوں میں نوادرات بھرے تھے۔ خواتین دُکانوں میں گھس گئیں۔ اللہ! تاج کے راستے میں کیسی کیسی رکاوٹیں حائل کررکھی ہیں، ان ترغیبات سے دامن چھڑا کر کئی داخلی دروازوں والے واک تھرو گیٹ کی سمت بڑھے، چیکنگ کے مراحل سے گزرنے کے بعد نگاہیں پھر متلاشی ہوئیں۔ اب تو تاج نظر آنے کو ہی ہے یہیں کہیں اِردگرد ہمارے آس پاس ہم کتنا اہم اور خاص محسوس کررہے تھے خود کو لیکن ابھی عشق کے امتحان اور بھی تھے۔ دائیں ہاتھ پردے لگا کر چھوٹے چھوٹے کیبن بنائے گئے تھے جہاں خواتین گارڈز نے بھرپور تلاشی لی، جسموں کی، کپڑوں کی، پرسوں کی، ان تمام مراحل سے گزارا گیا جن سے گزرتے ہوئے ایئرپورٹس پر بدمزہ اور زِچ ہوجاتے ہیں لیکن تاج کی کشش کہ یہ درگت بھی بُری نہ لگی۔ طویل لائنوں میں لگنے اور تلاشی کے مراحل سے گزرنے کے بعد جب باہر نکلے تو سامنے مغلیہ طرز کا وسیع وعریض باغ تھا، جس میں داہنے ہاتھ سُرخ پتھروں سے بنا روشن چراغ سا بلندوبالا بیرونی دروازہ کھڑا تھا۔ پورا گروپ بے تابانہ اُسی سمت بڑھا یقیناً تاج اسی کے اندر کہیں چھپا تھا لیکن پھر روک دیا گیا۔ معلوم ہوا ٹکٹ چیک کیے جارہے ہیں۔

آخر تاج محل کو اتنا چھپا کر کیوں رکھا جاتا ہے؟ بتایا گیا کہ بابری مسجد کی شہادت کے بعد تاج محل کو انتہا پسندوں کی جانب سے خطرہ لاحق ہے۔ معبد گاہوں سے مخاصمت تو مذاہب کی تقابلی ضرورت ٹھہری لیکن محبت گاہوں سے دُشمنی کن نفرتوں کی زائیدہ ہے۔ گروپ کے اراکین وہیں تراشیدہ باڑوں، پھولوں کی کیاریوں اور مغلیہ طرز کی روشوں کے جلو میں تصویریں بنانے لگے کہ آخر تو یہی باغ ہے جو تاج محل کو سمیٹے ہوئے تھا۔ اسی کی آغوش میں کہیں تاج چھپا تھا۔ آخرکار حکم ہوا کوچ کرو، پورا گروپ لال پتھروں سے تعمیر، بغلی چوبرجیوں والے بلندوبالا گیٹ کی سمت رواں ہوا، اور داخل ہوتے ہی پتھر ہوگیا۔ تاج یکبارگی پورے کا پورا ہماری بصارتوں میں گھسا چلا آیا تھا۔ کوئی جگ مگ ہیرا جیسے بہترین تراشوں والا دودھیا موتی شعاعیں چھوڑتا ہوا۔ ستمبر کی تیز دھوپ میں نہایا ہوا چاندی کا بجرا، اتنا شفاف، اس قدر نیا، اتنا تروتازہ، اتنا قریب، اس قدر مکمل اور شگفتہ آنکھ کے گل دان میں کھلتا ہوا شاداب کنول، ادھ کھلی نازک پنکھڑیوں پہ دھرا ہوا پورا چاند، آنکھ کے تل میں سماتا ہوا جہانِ حسن آبِ شبنم سے بھری سفید گلاب کی کٹوری جیسے، شفاف چھلکتا ہوا کرسٹل کا جام، دم سادھے، سانس روکے ساری حسیات بصارتوں میں تبدیل ہوگئیں۔ کیا آنکھ کی اس ذرا سی تپلی میں اتنی کشادگی اتنی تابنا کی سہارنے کی اہلیت بھی کہیں چھپی تھی؟ آنکھ سمندر میں یہ براق بجرا ہلکورے کھاتا ہوا۔۔۔

تاج محل مغلیہ طرزِ تعمیر کے بہت نظارے کیے اس نور کی چٹکی نے، لال قلعہ، جامع مسجد، قطب مینار، ہمایوں کا مقبرہ اور بہت کچھ لیکن جستہ جستہ سلسلہ بہ سلسلہ، آگے پیچھے، دائیں بائیں پھیلے ہوئے مناظر آنکھیں پھٹی بھی، حیران بھی ہوئیں لیکن ذرّہ ذرّہ، بتدریج آہستہ آہستہ ایسا تو کبھی نہ ہوا کہ مجسم حُسنِ، مجسم حیرت، مجسم طلسم، مجسم سحر، مجسم چاند، مجسم سورج، ایک ہی نظارے میں سب ہم آمیز گھسے چلے آئیں۔

ایک مکمل جہان، ایک بھرپور تکمیل، سنگِ مرمر سے تراشا ہوا یہ شاداب پھول آنکھ کے گل دان میں یوں آن کھلا تھا جیسے یہ اُسی کے ناپ کا قالب ہو گیا یہ تاج ہر ایک کے ساتھ ایسا ہی کرتا ہے، جیسے ہی آپ بیرونی دروازے میں داخل ہوتے ہیں تاج فضاؤں میں تیرتا ہوا آپ کی نگاہوں میں لبالب جست بھر کر سما جاتا ہے۔ وہاں کے قصہ گو کہتے ہیں ''آپ تاج کو اپنے دل میں سما کر اپنی آنکھوں میں بسا کر لے جائیں گے اور پھر عمر بھر اسے خود سے الگ نہ کر پائیں گے۔

اب ہم تاج کی سمت بڑھے تو تاج پیچھے ہٹنے لگا۔ وہ جو ہاتھ بھر کی دُوری پر دکھائی دیتا تھا۔ وہ بہت دُور ہوگیا۔ ہم بڑھ رہے تھے تاج ہٹ رہا تھا۔ سُرخ پتھر کی روشوں کے دونوں اطراف تراشیدہ باڑیں اُن سے پرے کھلے ہوئے چمن زار دونوں روشوں کے درمیان شفاف پانیوں سے بھری کشادہ نہر فواروں سے چھلکتی۔ تو ہم آگے بڑھ رہے تھے۔ تاج پیچھے ہٹ رہا تھا۔ سب سے پہلے ہمیں اُس چاندی سے چبوترے نے روکا، جو ایک کشادہ حوض کو اپنی آغوش میں سمیٹے ہوئے تھا۔ سفید بُراق سنگِ مرمر کے اس تخت پر بے داغ سفید پتھروں سے بنچ بنے تھے جو دھوپ میں قلعی شدہ ظروفوں کی مانند جگ مگ تھے، جن پر بیٹھ کر جوڑے تصویریں بنوا رہے تھے۔ فوٹو گرافر گلوں میں کیمرے لٹکائے گھومتے تھے۔ قصہ گو تاج کی رومانی داستان سناتے تھے۔ سفید سنگِ مرمر کے یہ دو تخت جس حوض کو گھیرے ہوئے تھے اس کے دائیں بائیں نہریں نکلتی تھیں، یہاں کا سارا منظر جنت

ِسماوی کے قرآنی تصوّر کو پیش کرتا ہے۔حوضِ کوثر سے نکلتی تسنیم اور سلسبیل یہاں سورہ فجر کی یہ آیت کندہ ہے: ''وَادخُلنی جَنّتی ''جس کا ترجمہ ہے(اور داخل ہو جا میری جنت میں) اور ہم جنت میں داخل ہو رہے تھے۔ یہ جنتِ ارضی زمین سے بہت اُوپر کہیں بلندیوں میں لیے جاتی تھی۔عجب احساس تھا جیسے خدا کی صناعی کا یہ ٹکڑا ابھی تازہ تازہ زمین سے پھوٹا ہو کہ عرشوں سے اُتارا گیا ہو۔شاید یہ اس آیت ِقرآنی کے تعویذ کی برکت تھی کہ داخل ہونے والے اُنھی حیرتوں اور احترا موں سے آگے بڑھ رہے تھے کہ وہ جنت میں تشریف لاتے ہوں۔شاہ جہان اور ممتاز محل کی محبتوں کی لامثال جنتِ ارضی اس چبوترے پر جنتیوں کی بھیڑ تھی۔ان سب کو جنت میں داخلے کے پروانے مِل چکے تھے۔ یہاں سے تاج کا نظارہ بدل گیا تھا۔اب تاج محل بہت بلند کہیں فضاؤں میں اُستوار نظر آتا تھا جیسے پنکھ پھیلائے راج ہنس کو کہا جاتا ہے۔تاج اپنے رنگ اور موڈ بدلتا رہتا ہے۔دِن کے مختلف اوقات میں، بدلتے موسموں میں دن رات میں شاید اس لیے کہ یہاں ایسی آیات کندہ ہیں جن میں وقت کے بدلتے مزاجوں کی خدا تعالیٰ نے خود قسم کھائی ہے۔مختلف اوقات میں مختلف رنگ کبھی دودھیا، سپیدۂ سحر سا، کبھی زرد دو پہری سورج سا۔کبھی دُھند میں لپٹا ڈھلتی شام سا شاید سورہ فجر، الشّمس جیسی آیات کی تاثیر ہے یہ تاج محل کا کنواں براق سفید ہے لیکن اِردگرد پھیلے مناظر اُسے کئی رنگوں میں لپیٹے ہوئے ہیں۔ پھولوں کے شوخ رنگ حوضِ کوثر سے نکلتی سلسبیل اور تسنیم کے سبز نیلے موتیا رنگ کہتے ہیں بارش میں بھیگے تاج کی چھب نرالی ہے جب وہ قوسِ قزح کے رنگوں میں رنگ جاتا ہے۔ ابھی تاج اپنی دُودھیا چھب سے سورج کے سنہرے میں نہا گیا تھا، جیسے چاندی پر سونے کا پانی چڑھا ہوا، شاید اب یہ سورہ الشّمس کا معجزہ تھا۔والشّمس والضحیٰ یعنی ''قسم ہے سورج کی اور اس کی دھوپ کی'' اور یہاں یہ قسم مجسم ہو رہی تھی۔ پورا تاج سورج اور اس کی دھوپ میں جگمگا رہا تھا۔ہمیں قصہ گوؤں اور فوٹو گرافروں نے گھیر رکھا تھا۔ تاج کا سیراب کھینچتا تھا، یہاں پھر دو روشوں کے درمیان بہتی شفاف پانی کی نہر تاج تک چلتی ہے، جس میں تاج کا عکس جھلملاتا ہے۔ آسمانی رنگ ٹائلز والے شفاف پانیوں میں تاج کا منظر، تسنیم و سلسبیل کی آغوش میں اُترتا ہوا تاج جیسے آئینے میں اپنا عکس دیکھتا ہو اور خود ہی حیران ہوتا ہو۔''اللہ رے میں'' شاید یہ سورۃ الضحیٰ کی کرامت ہو، جس کی آخری آیت ہے۔''وَامّا بنعمته ربک فحدث'' اور جو نعمتیں ہیں تہارے رب کی ان کو خوب بیان کرتے رہنا، اور تاج محل ان نعمتوں کی مفصل تفسیر تھا۔ان آیات کو کندہ کرنے کا کیا مقصد رہا ہوگا۔شاید محبت کے اس تعویذ کی تاثیر بڑھانا مقصود ہو۔شاید بارگاہِ محبت میں داخل ہونے کے آداب سکھانا ہوں شاید اس جنتِ ارضی سے جنتِ سماویٰ کی حقیقت سمجھانا ہو۔

تو ہم بڑھ رہے تھے تاج ہٹ رہا تھا، جیسے کوئی سراب، جیسے کوئی طلسمی محل، جیسے نظر کا دھوکا، لیکن یہ حقیقت تھی، نا قابلِ یقین حقیقت کہ ہم تاج محل میں موجود تھے تاج سامنے تھا، اور ہم اپنی ننگی آنکھوں سے اسے ٹک ٹک دیکھتے تھے۔ جوتے رکھوائے اور ننگے پیر اُس وسیع و عریض صحن میں داخل ہونے کو سیڑھیاں چڑھنے لگے، جس کے چاروں کونوں میں تاج کے بیرونی مینار کھڑے ہیں۔بیسوؤں فٹ اُونچا صحن لیکن یہاں پہنچنے کو مختصر کشادگی والے یہی زینے ہیں، کہا جاتا ہے روزانہ تقریباً تین ہزار سیاح یہاں آتے ہیں۔سبھی کو جوتے اُتار کر انھی زِینوں سے اُوپر جانا ہوتا ہے کہ یہ بارگاہِ محبت ہے کہیں سوئے ادب نہ ہو جائے۔ستمبر کی دھوپ میں سفید ٹائلز تپ رہی تھیں۔ چند قدم چلنے سے پیر چھالوں سے بھر گئے۔ کاش ہمارے قدموں تلے سرخ قالین بچھے ہوتے۔کسی مُلک کے شہزادے شہزادیاں نہ سہی لیکن اس وقت تو سبھی خاص تھے کہ تقدیر نے اُنھیں تاج محل دیکھنے کے لائق بنا دیا تھا۔ جنتِ ارضی میں داخل ہونے کا اعزاز بخشا تھا۔تاج محل کے شایانِ شان پروٹوکول ملنا چاہیے تھا۔سفید بے داغ سنگِ مرمر سے آراستہ وسیع و عریض صحن کے چاروں کناروں پر ایستادہ بلند و بالا میناروں کے درمیان ممتاز محل کا مقبرہ۔۔۔جس کا داخلی دروازہ کھلا تھا اور لوگ فاتحہ خوانی کے لیے داخل ہو رہے تھے۔منتظمین یہاں زیادہ دیر کھڑا نہ رہنے دیتے تھے، دائیں ہاتھ سے چکر شروع کرو اور بائیں ہاتھ سے باہر نکل جاؤ، سنگِ مرمر کی جالی کے اندر دو قبریں ممتاز محل اور شاہ جہاں، ایک بڑی ایک نسبتاً چھوٹی قبر، ممتاز محل کی قبر پر لکھے خدا کے ننانوے نام۔جالی کے پیچھے چوگردشی کمرے ہر کمرے کے دروازے کے بالمقابل سیدھ میں پھر وہی سنگِ مرمر کی نفیس جالیاں۔ بالکل اسی طرح جیسے تاج کے بیرونی دروازے میں پورا تاج بھر آتا ہے۔ان جالیوں سے باہر کا منظر ہویدا تھا اور سورج کی روشنی اندر چھن رہی تھی۔ چھت پر مختلف رنگوں کی نقاشی ، ہلکے گہرے نیلے، بھورے، ہرے رنگ کاشی کاری، مینا کاری، شیشہ گری کے نادر نمونے دیواروں پر آیاتِ قرآنی کی خطاطی کے علاوہ نجانے کس کس فن کی باریکیاں اور نفاستیں قبروں کے عین اُوپر گنبد نما چھت اس گنبد کے کئی بیضوی ٹکڑے جن کی سڈول گولائیاں دھیمے رنگوں کی نقاشی سے نمایاں تھیں۔ درمیان میں اُبھرے ہوئے مرکز کے ساتھ فانوس جھولتا تھا۔شاید یہ بھی آثارِ قدیمہ کا حصہ ہو۔ذرّہ ذرّہ آرٹ، نفاست و کاریگری، رنگ اور فن، چپہ چپہ آراستہ اور درمیان میں یہ پریمی جوڑا سوتا تھا۔قبریں تو کہیں بہت نیچے تہ خانوں میں ہیں۔نشانیاں اُوپر دھری ہیں۔اس شاہی جوڑے کی محبت کی شاہانہ نشانی تاج محل، یہاں بھیڑ بہت تھی۔ چوگردشی کمروں میں داخل ہونے سے روکا جا رہا تھا۔جلدی جلدی باہر نکالا جا رہا تھا۔جنتِ ارضی کے ساکن تو گہری نیند سوتے تھے۔اُنھیں یہ بھیڑ بھاڑ کہاں پسند ہوگی۔ایک نے جلد ہی دُنیا سے منہ پھیر لیا اور دوسرا جو اس جنت کا معمار تھا وہ بیس برس ایک ہی نظارہ کرتا تھا۔تاج محل کا نظارہ۔

باہر نکل کر تاج کے چاروں طرف چکر لگایا۔چھونے کی ممانعت نہ تھی، یہاں اِردگرد کوئی حفاظتی باڑ نہ لگائی گئی تھی۔ اُوپر نیچے سفید سنگِ مرمر کی قوسیں جن میں نفیس جالی ورک تھا۔اُوپر وہ گنبد جس نے فنِ تعمیر کے ماہرین کو آج بھی ورطۂ حیرت میں ڈال رکھا ہے، جس کے گرد آٹھ مینار کھڑے تھے۔فن کاری کے ایسے نمونے کہ تاج محل کو عجائباتِ زمانہ میں لکھوا گئے۔ہم تاج محل کی

پچھلی طرف چلے گئے، جہاں جمنا کا کنارہ تھا اور دُور پرے آگرہ فورٹ نظر پڑتا تھا۔ یہیں کسی قفس میں یہ پریمی بادشاہ قید رہا ہوگا جس کی ایک ہی خواہش تھی کہ اُسے ایسے زندان میں رکھا جائے جس کا روزن تاج محل کی سمت کھلا ہو۔ لال پتھر سے بنا آگرہ فورٹ اکبر کا تعمیر کردہ محل ہماری نظروں میں تھا۔ اتنا دُور کہ بمشکل اُس کے خدوخال نمایاں ہو پاتے تھے۔ قیدی بادشاہ کو بھی کیا تاج یونہی دُھند میں لپٹا نظر آتا ہوگا لیکن نہیں تاج کی تو یہ عجب خوبی ہے کہ جتنا دُور ہٹو اتنا قریب، واضح اور بڑا ہوتا چلا جاتا ہے، پھر قیدی بادشاہ کی آنکھوں میں تو اس کا خواب جاگتا تھا وہ انجینئروں کے اُس گروہ کا سربراہ تھا جس نے تاج محل کو دُنیا کے نقشے پر عجوبہ بنایا وہ آنکھیں بند کرے یا کھولے تاج تو وہیں کہیں بستا ہوگا۔

بہت نیچے جمنا کنارہ، پانی اُتر چکا تھا۔ کبھی لبالب بھرا ہوتا ہوگا جس طرح تاج کے سامنے کا عکس تسنیم و سلسبیل میں جھلکتا تھا۔ بغلی منظر جمنا میں اُترتا ہوگا جہاں تاج محل کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے فنِ تعمیر کے انوکھے طریقے اپنائے گئے تھے۔ وہی جمنا جہاں سے کشتی پر رکھ کر تاج محل کے معمار کا جسدِ خاکی لایا گیا تھا اور اپنی ہی بنائی ہوئی جنت میں دفن ہوا تھا، اگر اورنگ زیب اوتا وَلا نہ ہو جاتا تو تاج کے سفید سنگِ مرمر کے بالمقابل سیاہ سنگِ مرمر سے اسی طرز کا ایک اور محل تعمیر ہونا تھا جس کا ڈھانچہ بن چکا تھا، پھر خزانہ جواب دے گیا اور شاہ جہان کا اقتدار بھی اور زنداں خانے کا روزن بیس برس تک حلقۂ چشم بنا رہا۔ درمیان میں جمنا حائل جس میں تاج بھیگتا تھا۔ عجب اُداسی کے رنگ بکھر گئے تھے۔ تاج اُداس بھی ہو جاتا ہے۔ دن ڈھل رہا تھا تاج پر اُداسی کے ملگجے رنگ چڑھ رہے تھے۔ دائیں ہاتھ سرخ پتھر سے بنا میوزیم تھا جس میں مغلیہ عہد کی تاریخی اشیاء موجود تھیں جو کہیں بھی ہو سکتی تھیں۔ لال قلعہ دلی، بادشاہی قلعہ لاہور اور کہیں بھی، لیکن تاج کہیں اور نہیں ہو سکتا۔ برصغیر میں موجود تمام تاریخی عمارتوں کے ماتھے کا جھومر، مغلیہ آرکیٹیکچر کا تاج، جس کی ایک ایک اینٹ سفید تابدار موتی سی جگمگاتی تھی۔ تاج اس تمام جزئیاتی حسن کو ایک مکمل معجزے کے اسرار میں سمو لیتا ہے۔ ہم واپس جا رہے تھے۔ تاج ہماری سمت بڑھ رہا تھا پیچھے پیچھے چلا آتا تھا۔ مڑ مڑ کر دیکھتے۔ تاج ہمارے ساتھ ساتھ تھا۔

شفاف روشوں پر سے گزرتا ہوا تاج، سلسبیل و تسنیم میں نہایا ہوا تاج، حوضِ کوثر سے اُبھرتا ہوا تاج، جس کی آرچوں کی براق جالیوں میں یادوں کے دیپ جلتے تھے۔ ہر ہر کٹ ورک میں جیسے نور کی پتلیاں رکھی ہوں جیسے آنکھوں کے پیالے وہیں حیرت سے کھلے رہ گئے ہوں۔ ہم چوبرجیوں والے عظیم الشان دروازے سے باہر نکل رہے تھے، جس کی تمام کشادگیوں اور رفعتوں میں تاج بھرا تھا، جیسے کہتا ہو کس سمت سے بچ کے نکلو گے، آنکھ کے تل میں سماتا ہوا جہانِ حسن، دل کی کٹوری میں کھلتا ہوا سنگِ مرمر کا سفید کنول، مورپنکھ پہ دھرا محبتوں کا دیپ، قصہ گو کی صدا، حوضِ کوثر سے اُبھرتی تھی۔ آپ جب یہاں سے جائیں گے تو تاج کو ہمراہ لے جائیں گے۔

''جری کہانی کار''

طاہرہ اقبال ایک ایسی جری اور جرأت مند کہانی کار ہے جس نے جاگیرداری نظام کے جبر اور جہالت پر مبنی روایتوں کے حصار میں دراڑیں پیدا کر کے پیچھے کے مناظر فوکس کیے ہیں۔ فوکس ہی نہیں، پوری جزئیات کے ساتھ ان مناظر کو اجاگر کیا ہے۔ طاہرہ اقبال کی کہانیوں کا بنیادی نکتہ عورت اور اس کی محکومیت ہے۔''

یونس جاوید

''بھرپور کہانی کار''

طاہرہ اقبال کے موضوعات کا انتخاب ان کے باشعور ہونے کی دلیل ہے۔ انہوں نے اپنی کہانیوں میں معاشرے کے کچلے ہوئے، مظلوم، بے بس اور ٹھکرائے ہوئے لوگوں کی عکاسی کی ہے اور اس میں کامیاب بھی رہی ہیں۔ خصوصاً ''مرقدِ شب''، ''تپیا'' اور ''حسن کی دیوی'' اچھی کہانیوں میں شمار کی جاتی رہیں گی۔ کچھ کہانیوں میں طاہرہ اقبال نے ''جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا'' کے مصداق اپنی اچھی خواہشات کا رنگ دے کے واقعات کا رخ بدلنے کی کوشش کی ہے اس کی مثال ان کی کہانی ''پٹھانی'' ہے۔ لیکن ان کی اس مخلصانہ کوشش کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی ایسا کرنا چاہیے۔ مجموعی طور پر طاہرہ اقبال کی کہانیاں اس بات کی شاہد ہیں کہ وہ ایک بھرپور کہانی کار کے طور پر ادب کے افق پہ جگمانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

پروین ملک

''ثقافتی نقش''

طاہرہ اقبال اپنے افسانوں کو خاص طور پر علاقائی لفظیات سے مزین کرتی ہیں جن سے ثقافتی نقش و نگار زیادہ ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ طاہرہ کے افسانوں کو 'تہذیبی معنویت' کے حامل افسانے کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ اپنے افسانوں میں موضوع سے نہیں تہذیبی پس منظر اور علاقائی لفظیات سے ندرت پیدا کرنے کا کام لیتی ہیں اور اسی تہذیبی پس منظر سے افسانے میں معنویت پیدا کرتی ہیں۔ بنیادی طور پر ان کے افسانوں کا موضوع انسان کا سماجی یا معاشی استحصال ہی ہے لیکن ہر افسانے کا ثقافتی پس منظر اور اس ثقافت کا لسانی اظہار افسانے کو نیا اور بامعنی بنا دیتا ہے۔

ایم۔ خالد فیاض

زندہ انسانوں کا عجائب گھر

طاہرہ اقبال

اخروٹ بادام، خوبانی اور آلوچے کے پیڑوں تلے کافر لڑکیوں کے پرے تھے۔ رنگ برنگ گھیر دار موتیوں جڑے فراکوں میں جیسے شوخ رنگ گلاب سجے ہوں آبشاروں کے برف چور سے دُھلے ہوئے یونانی ایرانی تیکھے نقوش جگ مگ رنگتیں جیسے عنابی آلوچوں پر سفید دُھند لپٹی ہو۔ رس بھرے عنابی گودے سے سخت بدن جیسے موتیا رنگ خوبانیوں کے گلابی شیڈ، باداموں کی ساخت اوڑھے اخروٹ کے تیل سے چمچماتی سنہری موتی چور آنکھیں۔

'' تمہارے ساتھ ایک تصویر بنوانے کے ہزاروں ڈالر ہونے چاہئیں۔''

رابرٹ نے فرزین کے گال کو شہادت کی پور اور انگوٹھے کے پیٹ میں بھر کر ہلکے سے چٹکی لی، جیسے پھول کی کٹوری کے زردانوں میں پوریں ڈوب گئیں، جیسے ریشم کے تار چھو گئے ہوں۔ گلاب کے پیالے میں بھری شعلہ رنگ حدت بھڑک گئی جیسے سنہری روپہلی تتلیوں کے پروں کی ست رنگی افشاں جھڑ گئی ہو۔ رابرٹ کا کیمرہ کھٹ کھٹ کئی رول بنا گیا۔

جھاگیں اُڑاتے نامعلوم سمتوں سے اُترتے آبشاروں، جھرنوں کے برفیلے پانیوں میں منعکس کوئی جل پری۔

ہرے، لال، پیلے موتیوں جڑاؤ گھیر دار، ہرا، لال فراک لہراتی برفیلے پانیوں کی سڑک پر بھاگتی ہوئی سنڈریلا۔ خوبانی آلوچوں کے پیڑوں پر منڈلاتی سنہری پروں والی تتلی بانس کی تیلیوں سے بنی لمبوتری ٹوکری پشت پر لگائے کھڑی کوئی دیومالائی، دیوی بادام کے سفید پھولوں کے گھر میں بسنے والی گل بکاؤلی۔

رابرٹ پروفیشنل فوٹو گرافر تھا۔ اُسے یقین تھا یہ سب تصویریں اُدھر یورپ کی آرٹ گیلریوں میں جب نمائش کے لیے پیش کی جائیں گی۔ تو کئی انٹرنیشنل جرنلز انھیں اپنے ٹائٹل کی زینت بنائیں گے۔ ایک ایک تصویر بھاری قیمت میں بک جائے گی، ڈالروں کی یہ حدت بھری چمک رابرٹ کی چندھی مندھی آنکھوں میں نشہ سا بھر جاتی۔

''پھر تم بہت پیسے والے ہو جاؤ گے کیا۔''

اُبلتے چشموں، میل ہا میل بلندیوں سے اُترتی کھنکتی آبشاروں سیاہ چٹانوں پر سے دھاڑتے چنگھاڑتے دریائے کیلاش کی فرسی جھاگ میں وہ جل مچھلی سی تیرنے لگی۔ نیچی نیچی چھتوں پر پھل سے بوجھل جھکی شاخوں سے خوبانیاں توڑتی، بلند اخروٹوں کے پیڑوں کے گھنیرے سایوں تلے دندناسہ ملتی دُنیا کے حسین ترین لینڈ اسکیپ میں سجی نفیس سجاوٹیں جڑاؤ ٹوپی کی لمبی ٹیل لہراتی پیلے باریک موتیوں کی اَن گنت لڑیاں پروئی مالاؤں سے پوری ڈھکی ہوئی لمبی گردن اتنا بوجھ یہی دھان پان سی عورتیں ہی سہار سکتی ہیں۔ کتنا وزنی، مشکل اور تکلیف دہ ہے یہ لباس لیکن انھیں اگر اس لباس سے الگ کر دیا جائے تو شاید کیلاش کی رومانویت بھی رُوٹھ جائے اور دُشوار گزار طویل مسافتیں طے کر کے آنے والے سیاحوں کی دلچسپی بھی جاتی رہے اسی لیے تو دُنیا بھر کی این جی اوز اور رفاحی ادارے یہاں ٹوٹ پڑے ہیں۔

رابرٹ جب یہاں پہنچا تھا تو برف کے شیشے سے ڈھکے بلند کُہسار اور دریاؤں، آبشاروں پر پل بنے گلیشیئرز ابھی پگھلے نہ تھے باداموں کے پیڑ سفید فرسی پھولوں سے ڈھکے تھے پوری وادی سپیدگی کی چادر اوڑھے ابھی ستاتی تھی، پھر دھوپ افشاں کترن کترن بکھرنے لگی اور چاندی کی گاگریں، پگھلتی برف کی بھر بھر کے اُنڈیلنے لگی۔ تب کتنے جھرنے، آبشار، ندی نالے بہہ نکلے۔ خوبانی اور آلوچے کے خشک پیڑ پھولوں سے بھر گئے۔ طویل برف بھرے موسموں کی ٹھٹھری ہوئی گنگ خاموشی کو توڑنے کیمرے اور دُوربین لٹکائے سیاح اس وادی میں اُترنے لگے۔

رابرٹ برمودہ پہنے جدید کیمرہ گلے سے لٹکائے دَن بھر ان وادیوں میں گھومتا، انھی کلاشیوں کے ہمراہ کھاتا پیتا، خوبانی انگور سے بنی یہاں کی مخصوص خانہ ساز شراب کا ذائقہ اُسے پسند آیا تھا جو برفیلے موسموں کے لیے ان پھلوں کی فصل پر مٹکوں بھر تیار کر کے محفوظ کر لی جاتی تھی۔ وہ پچھلے تین مہینوں سے یہاں تھا، جہاں جس سمت بھی نکلو ندی نالے ہمراہ ہو چلتے ہیں۔ آسمانوں کی بلندیوں سے اُترتے آبشار گھروں کے صحنوں میں اُبلتے چشمے، جیسے یہ وادیٔ کیلاش برفیلے پگھلتے پانیوں میں تیرتا ہوا کوئی کنول جس کی شہزادی فرزین تھی۔ رابرٹ نے شراب چھلکاتی ان آنکھوں کی کتنی تصویریں بنائی تھیں۔ آلوچوں کے رس بھرے ہونٹوں کے پیالے مقید کرنے کو کتنی میموریز خرچ کر ڈالی تھیں لیکن فرزین تھی کہ کسی صورت بھی مقید نہ ہو پاتی تھی۔ ہر لمحے ہر زاویہ اِک الگ جہانِ حسن، رابرٹ نے تازہ پھولوں سے کشید کیے شہد بھرے انگبیں لبوں کو ہلکی پور سے چھوا، پھر اپنی ہی پور چوم لی جیسے پھولوں کی مٹھاس گلاب کا قلاقند، شہد کا قوام وہ چوستا رہا۔

''دُنیا کے سارے کیمروں کی سبھی میموریز ختم ہو جائیں گی تو بھی اس حسن کا پاسنگ بھر خود میں سمو نہ پائیں گی۔''

فرزین کے گالوں پر آلوچوں کا رنگ اُتر آیا۔ وہ اُٹھ کر بھاگی چُنٹ دار فراک کا گھیر لمبی لہراتی موتیوں جڑی ٹیل، باریک مینڈھیوں گندھی سیاہ لمبی دو چوٹیاں برف کے موسموں کے لیے بنائے گئے نیچی چھت والے بند کمرے میں چھپ گئی جس کے چاروں اطراف بنے چبوترے پر بچھی میل بھری دریوں پر روئی اُگلتے کئی موسموں کے اَن دُھلے لحاف بکھرے تھے۔ درمیان میں آگ جلانے والا گڑھا ابھی بھی راکھ سے بھرا تھا۔ رابرٹ نے اس تنگ و تاریک بند کمرے میں

ڈھیروں میموریز خرچ کرڈالی۔

''ان تصویروں کے تمہیں کتنے پیسے ملیں گے۔''

فرزین نے گندم کی موٹی میٹھی روٹی کانسی کی پلیٹ میں رکھ کر چبوترے پر یوگا کا آسن لیے ہوئے رابرٹ کے سامنے بڑھائی۔ رابرٹ نے بڑے سے نوالے سے گال پھلا لیا۔ عینک کے اندر چندھی آنکھیں مندھ گئیں، وہ جانتا تھا، فرزین یہ سوال بار بار کیوں دُہراتی ہے۔ رابرٹ کہتا تھا فرزین کی ایک تصویر کے عوض پوری دُنیا کا سودا کیا جاسکتا تھا۔ تصویر کا تو وہ نہیں جانتی تھی لیکن خود اُس کا اپنا سودا چند ہزار میں ضرور ہوسکتا تھا۔ پچھلے برف کے موسم میں اُس کی ہم شکل اس سے بھی چھوٹی بہن کو ادھر چترال کا کوئی پٹھان صرف پندرہ ہزار میں خرید کر لے گیا تھا۔ جب برف سارے مواصلاتی راستے یہاں منقطع کر دیتی ہے اور خوراک نایاب اور انسان سستے ہوجاتے ہیں تب ان کیلاشی لڑکیوں کی قیمتیں بہت گر جاتی ہیں جن کے حسن سے ڈر کر اس وادی کو کافرستان کہہ دیا گیا۔

پاکستان میں دہشت گردی کا ڈرامہ رچائے جانے سے پہلے یہ وادیٔ کافرستان جب سیّاحوں سے بھری رہتی تھی اور اس نادر کلچر اور نایاب انسانوں کو دیکھنے کے لیے دُنیا کھنچی چلی آتی تھی تب ایک ایک تصویر کھنچوانے کے کئی ڈالر گورے بخشش کر جاتے تھے۔ اب بھولے بھٹکے کالجوں کے طالب علم پیشہ ور قلاش سیّاح، ان کیلاشی لڑکیوں کے ساتھ تصویریں بھی مفت بنوانا چاہتے تھے۔ پھل بھی مفت ہی توڑ کر کھاتے تھے۔ آنگنوں میں کھڑے اور چھتوں پر جھکے پیڑوں سے جتنا چاہا توڑا کھایا پھینکا اور لفافے بھر کر ساتھ لے گئے، جہاں جی چاہا بلا اجازت گھسے چلے آئے۔ ان زندہ انسانوں کے میوزیم میں ان تاریخی شہکار تصویروں کی آرٹ گیلری میں کوئی ٹکٹ، کوئی داخلہ فیس مقرر نہیں ہے۔

دُنیا سے کٹی ہوئی یہ درہ نما تنگ سی وادیٔ کیلاش جو بمبوریت بریر اور ریمبور تین وادیوں پر مشتمل ہے، جس کے دونوں اطراف سنگلاخ پہاڑ لینڈ سلائیڈنگ کے پتھروں بھری خطرناک موڑ کاٹتی تنگ سڑک پر یوں جھکے کھڑے ہیں جیسے ٹھپے کھا کھا کر اُچھلتی ہوئی جیپوں کو ابھی سینگ ٹکرا کر ہزاروں فٹ نیچے بہتے زمردیں پانیوں والے پہاڑی دریا میں دھکیل دیں گے۔ دہشت گردی کی جنگ کے بعد سے دُشوار گزار رستوں والی، چشموں، آبشاروں، دریاؤں، پھلوں بھری، اس حسین وادی کی رونقیں ماند پڑ گئی ہیں اس مُلک کو خطرناک قرار دیئے جانے کے بعد یہاں کے نظارے انسانی لہو کی وحشی بو میں لپٹے سوگوار ہیں۔ اگر چہ برف پگھل رہی ہے لیکن پھر بھی سیزن نہیں لگا ہے۔ اس حسین لینڈ اسکیپ کے شوکیسوں میں سجی یہ کیلاشی لڑکیاں مفلس اور اُداس ہیں جنھیں سورج چڑھتے ہی گھروں سے نکال کو آلوؤں کے کھیتوں میں آلوچے، خوبانی، اخروٹ، بادام کے پیڑوں تلے پگھلتے گلیشیرز، جھرنوں اور چشموں کے عقب میں نوادرات کی طرح سجا دیا جاتا ہے۔ ان دھڑکتے مسکراتے عجائباتِ حسن میں کوئی بھی آمیزش نہ چاہتا تھا۔ پوری دُنیا کی این جی اوز انھیں بدلتی دُنیا کی جدید ترقیوں سے محفوظ رکھنا چاہتی ہیں۔ رابرٹ نے ان رنگ برنگ پھولوں کی کیاریوں میں فرزین کے گلاب کو مہکتے ہوئے دیکھا اور سوچا اگر فرزین کا پھول توڑ لیا جائے تو پھر ان کیاریوں کا حسن کتنا ماند پڑ جائے گا اور اگر فرزین کو عام دُنیا کا حصہ بنا دیا جائے تو پھر وہ فرزین کہاں رہ جائے گی کون بدبخت ہوگا جو اس کلچر کو روند ڈالے جسے بچانے کو پوری دُنیا یکمشت ہوچکی ہے جسے مذہبی تبلیغیوں کی دست برد سے محفوظ کرنے کو اُن کا داخلہ یہاں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ حکومتِ پاکستان کا ایک ایسا منافع بخش پروجیکٹ جس کی حفاظت کے لیے پوری دُنیا پیسہ لگانے کو بے تاب ہے۔ اس قدیم تہذیب کو اسی شکل اسی حالت میں جوں کا توں برقرار رکھنے کے لیے یہ آثارِ قدیمہ والے، این جی اوز یہ ٹورسٹ گائیڈ اور سیّاح سب کتنے متفق اور ہم خیال ہیں۔

اُن کے بس میں ہوتا تو اس وادی کو دُنیا کے عجائبات میں درج کروا دیتے اس زندہ دھڑکتے ہوئے عجوبوں کے سامنے احرام مصر، تاج محل، دیوارِ چین ابوالہول، کتنے مردہ اور بدشکل ہیں۔ یہ سولہ سترہ برس کی کیلاشی لڑکیاں ہیں کہ قیمتی اینٹیکس ہیں۔ کتنی نادر و نایاب کتنی قدیم تاریخی داستانی اساطیری بنا کسی فاصلاتی بعد اور کھوٹ کے سچی اور حقیقی ورنہ عجوبات میں تو کئی کئی مرتبہ تاریخی جھوٹ اور آلودگیاں شامل ہوچکی ہوتی ہیں لیکن یہ واحد اینٹیکس ہیں جو ہر دَور میں نئے، تازہ، نوخیز، کلاسیک فضا میں سانس لیتے دھڑکتے ہوئے نوادرات یہ یونان والے سپین اور چین والے اس نادر کلچر کو محفوظ رکھنے کو کتنے پریشان ہیں، یہاں کسی جدید ایجاد کو گھسنے نہیں دیا گیا، نہ ٹیلی ویژن، نہ ٹیلی فون، نہ کالج، نہ یونیورسٹی اگر یہ ڈھائی تین ہزار نفوس پر مشتمل قدیم کلچر جدید ترقیوں سے ہم آہنگ ہوگیا تو پھر اپنی نوعیت کے واحد جیتے جاگتے سانس لیتے، اس عجائب گھر کو دیکھنے کون آئے گا۔ ہر خطے، ہر قوم کی کبھی ایک قدیم تاریخ اور تہذیب تھی لیکن وہ سب تو وقت کی تبدیلیوں سے ہم آمیز ہوتی چلی گئیں لیکن اس تہذیب کو دُنیا والے پتھر کے مٹھ میں قید رکھنا چاہتے ہیں، لیکن دہشت گردی کی جنگ نے اس وادی کے کلچر کو کتنا مفلس کر دیا ہے۔ سیّاحوں نے اب دِلّی اور آگرہ کا رُخ کر لیا ہے یہاں کے بچے انگریزی کے رٹے ہوئے جملے اب بھولنے لگے ہیں۔ ٹورسٹ گائیڈ وادی کے ویران داخلی دروازوں پر دریائے کنہار میں ڈوبتی اُبھرتی سیاہ چٹانوں کی تنہائی میں سوگوار اُونگھتے رہتے ہیں۔ انگریزی میں گھڑی گھڑائی وادی کی تاریخ پر گرد جمنے لگی ہے۔ این جی اوز اپنے دفتر سمیٹ رہی ہیں۔ سپین اور یونان والوں کے ہیلتھ سنٹر اور اسکول ویران پڑے ہیں جو خود تو راکٹوں میں سوار ہوتے ہیں لیکن ان کیلاشیوں کو اپنی قدیم نسل قرار دے کر ممیوں کی طرح پریزرو کرنا چاہتے ہیں، لیکن اب ان کی حکومتوں نے انھیں دہشت گردی کے خطرے کے پیشِ نظر واپس بلا لیا ہے۔ اب بمبوریت کا یونانی طرز کا سکول اور میوزیم بند پڑا ہے۔ کیلاشی لڑکیاں وزنی اور تکلیف دہ لباسوں کا بوجھ اُٹھائے خاموش ویران رستوں میں سجی تو ہیں لیکن ڈالر نچھاور کرنے کو اب غیر ملکی سیّاح نہیں آتے، بس کالجوں، یونیورسٹیوں کے ٹرپ

اور اِکّا دُکّا کنگلا سیّاح بھولے بھٹکے چلا آتا ہے۔ آج بھی لاہور سے آنے والے کسی یونیورسٹی کے ٹرپ نے کیلاشی ڈانس دیکھنے کا اہتمام کروایا تھا جو ٹورسٹ گائیڈ سے تین ہزار میں طے پایا تھا۔ دو ہزار ٹورسٹ گائیڈ کے ہزار روپیہ انتظام کروانے والی عورت کو ملا تھا اور ان بیسوؤں ناچنے والی پریوں کو نچانے کیا ملا ہوگا جو ایک دوسری کے گلے میں بانہیں ڈالے پھولوں کی مالا بنی نیم دائرے میں گھنٹوں گھومتی رہی تھیں۔ رابرٹ کیمرہ پکڑے تہ در تہ سیڑھیاں پھلانگتا سب سے اُوپر والی نشستوں پر جا بیٹھا تھا، جہاں سے پورے منظر کو کیمرے میں محفوظ کیا جا سکتا تھا۔ بموریت کے اس یونانی طرز کے اوپن ایئر ڈائننگ ہال کی پتھریلی نشستوں پر بیٹھے تماشائی تالیاں پیٹتے۔ ہیجان خیز آوازیں نکالتے اس متھ، رومانس اور ناسٹلجیا کے جزیرے میں گم ہو چکے تھے۔ کیلاشی لڑکے جین اور ماڈرن شرٹس میں ملبوس مجمع میں موجود پنجابی لڑکیوں کو کیمروں میں اُتار رہے تھے۔ شاید اُن کے لیے یہ ایک منفرد کلچر تھا، جسے محفوظ کر لینا چاہیے تھا۔

گھروں کی کھڑکیوں سے کیلاشی بچے اور مرد ڈرے شرمائے جھانکتے تھے جن کے زِینوں اور چھتوں پر یونیورسٹی کے لڑکے لڑکیاں دندناتے پھرتے تھے جیسے یہ گھر نہ ہوں پبلک پراپرٹی ہوں دھونکائے ہوئے مکانات غلیظ چیتھڑوں اور روئی اُگلتے لحافوں اور کالک زدہ برتنوں سے بھرے ہوئے پتہ نہیں ان کی تصویریں کیوں نہیں یہ سیّاح بناتے، رنگ برنگ بیڑ جڑی ٹوپیوں اور فراکوں میں کھلتی یہ یونانی نقوش والی حسین لڑکیاں جب رقص کا کوئی انداز تبدیل کرتیں تو تماشائی تالیوں کے رِدھم میں خود رقص میں شامل ہو جاتے۔ اس وقت کیلاشی لڑکے پنجابی لڑکیوں کو اپنے کیمروں میں اُتار رہے تھے اور پنجابی لڑکے کیلاشی لڑکیوں کے حسن سے پاگل ہو رہے تھے ایک جیسے یورپی طرز کے لباسوں میں ملبوس پنجابی اور کیلاشی لڑکوں میں تمیز کرنا مشکل تھا۔ زری جو اُدھر اسلام آباد کے ایک کالج میں ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز کر رہی تھی وہ رقص کے دائرے سے نکل کر تہ در تہ پتھریلی نشستیں ٹاپتی زِینے چڑھنے لگی۔ جڑاؤ ٹوپی کی لمبی ٹیل لہراتی گھیر دار فراک میں ہوا بھرتی ہوئی غبارہ سا پھلاتی پیلے موتیوں کی اَن گنت لڑیوں میں چھپی صراحی دار گردن کے اطراف باریک میڈھیوں کو گوندھے لمبی سیاہ چوٹیاں بے شمار کیمروں کے فلش ہر ہر قدم پر نچھاور ہوتے چلے گئے۔

رابرٹ ماہر فوٹو گرافر تھا۔ بے شمار رول بنتے چلے گئے۔

''تم نے کتنی تصویریں بنالی ہوں گی اب تک۔۔۔''

عام کیلاشی لڑکیوں کے برعکس جنھوں نے سیّاحوں سے انگریزی کے چند جملے سیکھے تھے۔ زری پڑھی لکھی اور شستہ انگریزی بول سکتی تھی۔

رابرٹ کے چہرے پر مخصوص جاپانی مسکان آمیز خوش اخلاقی پھیل گئی۔

''کم از کم سو۔''

''کتنے کی بک جائیں گی۔''

سامنے دائرے میں ناچتی پریوں میں سے فرزین باہر نکل رہی تھی۔

رابرٹ نے اُسے ہاتھ ہلایا۔

''پندرہ ہزار کی تو بک ہی جائیں گی نا۔''

''Of course, sure''

رابرٹ فرزین کے مختلف پوزز فوکس کرنے کھڑا ہو گیا۔ چھتوں زینوں پر کھڑے پنجابی لڑکے بے تحاشا تالیاں پیٹنے لگے۔

اب فرزین زینے چڑھنے لگی تھی۔ ہر زینے پر تالیوں کی گونج کے ساتھ سینکڑوں فلش جل بجھ رہے تھے جیسے مس یونیورس تاج پہنے اسٹیج پر کیٹ واک کرتی ہو اور ہزاروں کیمروں کی روشنیوں کا فوکس اُسی پر ہو۔

''یہ جو تمہاری طرف کھنچی چلی آ رہی ہے جس کی ہزاروں تصویریں تم بنا چکے ہو تم ساری سمولی کو اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتے پھر عمر بھر اس کی تصویریں بناتے اور بیچتے رہنا صرف پندرہ ہزار میں۔۔۔ پندرہ ہزار میں تو اس کی ایک ایک تصویر بک جائے گی ہے نا رابرٹ۔۔۔ تم چاہو تو میں کچھ کم بھی کروا سکتی ہوں۔''

رابرٹ کی جاپانی آنکھیں مچ گئیں جیسے فرزین کے مختلف پوزز کے کئی رول اندر ہی اندر لپٹ گئے ہوں ڈانسنگ اسٹیڈیم کے چہار اطراف پھیلے مکانات کی چھتوں پر کھڑے کیلاشی لڑکے پنجابی لڑکیوں کی تصویریں بنا رہے تھے اور پنجابی لڑکے کیلاشی لڑکیوں کے ایک ایک پوز کو باندازِ ہزار محفوظ کیے چلے جا رہے تھے۔ نشیب میں اُترتے زِینوں سے ایک کیلاشی لڑکی کمر سے بانسوں کی تیلیوں سے بنی لمبوتری ٹوکری باندھے اُوپر چڑھی جس میں چند ماہ کا ایک بچہ بیٹھا تھا جیسے تازہ سیب درخت سے توڑ کر نقش و نگار بنا ٹوکری میں سجا دیا گیا ہو۔ پورے مجمع نے بھرپور تالیاں بجائیں جیسے کوئی کمال کا سین شوٹ ہوا ہو۔ کھڑکیوں میں کھڑی مینڈھیاں گندھاتی خوبانی کے ڈھیر چھتوں پر سوکھنے کو بچھاتی چارے کے گٹھڑ کمر پر لادے دُنیا کی حسین ترین عورتیں ہزاروں فلش چمک گئے۔ تماشائی اب بموریت کی اس بستی کے بازار میں خریداری کرنے لگے تھے جہاں چھوٹے چھوٹے کھوکھوں میں کیلاشی ٹوپیاں فراک، جوتے، مالائیں، کنگن سجے تھے جن کے مرد دکاندار جین شرٹس پہنے، گھڑیاں عینکیں لگائے بھاؤ تاؤ کر رہے تھے۔ کیا کلچر سنبھالنے کی ساری ذمہ داری صرف عورتوں پر ہی آن پڑتی ہے۔ چند لڑکیاں اِدھر پشاور اور اسلام آباد کے کالجوں میں پڑھ رہی ہیں۔ اُنھیں بھی گلیشیرز پگھلنے کے موسموں میں جب سیّاحوں کے قافلے یہاں اُترتے ہیں اس کلچرڈ پلیس پر واپس آنا ہوتا ہے۔ خوبصورت لینڈ اسکیپ کے شوکیسوں میں مورتیاں سی سجنا ہوتا ہے۔

کئی پڑھی لکھی کیلاش لڑکیاں یہ سوال این جی اوز سے کیا کرتی ہیں۔ آخر اُن کی کوئی پرائیویسی، ذاتی گھر کی حد بندی کیوں نہیں ہے، جہاں داخل ہونے سے پہلے اجازت طلب کی جائے، یہ وزیٹرز بنا کسی پیشگی اطلاع کے ان کے گھروں میں کیوں دھاوا بول دیتے ہیں۔ یہ کافر لڑکیاں جو اپنے نازک، نفیس

جسموں پر کتنے ہی قدیم اور کلچرڈ لوازمات کا بوجھ اُٹھائے آنے والوں کے رستوں میں بچھی رہتی ہیں۔ یہ جو پہلے باریک موتیوں کی مالائیں صراحی دار گردن کی زینت ہیں کبھی اس پھندے کو ہٹا کر دیکھئے تو کتنے زخم ہیں جو اس خوبصورت گلوبند کی دَین ہیں جن کی تیاری میں مہینوں خرچ ہو جاتے ہیں۔ یہ جو گز گز لمبی مینڈھیوں کو گوندھنے میں صبح شام میں تبدیل ہو جاتی ہے اور جب مہینوں بعد دُھلنے کے لیے یہ کھلتی ہیں تو لڑکیوں کی چیخیں لہو رنگ آلوچوں سے لپٹتی ہیں۔ رنگ برنگ موتیوں، شیشوں نلکیوں سے بوجھل بھاری فراکوں سے چھٹتی ہمک پانیوں میں گھری اس وادی میں جیسے رُکی غلاظتیں رواں ہو جاتی ہیں۔ یہ ریمبور کی بستی جس کے دیوار کی لکڑی کے فریموں میں جڑے در و دیوار، برسوں کی میل میں اَٹے ہیں چونکہ یہ کسی عظیم کلچر کے نقوش ہیں۔ شاید انھیں اسی شکل میں محفوظ رکھنا ضروری ہے ان کی بوسیدگی، کہنگی اور گندگی کی حفاظت بھی لازم ہے۔ عجائب گھروں کی تو جدید تراش خراش قدیمی نوادرات سنبھالے ہوئے ہے لیکن ان زندہ نوادارت کے شوکیس اور الماریاں اس قدر غلیظ کیوں ہیں۔ کتنے ڈائننگ ہال اور شتاخان (معبدگاہ) بنائے گئے ہیں لیکن اُن گھروں کی غلاظت اور کہنگی شاید اس کلچر کی قدامت کی شہادت کے لیے برقرار رکھنی ضروری ہے۔

دریائے کیلاش پر جھولتے پل کے دونوں اطراف ریمبور کی وادی میں پھیلی ان غلیظ رہائش گاہوں کے عقب میں وہاں کے سردار کی ہوا باز بیٹی الکشن بی بی کا محل کھڑا ہے جو اس کلچر کے بچاؤ کے لیے دُنیا بھر کے وزٹ کر چکی ہے۔ عالیشان محل کے اِردگرد پھیلی غلیظ چیتھڑوں اور بدبودار لحافوں بھری ان قبر نما کوٹھریوں کی حفاظت کا دُنیا کو دورہ سا پڑا ہے۔ رابرٹ نے دُور پہاڑیوں پر بنے عالی شان شتاخان اور ڈائننگ ہال کو کئی زاویوں سے شوٹ کیا۔ وہ ہر روز اپنے کمرے میں آ کر ان تصویروں کو لیپ ٹاپ پر محفوظ کرتا ہے ہر ہر تصویر کو بیسوؤں زاویوں سے پرکھتا ہے تو اُسے محسوس ہوتا ہے اب اُس کا کام یہاں پر مکمل ہو چکا ہے اب اس سیّاح کو کوئی دوسری سرزمین کھوجنی چاہیے لیکن پھر اگلے روز اس وادی کے کچھ ایسے نظارے سامنے آ جاتے جو اُس پر پہلے کھلے ہی نہ تھے اور فرزین اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں پوچھتی ہے۔

''آج کے یہ فوٹو کتنے میں بک جائیں گے۔ پندرہ ہزار تو مِل ہی جائیں گے نا۔''

دونوں شانوں سے پشت تک جھولتی میڈھیاں گندھی چوٹیوں کی ستار پر رابرٹ اُنگلیاں بجاتا ہے۔

''پندرہ ہزار تو ان دو سانپوں کی ایک تصویر کی قیمت ہے۔ ڈارلنگ۔۔۔'' فرزین سمجھتی ہے کہ اس انگریزی لفظ کا مطلب ہے ''پیاری'' گویا وہ فرزین سے محبت کا اظہار کر رہا ہے۔

بمبوریت کے قبرستان میں تابوتوں میں کھلی پڑی پرانی ہڈیاں اور کھوپڑیاں بدبو چھوڑ رہی تھیں۔

نئے مُردوں کو اب زمین میں دبانے کا رواج ہو چلا تھا کیونکہ جب یہ کیلاشی تین دِن تک آخری رسومات کے بعد میّت کو اُس کی اشیاء کے ساتھ کھلے تابوت میں چھوڑ کر جاتے تو ادھر باہر سے یہ مسلمان آ کر اُن کے کپڑے، برتن، چارپائی، کھانا چرا کر لے جاتے سو اَب ہر شئے مردے کے ساتھ ہی دفن کر دی جاتی ہے۔ سوائے اُن چند پرانی کھوپڑیوں اور ہڈیوں کے جو اب خاک بن رہی ہیں اس کلچرڈ قبرستان سے سب کچھ چرا لیا گیا ہے۔ رابرٹ نے کئی سنیپس لیے قبرستان کے داخلی رستے پر اُبلتے چشمے کے کنارے کیلاشی بچے بیٹھے تھے جن کے آلوچوں جیسے گال پرانی میل سے اَٹے تھے۔ پانیوں میں ڈوبی اس وادی میں دھونے نہانے کا شعور ان این جی اوز نے شاید اسی لیے نہ دیا تھا کہ کہیں قدیم کلچر دُھل نہ جائے۔

فرزین کا گھر چہار اطراف جھنکار سی گرتی آبشار میں کشتی کی طرح ڈولتا تھا۔ برف کے موسموں والی کوٹھری کے اطراف میں بنے چبوترے پر لیپ ٹاپ رکھے رابرٹ اُسے سینکڑوں تصویریں دِکھا رہا تھا۔ ہر منظر فرزین کے مرکز سے پھوٹتا تھا جیسے کیلاش کا سارا حسن، سارا اچنبھا، سارا رومان اسی سوتے سے رواں ہو۔

فرزین کو ان تصویروں کی کاریگری، قدروقیمت سے کیا آگاہی۔۔۔ لیکن رابرٹ جاپانی لہجہ انگریزی میں ان تصویروں کی تعریف کرتے ہوئے بچوں کی طرح کھلکھلاتا تھا جیسے تصویروں میں سے سکوں کی جھنکار نکلتی ہو۔

فرزین نے باہر کی دُنیا کبھی نہ دیکھی تھی۔ اُردو بولنا بھی نہ جانتی تھی لیکن ان غیر ملکی سیاحوں سے انگریزی کے کئی جملے سیکھ گئی تھی وہ انھی جملوں میں اس جاپانی فوٹو گرافر تک اپنا مافی الضمیر پہنچانے کی کوشش کرتی لیکن یا تو جملے بہت ادھورے تھے یا پھر جاپانی فوٹو گرافر بہت علمی تھا جو اُسے ان تین مہینوں میں یہ نہ بتا سکا تھا کہ کیا یہ تصویریں پندرہ ہزار میں بک جائیں گی۔

گھر کے صحن میں خوبانیوں کے پیڑوں تلے جھلنگا سی چارپائی پر بوسیدہ لحاف بچھائے اُس کی پھوپھی شلوار قمیص میں ملبوس بیٹھی تھی، جو سر کو سفید دوپٹے میں ڈھکے درود شریف کا وِرد کر رہی تھی اتنی گوری جتنا سفید جھاگ اُڑاتا برف چور آبشار بغلی چٹانوں پر سے گر رہا تھا۔ پندرہ برس پہلے جہلم کا ایک اُدھیڑ عمر مرد اُسے پانچ ہزار کے عوض لے گیا تھا کیونکہ پانچ بچوں کے باپ اس رنڈوے سے کوئی پنجابن عقد کرنے کو تیار نہ تھی لیکن اخروٹ کی اس کیلاشی کلی کو پسند یا خواہش کی کیا خبر تھی یہ خوبانی کی اصلی شراب جس پیالے میں ڈلی اُس ساخت میں ڈھل گئی۔ فرزین اس انوکھی ساخت کے پیالے میں ڈوبتی اُبھرتی اِک نئی دُنیا کو دیکھتی تھی۔ اُڑتا ہوا ہوائی جہاز انگریز خواتین کا سا ملبوس اور رابرٹ کے بیگ میں سیکڑوں تصویریں جو ہزاروں روپوں میں بِکی تھیں۔

رابرٹ نے اس حسین اور باوقار عورت کی تصویر بنائی اور پھر ڈیلیٹ کر دی یہ تو کہیں بھی کوئی بھی ہو سکتی ہے جیسے انگریز عورتیں اسلام آباد کے بوتیکس

سے پاکستانی لباس زیب تن کر لیتی ہیں۔ بالکل ویسی ہی گوری گوری نیلی آنکھوں والی، جیسے پشاور کی کوئی پٹھانی لمبی چوڑی تر و تازہ بدن والی جیسے لاہور کی کوئی بٹنی شاداب چہرے والی اس میں کلچر کہاں ہے۔ کیلاش کہاں ہے۔

رابرٹ نے قریب بیٹھے خوبانی کا شربت پیتے اس مرد کو نفرت سے دیکھا۔

''ظالم انسان! سنہری پری کے گل رنگ پروں کی افشاں کو خاکستر کر کے کتنا معمولی عام اور بے وقعت کر دیا ہے۔ خوش ہے کہ کافر کو مسلمان بنانے کے بدلے جنت میں گھر مِل گیا۔ انتہاپسند دہشت گرد۔'' رابرٹ نے اس کریہہ صفت انسان کی کئی تصویریں بنالیں۔ شیطان ڈیول کسی انگریزی اخبار کے لیے اُس کی ٹاپ سٹوری کا وِلن۔

جس روز یہ جاپانی فوٹوگرافر سیکڑوں تصویروں کا خزانہ سمیٹے اُس کلچرڈ وادی سے رُخصت ہوا۔ فرزین شتاخان میں گھٹنے ٹیک کر گھنٹوں دُعا کرتی رہی کہ یہ تصویریں اِتنی مہنگی بکیں کہ یہ جاپانی سیّاح پندرہ ہزار روپیہ لے کر واپس اس وادی میں آئے اور پھر۔۔۔

اور یہ جاپانی سیّاح جہاز کی آرام دہ نشست سے ٹیک لگائے کسی انگریزی اخبار کے لیے مضمون لکھ رہا تھا۔

''وادیٔ کیلاش دُنیا کے حسین ترین لینڈ اسکیپ پر واقع ایک قدیم قبیلے کی بہت ہی منفرد اور نایاب کلچر والی وادی ہے، جہاں فرزین جیسی حسین لڑکیاں اپنے روایتی گٹ اپ میں دُنیا سے کٹے ہوئے اس عجائب گھر کے بیش قیمت نوادرات ہیں جنھیں اسی صورت میں یہیں قائم و دائم رکھنے کی ذمہ داری پوری دُنیا پر عادی ہوتی ہے۔

☆

''شال کی شان''

طاہرہ اقبال کے افسانے ہمارے اردگرد کے ماحول کا عکاس ہیں۔ انہیں پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم اور ہمارے دوست، عزیز و اقارب، بال بچے، ڈھور ڈنگر اپنے محلوں، بازاروں اور گلی کوچوں میں ایک دوسرے کو محبت کی آنکھ سے دیکھتے پھر رہے ہوں۔

گنجی بار کے افسانوں تک اس استعمال میں ایک توازن پیدا ہو گیا ہے۔ طاہرہ اقبال نے اپنے افسانوں کی زبان پر خاص توجہ دی ہے۔ وہ اسے خوب نکھارتی اور سنوارتی ہیں۔ انہوں نے اردو افسانے کی مثال میں پنجابی الفاظ کے موتی اس خوب صورتی، مہارت اور سلیقے سے ٹانکے ہیں کہ جس کی وجہ سے شال کی شان میں بھی اضافہ ہوا ہے اور پنجابی لفظوں کو اردو کے محل میں داخل ہونے کے مواقع بھی میسر آئے ہیں اور یہ مواقع آئندہ بھی انہیں ملتے رہیں گے۔ گنجی بار کے افسانوں میں پنجابی کے لفظوں کو بھی مہارت سے استعمال کیا گیا ہے۔

شفیع ہمدم

''گوہرِ نایاب''

طاہرہ اقبال کی کہانیاں پڑھ کر یوں لگا کہ یہ کہانی کار وہ گوہر نایاب ہے جو سیپ میں بند رہنے کے بعد پوری قوت اور تابانی سے نمودار ہوا ہے مدتوں ادب کے تاج میں جگمگائے گا۔

طاہرہ نے اپنے افسانوں میں ہمارے ہاں کے انفرادی اور اجتماعی دونوں رویوں کی بھرپور عکاسی اور نشاندہی کی ہے۔ اور ہماری دیہی اور شہری زندگی کے موضوعات جن پر پہلے بھی بہت لکھا جا چکا ہے انہیں ایک نئی جہت کے ساتھ انتہائی بھرپور اور توانا انداز میں پیش کر دیا ہے۔ اس کی سوچ ایک دردمند باشعور پاکستانی کی سوچ ہے جو اپنے اردگرد کے حالات سے گھبرا کر یہ ضرور سوچتا ہے کہ یہاں علم کی روشنی دلوں کو منوّر کیوں نہیں کرتی، ذہنی جہالت کے زنگ زدہ تالوں کو کیوں نہیں کھولتی، ہماری تعلیم نورِ بصیرت دینے کے بجائے حقائق سے چشم پوش کیوں ہے۔ خواہشوں کے ہاتھوں اغوا ہونے والے کیوں بنا دیتی ہے، خودغرضی کے گہرے غاروں میں دھکیل کر اپنی ذات کے حصار میں کیوں قید کر دیتی ہے۔

فریدہ حفیظ

''دستکِ عجز''

حمدِ باری تعالیٰ

شُکر لازم ہے مقام اتنا بڑا مجھ کو مِلا
لُطفِ ہمسائیگیٔ بیتِ خُدا مُجھ کو مِلا

بُوند چاہی جو کبھی تُو نے سُمندر بخشا
جتنا مانگا تھا کہیں اُس سے سِوا مجھ کو مِلا

ہے کرم تیرا کہ لفظوں کے خزانے بخشے
تیری رحمت سے نیا طرزِ دُعا مُجھ کو مِلا

میرا جو فرض تھا وہ مجھ سے ادا ہو نہ سکا
پھر بھی جو نخلِ تمنّا تھا ہرا مُجھ کو مِلا

تیری ہی حمد و ثنا لب پہ رہے گی جاری
بات کہنے کا سلیقہ جو ذرا مجھ کو مِلا

دستکِ عجز بیاں میری کہ خالی نہ گئی
درِ رحمت کہ ہمیشہ ہی کھُلا مُجھ کو مِلا

تیرے اکرام سے دیدارِ مدینہ پایا
صحنِ کعبہ میں بھی سجدے کا مزا مُجھ کو ملا

نورین طلعت عروبہ
(راولپنڈی)

نعت

جب سے آنکھوں نے مری روضۂ اطہر دیکھا
دن وہ خوشیوں کا مری عید سے بڑھکر دیکھا

پھر تو خوشیوں نے کہا دل میں چراغاں یارو
دل سے جاتے ہوئے جب درد کا لشکر دیکھا

خضر بھی بھول گئے راہ دکھانا لوگو
میرے آقا کو زمانے کا جو رہبر دیکھا

رشک آتا ہے زمانے کو مقدر پہ مرے
اوج پہ جب سے مرا اس نے مقدر دیکھا

میں یہ سمجھوں گا کہ وہ عید کا دن ہے سیفیؔ
میں نے خود کو جو کبھی آپ کے در پر دیکھا

سیفی سرونجی
(بھارت)

پسِ اشک

انل ٹھکّر

(دہلی، بھارت)

دیوان صاحب مغرب کی نماز ادا کر کے ابھی ابھی مسجد سے لوٹے تھے۔ بڑی امّاں اور میمونہ نے بھی اُس دم سلام پھیر کر عبادت سے فارغ ہوئی تھیں۔ بڑی امّاں نے اپنی چارپائی پر بیٹھک لی اور میمونہ نے جانماز الماری کے اوپر رکھ کر باورچی خانہ کا رُخ کیا۔ دیوان صاحب پر بندگی کا اثر ابھی ابھی طاری تھا وہ زیرِلب کلمہ پڑھ رہے تھے کہ اللہ نے جیسے انہیں کرشمہ دکھایا۔ انہیں حیرت ہوئی۔ وہ ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔ آج ان کا بیٹا عطاء اللہ شام ڈھلے ہی گھر آ گیا تھا! بیٹے نے باپ کو سلام کیا۔ سلام قبول کر کے دیوان صاحب نے اپنی حیرانی کو دور کر کے سوال کیا:

کیا بات ہے، آج جلدی آ گئے؟!

عطاء اللہ آگے بڑھ کر اپنی ماں کی چارپائی کے پاس گئے۔ بڑی امّاں نے سرک کر اس کے بیٹھنے کو جگہ بنائی۔ بیٹا ماں کے قریب بیٹھا۔

ایک خوش خبری دینی تھی۔ سوچا، پہلے گھر چل کر خبر سناؤں۔

شوہر کی آواز سُن کر میمونہ باہر آئی۔

ایسی کیا خبر ہے؟ دیوان صاحب نے پوچھا۔

بڑی امّاں اور میمونہ خوش خبری سننے کے لیے بے صبری سے اس کی جانب دیکھنے لگیں۔

ابّا میں نے ایک بنگلہ خریدا ہے۔

الحمدللہ۔۔۔ دیوان صاحب بولے۔

میمونہ کے منہ سے خوشی کے مارے ہلکی سی سسکاری نکلی۔

کہاں خریدا ہے؟ بڑی امّاں نے پوچھا۔

کیشواپور میں۔

میمونہ کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

وہ تو آبادی کے باہر ہے۔۔۔ بڑی امّاں نے اعتراضاً کہا۔

وہاں تو عیسائیوں اور ریلوے والوں کی آبادی ہے۔ دیوان صاحب نے لقمہ دیا۔

تو کیا ہوا؟!

وہاں مسجد ہے؟ بڑی امّاں نے شک جتایا۔

مسجد ہے نا۔ کیشواپور چوک سے ذرا آگے۔ مسجد ہے تو مسلمانوں کے گھر تو ہوں گے ہی۔۔۔ بڑی سڑک کے پیچھے بارہ کوٹھی پوری مسلمانوں کی ہی بستی ہے۔

ہمارا پڑوسی۔۔۔

پڑوسی مسلمان ہی ہو ضروری تو نہیں۔۔۔ عطاء اللہ نے قطع کلام کرتے ہوئے اپنی امّی سے کہا۔

میمونہ کو ساس، سُسر کی یہ تفتیش اچھی نہیں لگی۔

گھر کیسا ہے؟۔۔۔ بڑی امّاں سے چپ نہ رہا گیا۔

گھر نہیں، بنگلہ ہے بنگلہ امّی۔۔۔ عطاء اللہ نے فخر سے کہا۔۔۔ بہت بڑا۔ چار سونے کے کمرے، باورچی خانہ۔ باہر بیٹھک، اندر کی بیٹھک کو ہم زنان خانہ بنائیں گے۔ باورچی خانہ، ڈرائنگ روم کا ہال، الگ سے دو غسل خانے۔۔۔

یہ لو!! اتنا بڑا گھر لیکر کیا کرو گے؟!! بہت بڑا گھر ہو تو گوشہ نشینی کی عادت پڑ جاتی ہے۔ سب کو اپنے اپنے کمرے میں بند ہونے کی عادت ہو جاتی ہے۔ دوریاں بڑھ جاتی ہیں۔ آپس میں اپناپن نہیں رہتا۔

میمونہ کے چہرے پر مایوسی اُتر آئی۔

یہ گھر بہت ہی چھوٹا ہے امّی۔

اسی گھر میں بڑا ہو کر تو وکیل بنا ہے۔

صحیح ہے امّی۔ میں تھا جو اس حال میں محنت کر کے پڑھا۔ آج کل کے بچے، انہیں پڑھائی کے لیے کشادہ جگہ چاہیے۔ اپنے پاس جگہ کی تنگی ہے اس لیے تو اختر کو دوسروں کے گھر پڑھنے کے لیے۔۔۔

پھٹے منہ تیرا۔ وہ دوسروں کا گھر ہے؟!! بہن ہے تیری۔۔۔ بڑی امّاں نے پھٹکار لگاتے ہوئے کہا۔

میں مانتا ہوں امّی۔ مگر وہ وہاں پڑھائی کیسے کرتا ہے، ہمیں کیا معلوم۔ اپنے بچے اپنی نظر کے سامنے رہیں تو اچھا۔

بیٹے کی بحث سے تنگ آ کر بڑی امّاں کے دل میں کھٹکتی بات زبان پر آ گئی۔۔۔

گھر لینے سے پہلے تو نے اپنے ابّو سے پوچھنا تک ضروری نہیں سمجھا؟!

اس میں پوچھنا کیا تھا! میرے پاس پیسے تھے۔ میں نے قیمت چکا دی۔

بڑی امّاں نے طنزاً کہا۔۔۔

اوہ، میں بھول ہی گئی تھی۔ تو اب پیسے والا ہو گیا ہے۔

عطاء اللہ چڑھ گئے۔۔۔

میں نے جائیداد خریدی ہے، پیسے ضائع تو نہیں کیے۔

تو وکیل ہے۔ اتنا تو جانتا ہے۔ مول محلّات ہوں گے تو کل تیری

اولاد ہی ایک دوسرے کے خلاف کورٹ کچہری کے دروازے کھٹکھٹائیں گے۔

ماں بیٹے کی جرح جب نا قابلِ برداشت ہوگئی تو دیوان صاحب نے ہاتھ اوپر کر کے دونوں کو خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا۔

ماں کی اَنا اور بیٹے کو بالغ نظر ہو جانے کا گُمان آمنے سامنے آ گئے تو باپ کی بزرگی نے سوچا اگر یہ اسی طرح جرح کرتے رہے تو نتیجہ کسی دھاکے تک پہنچے گا۔ وہ گویا ہوئے۔

جزاک اللہ۔ گھر تو تم نے خرید لیا۔ اب ہمیں گھر دکھانے کب لے جاؤ گے؟

میمونہ کا جی اپنے خسر کی بلائیں لینے کو مچل اُٹھا۔ اسے یقین ہو گیا، آج اگر بڑے ابّو نہ ہوتے تو یہ بنگلہ کھٹائی میں پڑ جاتا۔

دوسرے روز بنگلہ دیکھنے جانے کا طے ہوا۔

میمونہ نے جب سے وہ بنگلہ دیکھا ہے، اس کے پیر زمین پر نہیں پڑتے۔ اس کا دل ہر پل گنگنانے کے لیے مچلتا رہتا ہے۔ اپنے تصورات کے پروں پر سوار ہو کر آسمان میں پرواز کرتے رہتی۔ وہ سوچتی، اب جینے کے دن آئے ہیں۔ دیر آید درست آید۔ اللہ میاں کو آخر کار ہماری زندگی میں خوشی کا آفتاب طلوع کرنے کا خیال آ ہی گیا!

پچھلی رات میمونہ نے دل پر پتھر رکھ کر اور نتھنوں میں دم روک کر عطاءاللہ کے منہ سے آتی شراب کی بدبو کو برداشت کرتے ہوئے انہیں بانہوں میں بھر کر ہر گُر آزماتے ہوئے انہیں یہ گھر جلد چھوڑ کر بنگلہ آباد کرنے کے لیے راضی کر لیا۔ عطاءاللہ بھی ایک عرصے کے بعد کی صحبت سے تر ہو کر جلد از جلد بنگلے میں منتقل ہونے کو تیار ہو گئے۔

دوسرے روز صبح اُمڈے ہوئے دریا کی طرح میمونہ کسی نہ کسی بہانے گھر میں یہاں سے وہاں پھیرے لگاتی رہی۔ اس نے آج وقت سے پہلے ہی بڑی امّاں اور دیوان صاحب کو چائے بنا کر دی۔ دیوان صاحب نے چائے کو پھونکتے ہوئے چُسکی لیتے کپ کو ہونٹوں سے لگایا۔ بڑی امّاں نے رکابی میں چائے ڈال کر پھونک پھونک کر پسٹر پسٹر پینے لگی۔ تبھی عطاءاللہ لنگی پہنے غسل خانہ سے بالوں کو خشک کرتے ہوئے نمودار ہوئے۔ امّی اور ابّو کو چائے پیتا دیکھ کر وہ ان کے روبرو آ کھڑے ہوئے اور امّی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''امّی، بنگلے میں قرآن خوانی اور چوکھٹ، دروازوں کو صندل لگانے کی رسم کب ادا کریں گے؟''

تبھی میمونہ شوہر کے لیے چائے لیکر آئی۔ چائے کا کپ انہیں دیکر ان کی باتیں سُننے وہ وہیں رک گئی۔

بڑی امّاں نے ہونٹوں اور رکابی کا فاصلہ بڑھایا۔ نظر اٹھا کر بیٹے کی جانب دیکھ کر پوچھا۔۔۔

کیوں، بہت جلدی ہے؟ وہاں جا کر رہنے کی؟

بنگلہ خریدا ہے تو پھر خالی رکھنے کا کیا فائدہ!

ہاں وہ تو ہے۔۔۔ انہوں نے کہا۔

بڑی امّاں نے رکابی پر کپ رکھا اور اسے بستر پر ایک طرف رکھا۔ عطاءاللہ نے بات بڑھاتے ہوئے کہا۔

میرا تو اب اس گھر میں دم گھٹتا ہے۔

بیٹے، تیرے سینے میں جو یہ دم خم ہے نا، وہ اس گھر میں لی سانسوں کی کرم فرمائی ہے، یہ مت بھول۔

عطاءاللہ چونکے۔ یک لخت انہیں خیال آیا، وہ غلطی کر بیٹھے ہیں، بگڑی بات کو بنانے کی کوشش کرتے ہوئے گویا ہوئے۔

میں کہاں اس بات سے انکار کرتا ہوں امّی۔

بڑی امّاں نے بھی بحث سے دامن بچاتے ہوئے رائے دی۔

رسم تو کبھی بھی ادا کی جا سکتی ہے۔ تمہارے ابّو سے کہو، مولوی صاحب کو کہہ دیں گے۔ صندل کسی عطار کی دکان سے مل جائے گا۔

عطاءاللہ نے چائے کی چُسکی لیتے ہوئے دیوان صاحب کی جانب رُخ کیا، کہا:

ابّو، میرا خیال ہے، اب جب اتنا بڑا بنگلہ خریدا ہے تو اس مکان کو بیچ دینا چاہیے۔

خبردار۔۔۔ یہ آبائی ملکیت ہے۔ اس پر نظر ڈالی تو۔۔۔ بڑی امّاں بھڑک اٹھیں۔

امّی، تو کیا اسے کھنڈر بننے ایسے ہی چھوڑ دو گے؟

کھنڈر کیوں بنے گا؟!

تو کیا کرائے پر اٹھانا ہے؟!

کرائے پر کس لیے؟! میں رہوں گی یہاں۔ میں ڈولی میں بیٹھ کر اس گھر میں آئی تھی۔ جنازہ میں لیٹ کر خدا کے گھر جاؤں گی۔

وہاں تو سب کو جانا ہے امّی۔ دوسرا کوئی چارہ ہی نہیں مگر۔۔۔

عطاءاللہ اپنی امّی سے مایوس ہو کر اپنے ابّو سے مخاطب ہوئے۔

ابّو، اب آپ ہی کہیے، گھر جیسی چیز کے لیے اگر ہم پالتی مار کر بیٹھ جائیں، تو ترقی کیسے کر سکتے ہیں؟!

برخوردار، ترقی کے معنی کسی کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھنا ہے۔ ہمارے اجداد جانے کہا کرتے تھے۔ میرے دادا اور ابّا کا ذریعہ معاش کاشت کاری تھی۔ میں دو قدم آگے بڑھ کر معلم بنا۔ حکیمی کا ہنر سیکھا۔ تم چار قدم آگے بڑھ کر وکیل بنے۔ میں آگے بڑھا، میرے والدین پیچھے چھوٹ گئے۔ اب تم ترقی پر ہو، ہمیں پیچھے چھٹنا ہی ہے۔

عطاءاللہ والد کو امّی کی طرف داری کرتے دیکھ کر پریشان ہوئے۔ فوراً عادتاً جرح کرنے پر آمادہ ہوئے۔۔۔

میں مانتا ہوں یہ سلسلہ حیات ہے مگر اس کے لیے امّی کو بنگلے میں آ کر رہنے میں کیا اعتراض ہے؟!

یہ رشتہ ہے، اس مکان کے ساتھ تمہاری امّی کا، عقیدے کا رشتہ۔ جو خون اور دوسرے رشتوں سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔

پھر وہ۔۔۔ اتنا بڑا بنگلہ۔۔۔؟!!

وہ بنگلہ آج تمہیں بڑا لگتا ہے۔ میرے لیے بھی یہ گھر بہت بڑا تھا۔ کل تیری اولاد کو تمہارا یہ بنگلہ چھوٹا محسوس ہوگا۔

تب کی بات تب۔۔۔

دیوان صاحب نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

خیر، میں مولوی صاحب سے بات کر لیتا ہوں، بازار سے آتے ہوئے صندل بھی لیتا آؤں گا۔

عطاء اللہ نے محسوس کیا، جیسے ابّو نے کہنے، سُننے کے دروازے بند کر کے مکمل طور پر اس موضوع پر گفتگو کرنے پر روک لگا دی ہے۔

دوسرے روز عطاء اللہ اپنی فوج کے ساتھ قرآن خوانی کی رسم ادا کرنے کے لیے بنگلے پر پہنچے۔ اس میں کوئی شامل نہیں ہوا تو، اختر میاں جو کالج کے لیے دھارواڑ چلے گئے۔ نغمہ جو کسی حال میں اسکول سے غیر حاضر رہ کر اس رسم میں شریک ہونے کے لیے راضی نہیں ہوئی اور بڑی امّاں یہ کہہ کر ٹال گئیں کہ انہوں نے گھر دیکھا ہے، وہ یہیں بیٹھ کر دعا پڑھ لیں گی۔

بنگلے پر پہنچ کر سب نے وضو تازہ کیا۔ مولوی صاحب نے تلاوتِ قرآن کی رسم ادا کی۔ میمونہ اور رابعہ نے مل کر بنگلے کی چوکھٹ، دروازہ اور کھڑکیوں پر صندل لگایا، دعا مانگی۔ بعد ازاں عطاء اللہ نے اپنے آدمی کو بھیج کر دھارواڑ سے پیڑے منگوائے تھے اس سے سب کا منہ میٹھا کیا۔ رابعہ گھر سے ناشتہ بنا کر لائی تھی۔ سب نے ناشتہ کیا۔ دیوان صاحب نے، مرزا، رابعہ اور بچوں کو گھوم گھوم کر گھر دکھایا۔ سب کو بنگلہ بہت پسند آیا۔ عطاء اللہ کا سینہ چوڑا ہو گیا۔

آٹھ روز گزر گئے۔ بنگلہ میں منتقل ہونے کے لیے میمونہ نے سارا سامان اور خوابوں کی گٹھڑی باندھ کر کوچ کرنے کی تیاری کر لی تھی۔ مگر عطاء اللہ اس حال میں نہیں تھے کہ کوچ کا اعلان کرتے۔ انہیں ان آٹھ دنوں میں اپنے حال پر رونا آ رہا تھا۔ بار بار ان کے ذہن میں خیال آتا کہ انہوں نے یہ بنگلہ کیوں خریدا؟!! ایک طرف والدہ کی آبائی گھر نہ چھوڑنے کی ضد دوسری جانب جلد از جلد بنگلہ آباد کرنے کا بیوی کا تقاضہ۔ والدہ کو بارہا سمجھایا، التجا کرنے اور گڑگڑانے کے باوجود بھی وہ انہیں اپنے ساتھ بنگلے میں رہنے کے لیے راضی نہ کر سکے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے والدین اس عمر میں ان کے ساتھ رہیں۔ سکون کی زندگی بسر کریں مگر سب بے سود ہوتا نظر آ رہا تھا۔ یہ تناؤ کیا کم تھا کہ اس پر ان کے چھوٹے فرزند سہیل نے اعلان کر دیا کہ وہ بنگلے میں رہنے نہیں آئے گا۔ وہ اپنی بڑی امّاں کے ساتھ رہے گا۔

بیٹے کی یہ تنگ مزاجی دیکھ کر میمونہ چڑھ گئی۔ اسے یقین ہو گیا یہ بڑی امّاں کی کارستانی ہے۔ ہمارے یہاں سے جانے کے بعد بڑھیا اکیلی ہو جائے گی اس لیے بچے کو پٹّی پڑھائی ہے۔ اس نے بیٹے کو طنزاً کہا۔

اس روز تو بنگلہ دیکھ کر بڑی تعریف کر رہا تھا۔ اب آج یہ کیا راگ الاپ رہا ہے؟!

تعریف تو میں آج بھی کرتا ہوں، بڑا اچھا بنگلہ ہے۔

تو پھر؟

امی، وہاں میرے دوست نہیں ہوں گے۔

وہاں رہے گا تو اور کئی دوست مل جائیں گے۔

بڑی امّاں، دوسری بڑی امّاں کہاں سے لاؤ گی؟۔۔۔ سہیل نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔

میمونہ نے بیٹے کی معصومیت کو بدتمیزی مانا، وہ پہلے ہی بڑی امّاں کے رویہ سے خفا تھی، اس کا ماننا تھا وہ اس بچے کو اپنا حمایتی بنا کر اڑنگا ڈالنا چاہتی ہیں۔ اس نے بڑی امّاں کا غصہ سہیل پر نکالتے ہوئے اسے تھپڑ رسید کر دیا۔ تھپڑ کی گونج وہاں موجود کسی کے کان سے ٹکرائی۔ سہیل کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ کچھ پل وہ اپنے سرخ گال پر ہاتھ رکھ کر درد پیتا رہا پھر اچانک غصّہ آنسوؤں میں تبدیل ہو کر بہنے لگا۔ وہ چیخا۔

میں نہیں آؤں گا، نہیں آؤں گا، نہیں آؤں گا۔ میں بڑی امّاں کے ساتھ ہی رہوں گا۔

وہ روتے ہوئے بڑی امّاں کی گود میں سر ڈال کر سسکیاں بھرنے لگا۔ بڑی امّاں اپنی فطرت پر ضبط رکھ کر خاموش سہیل کے بالوں کو سہلاتی رہیں۔

تبھی دیوان صاحب کی گمبھیر آواز سنائی دی۔

میمونہ اس پر زور آزمائش مت کرو۔

عطاء اللہ نے فوراً بات کو راہ پر لانے کے لیے میمونہ سے کہا۔

ٹھیک ہے، اسے یہاں رہنا ہے تو رہنے دو۔ بنگلہ کونسا دور ہے۔ جب جی کرے گا آتا رہے گا۔

بڑی امّاں کو عطاء اللہ کا بچپن یاد آ گیا، وہ بھی ان ہی سے مُجاور رہتا تھا، ہر وقت ان سے ایسے ہی چپکا رہتا تھا۔ ان کی پلکوں کی چوکھٹ پر اٹکے آنسو میں بیٹے کا بچپن جھلملانے لگا۔ بیٹے نے سب کے بیچ اس کی ناک کٹوائی ہے یہ سوچ کر میمونہ پیر پٹک کر اندر چلی گئی۔

اتوار کا دن تھا۔ نغمہ کو اسکول جانے کی عجلت نہیں تھی۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ آج وہ ابّو کے کہنے کے مطابق بالائی منزل کا کمرا صاف کر کے اسے اپنے لیے پڑھائی کا کمرا بنائے گی۔

جس روز عطاء اللہ اپنے کنبہ کے ساتھ نئے گھر میں منتقل ہوئے اسی روز اختر کو کمرا خالی کر کے بنگلہ پر آ جانے کے لیے کہہ دیا تھا۔ وہ بھی وہاں سے

نکلنے کے لیے موقع کی تلاش میں تھا۔اس نے فوراً اپنا بوریا بستر لپیٹا اور وہاں سے نکل آیا۔

اختر کے جانے سے نغمہ بہت خوش تھی۔اب وہ بے کھٹکا جب چاہے غسل خانے میں نہانے جا سکتی ہے۔کسی تاک جھانک کا خطرہ نہیں۔ وہ کمرا صاف کرنے اوپر کمرے میں گئی۔کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک عجیب طرح کی بُو کا احساس ہوا۔اس نے میز پر کچھ کاغذات پڑے دیکھے۔کمرے کے کونے میں سگریٹ کے کچھ ٹکڑے بکھرے ہوئے نظر آئے۔میز کے نیچے ماچس کی ڈبیا پڑی ہوئی تھی۔اٹھا کر دیکھا تو اس میں تیلیوں کی جگہ سگریٹ کی راکھ بھری ہوئی تھی۔اس نے صفائی شروع بھی نہیں کی تھی کہ امّی نے نیچے سے آواز دی۔وہ نیچے اُتری، باورچی خانہ کے دروازہ کے پاس امّی اس کے انتظار میں نظر آئی۔اس نے نغمہ سے کہا۔

تمہارے ماموں آئے ہیں،ان کے لیے پانی لے آؤ۔

اتنا کہہ کر وہ اندر کے کمرے میں چلی گئیں۔کمرے میں آ کر انہوں نے مرزا کو کہتے سُنا۔۔۔

آیئے وکیل صاحب۔

کیا دولھے بھیا، آپ بھی طنز کر رہے ہیں؟!

نہیں سالے صاحب، آیئے بیٹھئے۔۔۔مرزا نے کرسی کی جانب اشارہ کیا،عطاء اللہ کرسی پر بیٹھے۔ایک نظر اپنی بہن رابعہ کو دیکھا۔مرزا نے سوال کیا۔

کہیے نئے گھر میں سب ٹھیک ہے نا؟

سب لوگ تو مزے میں ہیں، میں ہی پریشان ہوں۔

کس بات کی پریشانی ہے؟ مرزا نے حیرت سے پوچھا۔

رابعہ کے چہرے پر فکر نمودار ہوئی۔ وہ آگے بڑھی، بھائی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

کیا ہوا؟

نغمہ پانی لیکر آئی، رابعہ نے فوراً اس سے کہا:

بیٹے، اپنے ماموں کے لیے چائے چولھے پر رکھو۔

نغمہ کے جاتے ہی رابعہ نے سوال کیا۔

کہیے کیا بات ہے؟

جب سے میں وہاں رہنے گیا ہوں، تب سے مجھے چین نہیں۔ نہ ٹھیک سے کام کر پا رہا ہوں نہ رات کو چین سے نیند نصیب ہو رہی ہے۔

بھائی جان آپ پہیلیاں مت بجھایئے۔

عطاء اللہ، آپ کھُل کر کہیے، پریشانی کیا ہے؟۔۔۔مرزا نے پوچھا۔

میں بنگلے میں رہنے تو چلا گیا مگر میری روح ابھی بھی آبائی گھر کی دہلیز عبور نہیں کر پائی۔رات دن فکر لگی رہتی ہے۔امّی کیسے سب کام کر لیتی ہوں گی؟!ان کی صحت۔۔۔عمر۔۔۔اسی فکر میں آج میں وہاں چلا گیا۔انہیں سمجھانے، منانے مگر وہاں ان کے چہرے پر تو خاموش جھیل کی سی شانتی چھائی ہوئی تھی۔نہ کوئی شکوہ نہ شکایت، اطمینان ہی اطمینان نظر آیا۔میرے منع کرنے پر بھی آملیٹ بنایا۔چائے پلائی اور میرے ماتھے کا بوسہ لیکر دعائیں دیں اور ان کی فکر نہ کرنے کی ہدایت کے ساتھ مجھے رخصت کیا۔

اتنا کہہ کر عطاء اللہ کا گلا بھر آیا۔انہیں رونا آ گیا۔ان کی آنکھ میں اشک چھلک آئے۔رابعہ اپنے بھائی کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگی۔مرزا اٹھ کھڑے ہوئے۔عطاء اللہ نے اپنے آپ کو سنبھالا اور سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

میرا کیا ہے، میں تو آج ہی بنگلے کو کرائے پر اٹھا کر واپس لوٹ آؤں،مگر میمونہ اور اختر نہیں مانیں گے۔انہیں وہ جگہ راس آ گئی ہے۔

مرزا نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

آپ ہی ایسے ہمت ہار گئے تو کیسے چلے گا؟ آپ فکر نہ کریں۔وقت کے ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

وقت کے ساتھ امّی اور ابّو کی عمر بھی چار قدم آگے بڑھ گئی ہوگی، اس کا کیا؟ یہ عمر اُن کے آرام کرنے کی ہے۔محنت تو انہوں نے زندگی بھر کی ہے۔

مرزا سنجیدہ ہو کر بولے۔

آپ سچ کہہ رہے ہیں۔اس کا کوئی حل تو ڈھونڈنا ہوگا۔

میرے پاس ایک تجویز ہے۔۔۔عطاء اللہ نے کہا۔

کیا؟۔۔۔رابعہ نے بے صبری سے سوال کیا۔

اس مسئلہ کو آپ دونوں ہی سلجھا سکتے ہیں۔

رابعہ اور مرزا نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔رابعہ نے کہا:

ہم؟!!

کیسے؟!!مرزا نے پوچھا۔

دولھے بھائی، یہ مکان آپ کی پشتینی ملکیت تو ہے نہیں۔کرائے کا گھر ہے۔آپ اسے چھوڑ کر ابّو اور امّی کے ساتھ رہیں تو مسئلہ آسانی سے حل ہو سکتا ہے۔

اس تجویز سے میاں، بیوی دونوں فکر میں مبتلا ہو گئے۔

اُدھر عطاء اللہ کی تجویز جب بڑی امّاں کے پاس پہنچی تو انہوں نے بڑی گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم کیا۔دیوان صاحب کو ڈھلتی عمر میں مرزا جیسا حکمت پر گفتگو کرنے والا مل گیا، انہیں اس سے بھلا اور کیا چاہیے! سہیل کو نغمہ آپا جیسا ساتھی ملا جان کر وہ باغ باغ ہو گیا۔

کچھ ہی دنوں میں مرزا کے اہل خانہ کو بڑی امّاں کے پاس پہنچا کر عطاء اللہ اطمینان سے اپنی ترقی کی راہ پر گامزن ہوئے۔

خالقِ کائنات نے جب سب سے حیرت انگیز چیز بنانے کی سوچی ہو گی تو اس نے انسان اور شیطان پر وقت کو ترجیح دی ہوگی۔وقت کو پیدا کرتے ہی

اس سے کہا ہوگا۔''میری کائنات کے اختتام تک تیرا وجود قائم و دائم رہے گا۔تو کبھی رُکے گا نہیں۔ چلتا ہی رہے گا، ماہ و سال اور صدیوں سے بے نیاز۔کئی دور آئیں گے اور گذر جائیں گے۔حکومتیں بنیں گی اور نیست و نابود ہو جائیں گی۔ پیر اولیا، سادھو سنت، وِیر سورما پیدا ہوں گے اور موت کی آغوش میں سو جائیں گے۔ جو بھی آئے گا، اسے لوٹنا ہی ہوگا۔سوا تیرے، تیرا کام ہوگا صرف دیکھنا،دخل دینا نہیں۔''

ان برسوں میں عطاء اللہ نے جو ترقی کی تھی، وقت اسے خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔عطاء اللہ ترقی کی راہ پر چلتے چلتے اپنے والدین کو پیچھے چھوڑ آئے۔بعد ازاں اپنی بیٹی مسکان اور منجھلے بیٹے عرفان کو کانوینٹ اور سینٹ میری ہائی اسکول میں داخلہ دلوا کر مادری زبان سے ان کا رشتہ توڑ دیا۔اُبھرتے پودوں کو ان کی اپنی زمین سے اکھاڑ کر نا آشنا زمین میں لگا دیا۔لاشعوری طور پر گھر سے آداب وسلام جیسے ورثے میں ملے الفاظ غائب ہو گئے اور چپکے سے ہیلو، ہائے بائے کی صدائیں گھر کی فضا میں گونجنے لگیں۔عطاء اللہ نے وکالت کی سند لیتے سمیہ لی ہوئی سوگند کو بھلا کر ترقی کی اندھی گلیوں میں جائز، ناجائز مقدموں کی فائلیں بغل میں دبائے دوڑتے رہے۔اس طرح عقل کی تجارت کرتے ہوئے شہر کے نامی گرامی وکیل بننے میں کامیاب ہو گئے۔سائیکل، تانگہ جیسی سواری پیچھے رہ گئی۔ کچہری جانے آنے کے لیے کار خریدی گئی۔وکیل کی خوشنودی کے لیے موکلوں کی طرف سے مئے نوشی کی جو محفلیں سجتیں،اب جدیدیت کی آڑ میں انگور کی بیٹی کو گھر کی زینت بنا دیا گیا۔ایسے ماحول میں میمونہ میں بھی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں تھیں۔علیحدہ خواب گاہ کا لطف، ہر شب شوہر کی آغوش میں سونے کا سُکھ، بدن کی آگ بجھانے کا بھرپور مزہ۔ایسی آسودہ حال زندگی سے اس کا جسم بھی بھرا بھرا سا نظر آنے لگا۔رخساروں پر سرخی نمودار ہونے لگی تھی۔سوت جیسی انگور کی بیٹی سے ان کی نفرت رفتہ رفتہ رفاقت میں بدل گئی تھی۔شوہر کے قریب آتے ہی ان کے منہ سے شراب کی بُو، اب اسے عطر کی خوشبو محسوس ہونے لگی تھی۔ جب کبھی عطاء اللہ کے منہ سے شراب کی وہ بُو نہ آتی تو میمونہ اس کی کمی کو شدت سے محسوس کرتی۔ اس کے سینے میں ٹھاٹھیں مارتا ہوا حسد کا وہ سمندر اترنے لگا تھا، آٹھ، دس روز کے وقفہ میں وہ کار لیکر بڑی امّاں اور سہیل سے ملنے چلی جاتی۔جاتے وقت ان کے لیے گھر میں پکایا پکوان یا بازار سے پھل وغیرہ لے جانا نہ بھولتی۔اس کا یہ رویہ منصوبہ بندی کے تحت ہی ہوتا رہا۔نغمہ کو اپنی بہو بنانے کا خواب اب بھی اس کی آنکھوں میں کاجل کے مانند بسا ہوا تھا۔اب تو اس کے بڑے بیٹے نے بی۔اے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کر لیا تھا۔دیوان صاحب چاہتے تھے ان کا پوتا ہائی اسکول کا مدرس بنے۔مگر عطاء اللہ اور اختر نے ان کی اس رائے کو مُسترد کر دیا۔عطاء اللہ نے محکمہ ایکسائز میں دے دلا کر بیٹے کے لیے انسپکٹر کا عہدہ حاصل کر لیا۔''وقت'' یہ جوڑی دیکھ کر من ہی من مسکرایا۔ باپ وکیل، بیٹا ایکسائز انسپکٹر بڑے میاں تو بڑے میاں، چھوٹے میاں سبحان اللہ۔!!

''وقت'' نے چلتے چلتے ایک نظر دیوان صاحب کے کنبہ پر بھی ڈالی تو دیکھا ان کا کنبہ امن وسکون سے زندگی بسر کر رہا تھا۔ظاہر طور پر ایسا لگتا نہیں تھا کہ انہوں نے کوئی ترقی کی ہو البتہ وہ اپنی تہذیب، اخلاق اور مذہبی اقدار کو سینے سے لگائے آگے بڑھ گئے تھے۔بڑی امّاں اپنی بیٹی رابعہ کی خدمت سے خوش تھیں۔ اپنے والدین کی خدمت کا موقع ملنے پر رابعہ اللہ تعالیٰ کی شکر گذار تھی۔دیوان صاحب اور مرزا نے مل کر جڑی بوٹیوں سے ایسے نسخے تیار کیے کہ ان کی حکمت چل پڑی۔یہ ان کی اندھی دوڑ نہیں تھی۔ان کی اس دوڑ میں پیسوں کی اہمیت نہیں تھی۔ ان پر خدمتِ خلق کا جذبہ غالب تھا۔نغمہ اور سہیل اپنی تعلیمی مصروفیات میں محو تھے۔

آگے بڑھتے بڑھتے ''وقت'' کو خیال آیا۔یہ میرا آقا بھی عجیب ہے! مجھ سے کہہ دیا، تجھے چلتے رہنا ہے۔آنکھیں مُند کر تو چل نہیں سکتا۔آنکھیں کُھلی رکھتا ہوں تو اس کی دنیا میں کیا کیا دیکھنا پڑتا ہے!! یہ۔۔۔ یہ عطاء اللہ راہ سے ہٹ کر عیّاری اور عیّاشی میں مزے سے جی رہا ہے۔جیسے اللہ نے اسے کُھلی چھوٹ دے رکھی ہو۔دوسری جانب دیوان صاحب کا کنبہ آقا کی بتائی راہ پر چل کر بھی پریشانیوں کا سامنا کر رہا ہے۔۔۔سمجھ میں نہیں آتا یہ میرا آقا، ان کو ہی کیوں زیادہ آزماتا ہے جو اس کی بتائی راہ پر بے چوں وچرا چلتے ہیں!!! واہ رے اللہ۔تیری قدرت کا تماشا نرالا ہے! تیرے دل کی کس نے جانی ہے!!!

۔ بقیہ ۔
آخری حور

''مگر حوروں کے بغیر تم کیسے کام چلاؤ گے؟''

اس کے پاس ہر سوال کا جواب ہوا کرتا''میں نے اس دنیا میں بھی شادی نہ کی سوچتا ہوں کہ بہتر حوروں کی بجائے ہر مرد کو اکہتر اکہتر آٹے کی بوریاں اسی دنیا میں مل جائیں تو لوگ بھوکوں نہ مریں، مائیں اپنے بچے نہ بیچیں بے روزگار بھوکے نوجوان ٹرینوں کے نیچے سر نہ دیں۔ وہاں تو ایک حور بھی کافی رہے گی۔''

''منّا یعنی خلیفہ جی تم سچ کہتے ہو یوں تو کوہ ہمالیہ سے بھی بڑے بڑے اور بلند ترین آٹے کے پہاڑ ہوں۔نہ قحط پڑیں نہ ہی لوگ بھوکوں مریں۔تم اکہتر حوروں کا مجھ سے سودا کر لو۔ہر ماہ ایک حور خریدوں گا۔بولو کیا دام لگاتے ہو۔''

منّا نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے پہلو میں پڑی کاپی اٹھائی ''میں دیکھ کر بتاتا ہوں''اس نے کاپی کے صفحات الٹے پلٹے۔

''دیکھو یار ڈھائی من کی ایک بوری لوں گا، مگر۔۔۔مگر میں تو سبھی فروخت کرتا چلا آیا ہوں۔بس آخری حور ہی بچی ہے'' اس کا لہجہ بدل سا گیا۔گلوگیر ہو گیا''بوری کل پہنچا دینا، یہ حور میں ابھی تمہارے نام کرتا ہوں۔مگر یاد رکھنا یہ میری آخری حور ہوگی۔''

آخری حور

آغا گل

(کوئٹہ)

یوں تو منّا میرا پڑوسی اور ہم مکتب تھا۔ مگر اس کی شخصیت بار بار گھوم جاتی۔ شاید وہ دوہری شخصیت کا مالک تھا۔ پل میں تولہ پل میں ماشہ۔ اس کے والد مجاہدین میں شامل رہے تھے۔ جہاد اور ڈرگ مافیا کے باعث چوکھا مال کمایا اور پھر جہاد چھوڑ اداڑھی گھٹالی اور پرچون کی دکان کھول لی۔ منّا اکلوتی اولاد تھا، خوب لاڈ پیار سے اس کے مطالباتِ زر پورے کئے جاتے۔ من پسند عیدی طلب کرتا، رقم کم ملتی تو عید کے روز بھی گھر سے نہ نکلتا نہ ہی نئے کپڑے پہنتا یا پھر اسی لباس میں گھر سے بھاگ جاتا اور بمشکل کسی مزار سے پکڑ کے لایا جاتا۔ اس کے والدین ایسی درد بھری فریاد کرتے کہ ہم اپنی عید بھول کر منّا کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے۔ تھا وہ حاتم وقت دوستوں پہ خوب خرچ کرتا۔ فراخدلی سے اپنا کوٹ یا جیکٹ تک اتار کے دوستوں کو بخش دیا کرتا۔ اور ہوٹل یا کالج کی کینٹین کا بل تو کیا مجال کوئی کلاس فیلو ادا کر پاتا۔ کبھی کتابیں پھینک دیتا، کبھی دیوانوں کی مانند پڑھنے لگتا تھا۔ دوستوں میں مشہور تھا کہ اس کا کوئی پرزہ ڈھیلا ہے۔ اس کے والد نے یوں تو افغان جہاد میں خاصی دولت کمائی تھی۔ مگر موٹر سائیکل نہ دلوائی جو کہ ان کی دانست میں ایک خطرناک سواری تھی۔ البتہ وعدہ کر رکھا تھا کہ تعلیم مکمل ہوتے ہی کار دلوا دیں گے۔ جس کے باعث منّا کی ڈھارس بندھی رہتی اور وہ ٹمل غپاڑہ نہ کرتا۔ شرافت سے میرے ساتھ ہی آتا جاتا۔ اس کی والدہ کا عقیدہ تھا کہ عامل اپنے عملیات سے زندگی بدل سکتے ہیں۔ وہ اسے اِدھر اُدھر لیے پھرتی۔ جھاڑ پھونک کروانے کا اسے جنون تھا۔ اکثر عامل اس کے گھر سے جن بھوت پکڑنے بھی چلے آتے اور بوتلوں میں دکھائی نہ دیے جانے والے بھوت پکڑ کر لے جایا کرتے۔ یہ خاصہ دلچسپ منظر ہوا کرتا۔ منّا میری موٹر سائیکل بھی صاف کرتا اکثر و بیشتر پٹرول وہی ڈلوایا کرتا۔ ایک روز اچانک ہی اسے رخشندہ سے محبت کا دورہ پڑ گیا۔ ہمارے قریب ہی اس کا گھر تھا وہ تھی تو بلاشبہ بے حد خوبصورت جسے خالق نے Long Week End میں ڈیڑھ دن لگا کر بنایا ہوگا۔ مگر اس کے بھائی ہمارے دوست تھے، تعلقات بھی اس گھرانے سے اچھے تھے، منّا کا جو رشتہ استوار کرنا چاہتے تھے وہ آرزو خاک میں مل گئی۔ A Big No سے دروازہ بند کر دیا۔ شادی تو دور کی بات ہے وہ تو ملنے کے لیے بھی تیار نہ تھے۔ رخشندہ اس گستاخی پہ بہت خفا ہوئی اور تمتما ہی اٹھی۔ اب علم ہوا کہ اس گھرانے کو ان کے روئیوں کے باعث پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ منّا کا اپنا باؤلا پن اور اس کے والد کا افغانستان میں قتل عام انہیں لے ڈوبا۔ مگر منّا کہاں کسی کی سنتا وہ مختلف حربوں پہ اتر آیا کہا کرتا کہ نپولین کی مانند اس کی لغت میں لفظ ناممکن سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔

رخشندہ مجھ سے تو اچھی طرح پیش آیا کرتی۔ کتابوں کا تبادلہ بھی ہم کر لیا کرتے، ہیلو ہائے بھی ہوتی۔ کینٹین میں چائے بھی آفر کرتی بڑی عزت کرتی۔ مگر منّا کو گھاس نہ ڈالتی۔ ایک دو بار اس نے منّا سے دریافت کیا کہ ان کے ہاتھوں پہ جو معصوم افغانوں کا خون ہے کیا وہ لیڈی سیکبتھ کی مانند راتوں کو جاگ اٹھتا ہے اور عربیہ کے عطر سے ہاتھوں سے خون کے دھبّے مٹا دینا چاہتا ہے۔ سنتے آئے تھے کہ محبت بھی جواباً محبت ہی کو جنم دیتی ہے۔ مگر جوں جوں منّا پاگل ہوتا چلا گیا توں توں رخشندہ اس سے بیزار رہنے لگی تھی اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ کوئی ڈیڑھ سو برس قبل رخشندہ کے بزرگ چہاریکار سے آئے تھے، زبان بدل گئی، ثقافت ہاتھ سے گئی مگر وہ اپنا ناسٹلجیا قائم رکھے ہوئے تھی۔

ایک روز منّا دوڑا چلا آیا اور مجھے ایک عامل کے پاس لے گیا۔ اس کے پاس سواری نہ تھی میرا موٹر سائیکل مانگ رہا تھا میں اپنا قلم اور موٹر سائیکل کسی کے حوالے نہ کرتا۔ ناچار ساتھ ہی جانا پڑا یہ عامل فومانچو کی شکل تھا، دور کی کچی آبادی میں رہتا تھا۔ اس کے کمرے میں سلیقے سے دری بچھی ہوئی تھی، ایک جانب پنجرے میں الّو بند تھا، دوسری جانب ہڈیاں اور جانے کیا کچھ الم غلم۔ اس نے روئیداد محبت سن کر آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر مراقبے میں رہا پھر یوں گویا ہوا ''نوجوان، دو دلوں کو ملانا ہوگا، اس کا ستارہ تم سے دور دور رہتا ہے۔ میں عمل کروں گا۔ اگلی جمعرات کو آنا۔ محبوب تمہارے قدموں میں ہوگا۔ تم شادی کرنا چاہتے ہو۔ مگر میرے تعویذ کے بعد وہ ماہی بے آب کی مانند تمہیں تلاش کرتی پھرے گی۔'' منّا نے کل سرمایہ اس کی مٹھی میں دے دیا۔ اس کا رویہ بدل سا گیا، خوش خوش رہنے لگا۔ لیکچر بھی دلچسپی سے سنتا اور رخشندہ کے قریب سے پُر امید مسکراہٹ لیے گزرتا۔ بارے جمعرات آئی، رخشندہ سے پہلے وہی مرغ بسمل کی مانند تڑپنے لگا تھا بڑی مشکل سے دو پہر کٹی، سہ پہر میں آن دھمکا قرار در دل عاشق نہ آپ در نمر بال۔ مرتا کیا نہ کرتا کتاب پٹخ کر ساتھ چل دیا۔ فومانچو نے کچھ اور مال وصول کیا اور منّا کو ایک تعویذ دیا جو بقول اس کے الّو کے خون سے کسی خاص ساعت میں تحریر کیا تھا۔ حالانکہ اس کا الّو Blood Donater تو نہیں لگ رہا تھا۔ اچھا خاصا موٹا تازہ تھا یا فومانچو نے الوؤں کا پولٹری فارم کھول رکھا تھا۔ فومانچو کا حکم سن کے ہم چکرا گئے۔ وہ مُصر تھا کہ ہم کسی حلال جانور کے دل میں تعویذ رکھ کر بہتے ہوئے پانی کے قریب دفن کر آئیں۔ دل تو ہم نے بکری کا خرید لیا۔ مگر ہمارے ہاں تو پانی ہوتا ہی نہیں ہے۔ کجا یہ کہ بہتا ہوا پانی؟ دریائے بولان بھی بوڑھا ہو چکا ہے۔ بہنے کا شغل زمانہ ہوا ترک کر چکا ہے اپنے بستر میں بلا کھانسے لیٹا رہتا ہے۔ بہتا ہوا پانی تلاش کرتے ہم بی بی نانی کے مزار تک جا پہنچے۔ وہاں فومانچو کی ہدایت کے مطابق دل دفنا دیا۔ تھکے ماندے گھر لوٹے۔ اگلے روز کچھ بھی نہ ہوا۔ منّا کے دل کو دھچکا لگا۔ اس بار میں نے بھی ساتھ جانے سے انکار کیا کہ کسی بدنام زمانہ عامل کے ڈیرے پر آنے جانے سے بدنامی کا اندیشہ ہے۔ منّا عاشق صادق تھا خود ہی جا پہنچا اور فومانچو

کے قدم لیے۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ ایک وظیفہ بتلا دیا۔ منّا بالکل ہی دیوانہ ہو چکا تھا۔ کسی سے مشورہ لیے بغیر ہی بیسوں کا نئے نکل پڑا۔ جانے سوا لاکھ مرتبہ کسی چیز کا جاپ کرتا کہ رات بھر فومانچو کے الو کی مانند جاگتا رہتا اور کلاس میں اونگھنے لگتا۔ لباس اور تعلیم سے لاتعلق ہو جا رہا تھا۔ رنگ سیاہ پڑتا جا رہا تھا، آنکھیں ویران اور وحشت ناک سی ہونے لگی تھیں۔ اب تو اس کی آنکھوں میں جھانکتے خوف سا آنے لگتا۔ ویران کنوئیں کی مانند سائیں سائیں کرتی دیوانوں جیسی آنکھیں۔ مجھ سے کیا وہ تو دنیا سے ہی کٹ کے رہ گیا تھا۔ میں بھی کنی کترانے لگا اور ایک نئے دوست کو ساتھ لانے لے جانے لگا۔ جس کا اصل مقصد منّا سے جان چھڑانا تھا۔ چالیس روز بعد اس کا وظیفہ مکمل ہو گیا تو فومانچو کی ہدایت کے مطابق شاہانہ انداز سے چلتا ہوا کینٹین کے کھلے لان میں چلا آیا۔ جہاں طلباء چائے پی رہے تھے۔ اس نے رخشندہ کو دیکھ کر دو ایک پھونکیں ماریں۔ اس کے لبوں کی جنبش سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی منتر پڑھ رہا ہے۔ پھر قریب چلا آیا اور کرسی کھینچ کر رخشندہ کے سامنے جا بیٹھا۔ میں بے حد پریشان ہو گیا۔ اس نے جونہی پھونک ماری تو رخشندہ نے تلملا کر پانی سے بھرا گلاس یوں تھاما کہ ہم کچھ سمجھ نہ پائے، پہلے تو پانی اس کے منہ پر اچھالا پھر گلاس بھی سر پہ دے مارا جو ٹکرا کے گرا تو چھنا کے سے ٹوٹ بھی گیا۔

طلباء سراسیمہ ہو گئے۔ رخشندہ نے نہایت ہی سکون سے چائے والے کو پکارا ''چائے کے پیسے بھی کاٹ لینا اور گلاس کے بھی! ہاں کل سے میرے لیے لوہے کا گلاس رکھنا۔'' منّا کی ایسی درگت بنی کہ وہ یونیورسٹی سے ہی غائب ہو گیا۔ چند ماہ بعد تپتی دوپہر میں ملا تو میں پہلی نظر میں پہچان ہی نہ پایا۔ بالکل ہی سوکھ کر کانٹا ہو چکا تھا۔ اب وہ جنونی ہو چکا تھا اس کا خیال تھا کہ رخشندہ نے اس کی محبت کی سرعام تذلیل کی۔ اب وہ اسے حاصل کیے بغیر نہیں رہے گا۔ اس کی باتوں سے مجھے خوف آنے لگا۔ مجھے تو یوں لگا کہ خودکش جیکٹ پہنے کسی روز وہ شعبہ میں چلا آئے گا اور رخشندہ کو گلے لگا کر یوں بٹن دبائے گا کہ وہ دونوں تو جنت میں پہنچ جائیں گے ہم سبھی جہنم میں۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ رخشندہ نے گھر شکایت نہ لگائی ورنہ بات بڑھ جاتی۔ منّا اپنی بے عزتی کے باعث یونیورسٹی سے ہی غائب ہو گیا۔ ان ہی دنوں منّا کے والد کا بھی انتقال ہو گیا۔ ہم سبھی اس کے غم میں شریک ہوئے، مگر وہ خاصا کھسک چکا تھا۔ ہمارے کہنے پہ بھی دماغی ڈاکٹر سے ملنے پر آمادہ نہ ہوا۔ وہ تو دکان بھی نہ چلا سکا۔ ہوا یوں کہ دکان کا سامان بکتا رہا، پھر ایک روز دکان بھی بک گئی۔

اس کی والدہ اسی غم میں چل بسی۔ اس بھائیں بھائیں کرتے مکان میں بالکل ہی اکیلا رہ گیا، ایم۔اے کے بعد ذرا بھاگ دوڑ سے مجھے ملازمت ملی تو میں بھی چلا گیا۔ پھر سننے میں آیا کہ رخشندہ کی بھی شادی ہو گئی۔ منّا نے خود بھی تعویذ لکھنے کا ہی پیشہ اختیار کر لیا۔ دن بھر ناکام بے مراد بیمار مرد و عورتیں اس کے گھر ڈیرہ جمائے رکھتیں۔ وہ انہیں پانی دم کر کے دیتا۔ تعویذ لکھ کے دیتا۔ اس کے عقیدت مند بہت سی آرزوئیں، حسرتیں لے کر آتے۔ یہ سارا دن ان کی تکلیف دہ باتیں سنتا اور تعویذ لکھتا رہتا۔ دو ایک بار میں گیا تو اژدھام دیکھا۔ سر پہ پگڑی باندھے ایک بڑی سی کرسی پہ بیٹھا تھا اور باقی سبھی قدموں میں۔ وہ نہ تو مجھے کرسی منگوا کے ساتھ بٹھا سکتا تھا اور نہ ہی قدموں میں بیٹھنے کو کہہ سکتا تھا لہٰذا ملحقہ کمرے میں لے آیا۔ مصافحہ معانقہ ہوا۔ لوگ اسے خلیفہ صاحب پکارنے لگے تھے۔ اس کا چہرہ خشک کدو کی مانند ہو چکا تھا۔ آنکھیں بجھ چکی تھیں۔ مسلسل لوگوں کی فریاد سننے کے باعث وہ بھی دکھی دکھی بکھرا بکھرا سا لگ رہا تھا۔ میں نے اسے ڈھنگ کا کاروبار کرنے کا مشورہ دیا۔ جس پہ اس نے برا مانا اور بات ہی بدل دی۔

آئندہ چند ہی برسوں میں مخلوق فرار ہو گئی۔ لوگ کہتے کہ تعویذوں میں اثر نہیں ہے اور نہ ہی اس کی دعاؤں میں۔ زندگی کچھ ایسی مصروف ہوئی کہ بہت کم اپنے شہر لوٹنے کا وقت ملتا۔ منّا ایک پٹا ہوا مہرہ تھا۔ وقت نے ہمارے درمیان فاصلے بڑھا دیے تھے۔ منّا مفلوک الحال ہو چکا تھا۔ ایک روز یونہی اس کے ہاں جا نکلا۔ اکیلا بیٹھا تھا، اس نے دو مزدور گھر میں رکھ لیے تھے۔ وہ دن بھر محنت مزدوری کرتے اور پھر اس کے ہاں چلے آتے۔ کھانا پکاتے اور اسے کھلاتے۔ کرایہ وغیرہ نہ دیتے۔ انہیں سر چھپانے کی جگہ مل گئی تھی۔ یہی ان کے لیے غنیمت تھا۔ اخراجات کا پوچھا کہ کیسے کرتے ہو تو تنک کر بولا فتوح سے۔ میں نے لاعلمی ظاہر کی تو اس نے وضاحت کی کہ عقیدت مند جو کچھ دے جائیں اسے فتوح کہتے ہیں۔ یوں لگتا تھا کہ بمشکل گزارہ ہو رہا ہے۔ گھر کی حالت بھی ابتر تھی۔ مفلوک الحالی بڑھ چکی تھی۔ پھر ایک روز اس کا عقیدت مند چلا آیا۔ منّا کو میری آمد کا علم ہوا تو اس نے ہی آدمی دوڑایا تھا۔ اب منّا سے دن کی روشنی میں ملنا میری افسری کے متقاضی نہ تھا۔ لہٰذا سرِ شام اس کے ہاں جا پہنچا۔ بہت ہی نحیف ہو چکا تھا۔ ایک لاتعلقی سی اس میں نمایاں تھی۔ مزدور کو چائے بنانے کو کہا تو اس نے کان کے پاس آ کر سرگوشی کی ''خلیفہ جی پتی نہیں ہے'' منّا نے جھڑکا ''تو شربت ہی لے آؤ۔''

حال احوال کے بعد منّا نے کہا ''میں نے تمہیں یوں زحمت دی کہ تم مجھ سے ایک حور خرید لو۔ بہتر حوریں جو مجھے ملیں گیں کیونکہ میں خلق خدا کی بے لوث خدمت کی ہے۔ عبادت بھی کرتا ہوں ان میں سے ایک تم خرید لو۔'' میں سناٹے میں آ گیا۔ مگر سنبھل کے بولا ''میدانِ حشر میں کھربوں لوگ ہوں گے۔ میں تمہیں کیسے تلاش کر کے اپنی حور وصول کروں گا۔'' منّا کمزور سی آواز میں ہنس دیا ''اے کم عقیدہ۔ بھلا لوگ ایک دوسرے کا گریبان کیسے پکڑیں گے؟ ہر چیز ممکن ہو گی۔'' میں سمجھ گیا کہ گھر کا سامان فروخت کرنے کے بعد وہ اپنے حصّہ کی حوریں فروخت کرنے لگا ہے۔ ہمارے بزرگ غلمان، کنیزوں، لونڈیوں کی خرید و فروخت کرتے چلے آئے ہیں تو حوریں خریدنے میں بھلا کیا قباحت ہے۔ اسے حوریں ملیں نہ ملیں کم از کم ایک دوست کی مدد تو ہو جایا کرے گی۔ ہر ماہ اگر میں اس سے ایک عدد حور خرید لیا کروں تو اس کی عزت نفس بھی مجروح نہ ہو گی کم از کم فاقہ کشی سے بچا رہے گا۔ اچھے دنوں پہ مجھ پہ خوب خرچ کیا کرتا تھا۔

باقی صفحہ ۶۴ پر ملاحظہ کیجیے

سرحد پار کی وہ لڑکی

اقبال انصاری
(دہلی، بھارت)

سوسن علیم الدین نے لکھا تھا ''پیارے اقبال پہلے تو یقین ہی نہیں آیا کہ یہ خط تمہارا ہے۔ قطعی غیر متوقع۔ ایک اچھا سا سچ بولوں! تمہارا خط قطعی غیر متوقع تو تھا لیکن جس دن سے تمہیں خط لکھا تھا اسی دن سے بلکہ اسی وقت سے تمہارے خط کا انتظار کرنا شروع کر دیا تھا۔ بڑی تیز خواہش تھی کہ تم میرے خط کے جواب میں کچھ لکھو۔ چاہے ایک ''شکریہ'' ہی لکھو، لیکن لکھو۔۔۔ دیکھوں تو کہ تمہارے ہاتھ سے لکھے کسی لفظ سے کیسی خوشبو آتی ہے۔ تم نے ایک لفظ کیا پورا خط لکھ دیا۔ کچھ خواہشیں بڑی طاقتور ہوتی ہیں، نہیں؟ یہ پڑھ کر بہت اچھا لگا کہ تمہارا وہ افسانہ جسے لاہور سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''افلاک'' میں پڑھ کر میں نے تمہیں خط لکھا تھا وہ تم نے ''افلاک'' کو نہیں بھیجا تھا، بلکہ وہ تمہاری دلی سے نکلنے والے ماہنامہ ''پیش رفت'' میں شائع ہوا تھا اور ''افلاک'' نے وہاں سے لے کر اسے اپنے صفحات کی زینت کیا ہے۔ اس سے تمہیں اندازہ ہو جانا چاہیے کہ تم کیسا لکھتے ہو۔ یہ جان کر اور اچھا لگا کہ تم میرے بارے میں جاننا چاہتے ہو۔

سراپے سے شروع کرتی ہوں۔ صورت شکل معمولی۔ آنکھیں سیاہ لیکن نہ بڑی نہ چھوٹی۔ ہونٹ نہ موٹے نہ پتلے، ناک نہ خوبصورت نہ بھدی، رنگت گندمی، قد پانچ فٹ چھ انچ۔ بدن ٹھیک ٹھاک۔ عمر ۲۶ سال۔ بیچ روڈ پر پانچ کمروں کا اچھا کھلا کھلا مکان۔ بالکنی سے سمندر کا نظارہ ہمیشہ دل فریب۔ فیشن ڈیزائنر ہوں۔ آج میرا ملک اپنی زندگی کی ۶۸ بہاروں سے گزر چکا ہے۔ ان ۶۸ برسوں میں میرے ملک نے بھی زندگی اور سماج کے ہر شعبے میں ترقی کی ہے۔ یہاں کی فی کس آمدنی تمہاری فی کس آمدنی سے زیادہ ہے۔ لیکن خواندگی کے معاملے میں تم ہم سے بہت آگے ہو۔ موصولہ اعداد و شمار کے مطابق تمہاری شرح خواندگی پینسٹھ فی صد ہے، جب کہ اطلاع کے مطابق ہماری شرح خواندگی چالیس فی صد کے آس پاس ہے۔ نئی تعلیم نے خاص کر آئی ٹی نے ہمارے سماج کو بھی متاثر کیا ہے۔ ٹی وی، سینما، تھیٹر، ادب، ثقافت، صحافت، فنونِ لطیفہ، طرزِ حیات یعنی زندگی کے قریب قریب ہر شعبے میں ایک نمایاں تبدیلی آئی ہے، ایک نیا پن وجود میں آیا ہے، ایک نئی سوچ ڈیولپ ہوئی ہے، نئی آوازیں ابھری ہیں، یہ آوازیں طاقتور بھی ہیں اہم بھی۔ اس ضمن میں سب سے خاص بات یہ ہے کہ آج میرے ملک کی اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت کو اپنی قوت، اپنی لیاقت، اپنی استطاعت اپنی اہمیت کا ادراک ہوا ہے۔ اس لیے وہ خود کو مضبوط و محکم آواز اور مثبت و مبرم کارکردگی کے ذریعے Express کر رہی ہے، اپنی وضاحت کر رہی ہے، دنیا کی کسی بھی فعال عورت کی طرح میرے ملک کی فعال عورت بھی اپنی ذات کے باہر اپنا مقام تلاش کر رہی ہے، اپنے گرد و پیش کے کینوس پر اپنی نشان دہی کر رہی ہے، اپنے کو Assert کر رہی ہے، اپنے قرب و جوار کو اپنے وجود، اپنے وژن، اپنی اہلیت، اپنی اہمیت، اپنی وسعت اور اپنی رفعت کا احساس کروا رہی ہے، خود کو تسلیم کروا رہی ہے۔ میرے ملک کی تعلیم یافتہ عورت آج لاشعور کی سطح پر بھی آزادی والا وشیدا ہے اور طلب گار بھی۔ تعلیم نے اسے آج اتنا باشعور کر دیا ہے کہ وہ آزادی کے معنی صرف سمجھنے ہی نہیں لگی ہے بلکہ ''آزادی'' کو نئے معنی دے بھی رہی ہے۔ ابھی اس دن جمیلہ علی سے میری طویل گفتگو ہوئی تھی۔ ڈریس ڈیزائنر ہے اور اس کی ڈیزائن کی ہوئی پوشاکیں وسیم اکرم، شعیب اختر، علی جعفر، علی عظمت، میرا، ارمان علی اور ان جیسے دوسرے اہم اشخاص کے جسموں کی زینت بنتی ہیں۔

دوران گفتگو اس نے آزادی کے بارے میں کہا کہ آزادی اس کے لیے وہ حالت ہے جس میں وہ اپنی پسند کی زندگی گزار سکے، اپنی پسند سے کام کر سکے، اپنی روح، اپنے جسم اور اپنے ذہن کو Express کر سکے۔ وہ کیا کرے، کیا نہ کرے، شادی کرے یا نہ کرے، بچے پیدا کرے یا نہ کرے۔ ان تمام باتوں کا فیصلہ کرنے کا حق اسے ہونا چاہیے اور ان تمام حقوق و اختیارات کے ساتھ اسے سوسائٹی میں عزت کے ساتھ قبول کیا جانا چاہیے۔ اس نے زور دے کر کہا ''میرے لیے آزادی کا مطلب ہے کہ اپنے طور سے اپنی زندگی جینے کے لیے مجھے کسی کی اجازت یا منظوری نہ لینی پڑے۔'' ہندوستانی فلموں کی اور اے آر رحمٰن کی موسیقی کی دیوانی ہے، جیسے میں ہوں۔ شعیب اختر، شاہد آفریدی، عرفان پٹھان، ویریندر سہواگ اور ثانیہ مرزا اس کے پسندیدہ کھلاڑی ہیں، میرے بھی۔ ناول نگار حمیدہ احمد کے لیے آزادی کا مطلب وہ حالات ہیں جن میں وہ اپنے دل کی بات، اپنے خیالات کا اظہار کھل کر بغیر کسی خوف کے کر سکے۔

ابھی حال ہی میں اس نے ایک کثیر الاشاعت میگزین میں ایک مضمون لکھا جس پر کافی لے دے ہوئی۔

اس نے لکھا ''اس بات کا فیصلہ کرنے کا حق خود مجھے ہونا چاہیے میں حجاب پہنوں یا نہ پہنوں۔ کس کو دوست بناؤں، کس کی دوست بنوں۔ یہ حق مجھے بغیر کسی شرط کے حاصل ہونا چاہیے کہ میں جب جی چاہے دنیا میں کہیں بھی جا سکوں، اپنے کسی بھی فعل کے لیے مجھے کسی کی اجازت نہ لینی پڑے، کسی کو جواب دہ نہ ہونا پڑے، اپنی کسی بھی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مجھے کسی کا محتاج نہ ہونا پڑے۔ کسی کی دست نگر ہو کر میں خود کو آزاد کیسے محسوس کر سکتی ہوں؟ مجھے اس باغی ناول نگار سے مکمل اتفاق ہے۔ میری ہی طرح شاہ رخ خان اور امیتابھ بچن کی فلمیں دیکھنے دنیا کے آخری کنارے تک جا سکتی ہے۔

میں نے فیشن ڈیزائنگ کی تعلیم لندن کے سینٹ مارٹن کالج آف آرٹ اینڈ ڈیزائن میں حاصل کی ہے۔ میں آزادی کو ایک وسیع و عریض تناظر میں دیکھتی ہوں۔ آزادی میرے لیے کچھ کرنے یا کچھ نہ کرنے کا غیر مشروط اختیار ہے۔ اپنی شخصیت کا بے جھجک اور بے باک اظہار ہی میرے لیے آزادی ہے۔ دیکھو بات

میں آزادی کی کر رہی ہوں۔۔۔Freedom کی۔۔۔Anarchy (بے نظمی) کی نہیں۔انارکی تو ہر طرح کی آزادی کی دشمن ہے۔انارکسٹ خود اپنا سب سے بڑا غنیم ہوتا ہے۔ میں اپنی نسوانیت، اپنے عورت پن کے ساتھ خود کو محسوس کرنا چاہتی ہوں، خود کو تلاش کرنا چاہتی ہوں، اپنی ذات سے باہر آ کر میں خود کو پانا چاہتی ہوں میں ہمالہ کی سرد پنہائی میں اس کے برفیلے فراز میں خود کو تلاشنا چاہتی ہوں؟ اپنی کھوج میں میں گنگا کے بلند ترین مقام کا سفر کرنا چاہتی ہوں اور خود اپنی کھلی، جاگتی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی ہوں کہ گومکھ، عظیم گنگا کا وہ مقدس مخرج اور اس کا گردوپیش کیسا ہے۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں، محسوس کرنا چاہتی ہوں کہ مجھے اپنی آغوش میں پا کر وہ بلند وبالا گردوپیش کیسا محسوس کرتا ہے۔ میں تمہارے سرسکا کا جنگل میں ٹائیگر کو مستی کے عالم میں چہل قدمی کرتے دیکھنا چاہتی ہوں، جئے پور کی البیلی رنگینیاں اور تاریخ سے نکلی ہوئی خوبصورتیاں دیکھنے کو تڑپ رہی ہوں، میرا بدن اس گلابی شہر کے رنگ برنگے روایتی لباس میں داخل ہونے کے لیے بے چین ہے۔ میں ڈل جھیل کے کنارے بیٹھ کر جہانگیر نامہ پڑھنا چاہتی ہوں تاکہ اس سے اور اس کے مصنف سے ایک ذہنی رابطہ قائم کر سکوں، ان میں اتر سکوں، انہیں سمجھ سکوں۔

میں چاہتی ہوں کہ سرحد پار سے تم لوگ آؤ اور موہن جوداڑو میں وادیٔ سندھ کی قدیم تہذیب کی سیر کرو، ملتان میں ہمارے صوفیوں کے مزاروں کی زیارت کرو۔ میں چاہتی ہوں کہ جس طرح زیارت کے بغیر ہی نظام الدین اولیا اور معین الدین چشتی مجھے اپنے لگتے ہیں، اسی طرح بابا فرید اور بلھے شاہ تمہیں اپنے لگیں۔ میں تمہارے ماحول میں، تمہاری ہوا میں اپنی مہک گھولنا چاہتی ہوں۔ بالکل اسی طرح میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ تمہاری خوشبو میرے ماحول، میری ہوا میں رچ جائے۔ ''یوروپین یونین'' کی طرح ہماری بھی ایک ''ایشین یونین'' ہو تاکہ ''ہماری'' حسیت ''ہمارے'' قلوب ''ہمارے'' ذہنوں اور ''ہماری'' روحوں کو جلا حاصل ہو سکے۔ حقیقی آزادی ایک دوسرے کو نیست و نابود کر کے نہیں ایک دوسرے کو اپنا کر حاصل ہو سکتی ہے۔ حقیقی مسرت ایک دوسرے کے درمیان فاصلے تعمیر کر کے نہیں بلکہ درمیانی فاصلے منہدم کر کے ملتی ہے۔ ایک دوسرے سے الگ ہو کر نہیں، ایک دوسرے میں سما کر حاصل ہوتی ہے۔ کبھی آؤ اور میرے سینے سے لگ جاؤ؟ کبھی مجھے بلاؤ اور اپنے سینے سے لگا لو۔''

خط ختم ہو گیا۔

اور میں اقبال انصاری بہت دیر کے بعد ایک سکتے کے سے عالم سے جب باہر آیا تو مجھے محسوس ہوا کہ اس خط کا ختم ہو جانا ایک ٹریجڈی ہے۔ ایک سانحہ، ایسے ہر خط کا ختم ہو جانا ایک سانحہ ہے۔ ایسے ہر خط کو اور اسے لکھنے والی ہر سوسن کو زمین کے اس سرے سے اُس سرے تک پھیلا ہوا ہونا چاہیے۔ جاری رہنا چاہیے۔

''سوسن'' میں نے آنکھیں بند کر لیں، آسمانی رنگ کا وہ پھول مجھے آسمان کے نیلگوں اوج سے سرگوشیاں کرتا ہوا نظر آیا۔ اور میں سوچنے لگا کہ نفرت کے کاشتکاروں کو یہ سرگوشیاں سنائی کیوں نہیں دیتیں؟

محاوراتِ نو

○●○

''ستم زدہ شوہروں کے نام''

●○●

۱۔ دفتر سے نکلا باورچی خانے میں اُٹکا
۲۔ بیوی کو دیکھ کر میاں رنگ پکڑتا ہے
۳۔ بیاہا روئے بار بار، رونڈوا روئے اک بار
۴۔ میاں کی دوڑ سُسرال تک
۵۔ دو بیویوں میں میاں حرام
۶۔ خدا بیوی کے پاس قبر نہ بنوائے
۷۔ ڈھنڈورا شہر میں بیوی موتی بازار میں
۸۔ بخشو بی سالی۔ میں رنڈوا ہی بھلا
۹۔ ساس کا جلا لسّی بھی پھونک پھونک پیتا ہے
۱۰۔ بیگم ری بیگم تیری کون سی کل سیدھی
۱۱۔ ایک بیوی سے تالی نہیں بجتی
۱۲۔ چلاتی کا نام بیوی
۱۳۔ بیوی کے بول سہانے
۱۴۔ بیوی کا ''میک اپ'' اُترتا ہی نہیں
۱۵۔ بیوی کے بھاگوں ساس مری

نامکمل ضرب المثال مکمل کیجیے

۱۔ چور کی داڑھی میں۔۔۔۔
چور کی داڑھی میں جُوں
۲۔ بھاگتے چور کی لنگوٹی۔۔۔۔
بھاگتے چور کی لنگوٹی اُتر گئی
۳۔ اُلٹے بانس۔۔۔۔
اُلٹے بانس نہ لٹکایا کرو
۴۔ ناچ نہ جانے۔۔۔۔
ناچ نہ جانے کمر میں درد

آپا جمیلہ شبنم
(اسلام آباد)

''ناشُکری''

محمد الیاس (میرپور، آزاد کشمیر)

''آؤ پلاٹوں کی باتیں کریں اور پراپرٹی پراپرٹی کھیلیں۔'' یہ تھا ان چاروں کا اصل مقصدِ حیات اور دین ایمان۔ فرینڈز کارپوریشن کے شراکت دار۔ ممتاز مختار، کبیر اور صغیر۔ ایک ہی دادا کی اولاد۔ پہلے والے دونوں آپس میں سگے بھائی اور اسی طرح دوسرے دونوں بھی ایک ماں باپ کی اولاد۔

دادا، محمد بشیر عرف بابا بشیر پھڑیا، بڑا شریف نجیب اور دیانتدار شخص کے طور پر منڈی میں مشہور ہوا۔ کہا کرتا یہ وطن بھی قدرت کی عجیب کاریگری کا نمونہ ہے۔ ملنے پر آیا تو خون کا ایک قطرہ نہ گرا۔ اور جب مِل گیا تو صدیوں کی کسریں نکل گئیں۔ لہو کی ندیاں بہہ گئیں۔ لنگر کی دال روٹی کھانے والا اس کی خاطر بڑی شان سے جان لڑا دے اور لُوٹ کے کھا جانے والا مُلک میں سو سو کیڑے نکالے......واہ میرے مولا!...... تیرے شان نرالے۔ کیسے کیسے لیڈر دیے، مادر فروش، ماں کی جمع پونجی اُڑائی، برتن بھانڈے بیچے، اب سر کی چھت بھی گروی رکھ دی۔ رنڈی سے یاری نباہنے کو اُس کی تجوری بھر دی...... حلال کی روٹی کمانے والے کے دانتوں سے پسینا نکلے اور حرام سمیٹنے والے کو باردانہ کم پڑ جائے۔

بابا بشیر زندہ نہ رہا، ورنہ دیکھتا کہ اُس کے پوتے کیا گُل کھلا رہے ہیں۔ چاروں کے چاروں شادی شدہ اور اولاد والے۔ کبیر اور ممتاز میں تہرا رشتہ۔ دونوں ایک دوسرے کے بہنوئی اور سالے بھی۔ بلڈرز، ڈویلپرز اور رئیل اسٹیٹ ڈیلرز کے طور پر فرینڈز کارپوریشن کے نام کی فرم رجسٹرڈ کروا رکھی تھی۔ گاہک کو الجھانے ٹھگنے اور گمراہ کرنے کی غرض سے چاروں نے اپنے الگ الگ پراپرٹی کے دفاتر بھی کھول رکھے تھے۔ معروف اخباروں میں اس پارٹی کے پانچ الگ الگ ناموں سے تسلسل کے ساتھ اشتہار شائع ہوتے رہتے۔ اشتہارات کی عبارت میں قرآنی آیات، احادیث یا مشاہیر کے مختصر اقوال بھی بوقتِ ضرورت شامل کر لیے جاتے۔ اس معاملے میں صغیر بڑا ماہر تھا کہ جائیداد کی خرید و فروخت میں دلچسپی رکھنے والوں کو کیسے راغب کرنا ہے۔ پانچ پھندے ہمہ وقت لگے رہتے، وہ بھی دور دور مختلف جگہوں پر۔ کسی نہ کسی میں کوئی نہ کوئی شکار پھنس جاتا۔ چاروں مِل بانٹ کے کھا لیتے۔

اصطلاحات بھی خوب گھڑ رکھی تھیں۔ آٹھ دس لاکھ کی مالیت کے سودے کو مرغا، بیس پچیس والے کو بکرا، تیس پینتیس تک کی ڈِیل کو دُنبہ، پچاس سے ایک کروڑ کے درمیان والے کو وَہیڑہ، دو تین کروڑ کے سودے کو بیل اور اس سے بھی اوپر والے کو یاک کا نام دے رکھا تھا۔

آپس میں گفتگو اِس طرح کی کیا کرتے؛ آج دُنبہ ہی ہاتھ لگا ہے۔ دوسرا کہا کرتا: بیل بڑا منہ زور تھا، لیکن قابو آ ہی گیا...... جب کوئی ہشیار گاہک، ایک بھائی کے چُنگل سے نِکل لیتا لیکن دوسرے، تیسرے یا چوتھے کے جال میں الجھ کر پھنس جاتا تو کاٹ پیٹ کے بعد جشن مناتے ہوئے تبصرہ کرتے۔ صغیر کہتا: ''بکرا، ممتاز اور کبیر کو بہت بُرا بھلا کہہ رہا تھا کہ بڑے بے ایمان ہیں، لوٹ لیتے لیکن میں بچ نکلا......''

سودا برابر آتے ہی اس میں کم سے کم منافع کی حد مقرر کر لیا کرتے۔ ان کے لباس، زیرِاستعمال گاڑیاں اور دفتروں کی تزئین وآرائش دیکھ کر گاہک متاثر ہو جاتا۔ انتہا درجے کے خوش اخلاق، ملنسار اور مہذب۔ خاطر مدارت کرنے میں فراخ دل۔ مہمانوں کے آنے پر دِن کے اور پوچھے موسم کے مطابق تواضع کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ عملے کے ارکان اشارے کنائے اچھی طرح سمجھتے تھے۔ مالکان خود ایسے شیریں کلام کہ تھوڑی دیر کی مجلس میں مہمان کو بے تکلف کر کے، خرید یا فروخت کے پسِ پردہ مقصد اور مجبوری کو بھانپ لیتے۔ فروخت کرنے والے کی ضرورت اور مجبوری کی نوعیت جان کر ہمدردی کا نقاب اوڑھ لیتے اور کہتے: ''مارکیٹ بہت ڈاؤن ہے۔ جینوئین بائر کی تلاش میں وقت لگتا ہے۔ اگر پانچ دس لاکھ روپے سے کام نکل سکتا ہو تو ہمیں اپنا بھائی سمجھیں اور قرضۂ حسنہ کے طور پر قبول کر لیں۔ امید ہے پانچ چھ ماہ تک مارکیٹ تیز ہو جائے گی۔ آپ کو نقصان ہونے کی بجائے اچھا خاصا فائدہ ہو سکتا ہے......''

ایسی ہمدردانہ گفتگو سن کر گاہک گرویدہ ہو جاتا۔ لیکن تین دن کے بُھوکے کو لحۂ موجود میں دال روٹی مل رہی ہو تو اگلے روز کے لیے فائیو اسٹار کا دعوت نامہ موصول ہونے پر صبر نہیں آ جاتا۔ فوری طور پر مصنوعی گاہک کھڑا کیا جاتا۔ اشٹام پر معاہدہ لکھا جانے کے ساتھ ہی موٹی رقم بطور بیعانہ ادا کر دی جاتی تاکہ لُٹ جانے کا احساس ہو جانے پر بھی دوگنا واپسی آسان نہ ہو۔ آخری لمحے تک چرب زبانی کی بلند سطح قائم رہتی۔ ایک کروڑ کے سودے میں بیس پچیس لاکھ کا ٹانکا لگا کر بھی میٹھے رسیلے لہجے میں کہتے: ''ہمارا حقِ خدمت صرف ایک پرسنٹ ادا کر دیں۔ وہ بھی نہ لیتے، لیکن کیا کریں، دفتر کے اخراجات اور تنخواہیں بھی مشکل سے پوری ہوتی ہیں۔ زیادہ کا لالچ کبھی نہیں کیا، بس یہ کہ گزارہ ہو جائے اور آپ جیسے مہربانوں کی خدمت کا سلسلہ جاری رہے۔

سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق اتنی تاخیر کر دیا کرتے کہ کھانے کا وقت ہو جائے۔ ایسی پُرتکلف ضیافت کرتے کہ زخم خوردہ مہمان کی ٹیس، مسکراہٹ میں بدل جایا کرتی۔ فارغ ہونے پر آپس کی گفتگو میں ایک فی صد کمیشن کو اوجڑی اور سری پائے کہا کرتے۔ گویا اچھا بھلا پلا ہوا جانور ذبح کر کے باقیات بھی سمیٹ لیں۔ ایسی مہذب انداز کی نوسربازی کا سلسلہ سرِ بازار چلا رکھا تھا کہ لاکھوں سے کم کی دیہاڑی لگنے پر کاروبار میں مندی ہونے کا تذکرہ چھیڑ دیا جاتا۔

چاروں بھائیوں کی رہائشی کوٹھیاں پوش ایریا کی ایک ہی کشادہ سڑک

پرتھیں۔لیکن اِنھوں نے گھروں سے بہت دورایک لگژری اپارٹمنٹ اورایک محل نما بنگلہ اپنی عیاشیوں کے لیےخرید رکھا تھا۔محفلِ ناؤنوش ہرروز ہی جمتی اور جب جی میں آتا،دادِعیش ونشاط دینے کونئے نئے پیکرِحسن وشباب کااہتمام کرلیاجاتا۔جس مُلک میں حرام کی دولت کےانبارہوں،وہاں گلی گلی میں چکلےکھل جایاکرتے ہیں اور دیس دیس کی رنڈی پہنچ جاتی ہیں۔وطنِ عزیز میں بھی اس جنس کی کوئی کمی نہ رہی۔ہررنگ اورنسل کی،ایک فون کال پر۔اِنھوں نے ہرتجربہ کر دیکھا۔راوی نسل کی پلی پلائی بھینس جیسی چیکیلی سیاہ کالی جلدوالی افریکن سے لے کر دودھ گلاب کی آمیزش میں ڈھلی نازک کومل یورپین۔سانولی سلونی سری لنکن انڈین بنگالن۔چینی چُندھی تھائی چینی،جن سےشغل کریں نہ کریں،دن بھر کی تھکن دور کرنے کومساج ضرور کرواتے۔سب سے زیادہ شوق،تاجک اُزبک لڑکیوں سے کرتے اورایسی ہی ریاستوں سے آئی ہوئی،جن کےمرد،جہادی تنظیموں میں برسرِ پیکار تھے۔

حرام کی دولت سےخوش حالی ضرورآئی لیکن بےحیائی اوربےغیرتی بھی ہمراہ وافر لائی۔کوئی پرواہ نہ رہی کہ وہ چاروں آپس میں چچازاد ہی نہیں،سگے بھائی اورسب سے بڑھ کر یہ کہ سالا بہنوئی بھی ہیں۔مہینے دوسرے یاحد تیسرے میں ایک آدھ یاک بھی ٹریپ میں آجاتا۔تب عشرت کدے میں خوب رنگ رلیاں منانے کومچل جاتے۔پسندیدہ ریاستوں کی نسل تک کروائی جاتی۔پچیس ہزارفی کس کے حساب سےایک لاکھ،علاوہ دیگرلوازمات کے۔تھوڑے،بہت بے غیرت تب ہی ہو گئے تھے،جب موٹرسائیکلوں پر بھاگ دوڑ کر کےکوئی دُکان مکان کرائے پر چڑھانے میں کامیاب ہوجاتے یا چھوٹی موٹی پراپرٹی بیچ کرکمیشن کمالیتے۔چاروں میں ہم آہنگی سلوک اتفاق اور بےتکلفی شروع سے ہی تھی۔صبح تیاری کےمراحل میں کوئی نہانے کی بات کرتا تو دوسرافوراًبلاجھجک سوال کر دیتا: ''غسلِ واجب کامعاملہ آن پڑاہےیاویسے ہی روٹین کانہانادھونا؟'' چاروں میں سےجس کسی میں شرم حیا کی رَمک باقی رہ گئی تھی،لاڈپیار میں لپٹی ڈانٹ پھٹکار کرتے ہوئے کہہ دیتا: ''بےوقوف!سوچ سمجھ کے بات کیا کرو۔کوئی سالا اپنے بہنوئی سے ایسا سوال نہیں کرتا۔'' سالا صاحب کمال ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولتا: ''کیوں!اس سے کیافرق پڑتا ہے؟اماں حوّا سے یہ کام شروع ہوااور جب تک دنیاقائم ہے،جاری رہےگا۔''

کسی بھی موضوع پر بحث ہوتی،یہ چاروں بھری محفل میں لاتعلق رہتے۔مذہب،سیاست،اخلاقیات یاادب میں ذراسی دلچسپی نہ لیتے۔کوئی فلمی کہانی کے پلاٹ پرمبنی جملہ بول دیتاتو فوراًچونکتے ہوکر پوچھ لیتے: کون سے سیکٹر میں؟کس سائزکا؟؟خودصرف پلاٹوں اورپراپرٹی کی باتیں کرتے یاپھرمنہ کاذائقہ بدلنےکونئی نئی گاڑیوں کی۔ان کی اولادیں تباہ ہورہی تھیں۔آٹھ آٹھ دس دس سال کےلڑکےلڑکیاں قیمتی گاڑیوں کوبُری طرح چلاتے۔گھروں کی چھتوں پراکٹھے ہوکر ہلاگلاکرتے،احترام کےمہینوں میں بھی رات کوبلاوجہ ہی سیکڑوں ہزاروں کی آتش بازی پھونک ڈالتے۔مہنگےترین تعلیمی اداروں میں داخلے لےرکھے تھےلیکن دلچسپی صرف ہرجدیدایجاداورآسائش سےجُڑی ہوئی برائی میں لیتے۔

چاروں بیویوں نے بالآخرخوب صلاح مشورہ کر کے فیصلہ کیا کہ دوٹوک بات کی جائے۔پہلے اپارٹمنٹ گئیں لیکن بند پاکرعشرت کدے آپہنچیں۔یوں چھاپا پڑنے پرشوہرحیران پریشان ہو گئے۔اولاد کی اخلاقی بربادی پر بات ہوئی۔ممتازاورصغیرسیخ پاہوکرایک دوسرے کی تقلیدوتائید میں بولنے لگے: ''تم مائیں کس مرض کی دواہو؟کوئی کمی رہ گئی ہےتوبتاؤ۔ہرگھر میں چارچارنوکر دیے ہوئے ہیں ناشکری عورتو!اتناعیش آرام وزیروں سفیروں کی بیویوں کونصیب نہ ہواہوگا۔''

سب سے بڑی خاتون،باقی تینوں کی بھی نمائندگی کررہی تھی۔اپنے شوہر،کبیرکومخاطب کر کے بولی: ''تم چاروں بھائیوں کوکیا کمی رہ گئی ہے جو یہاں کرائے کی عورتوں کے ساتھ منہ کالاکرتے ہو؟ہم کس لیے ہیں؟ہمیں کیوں قید کر رکھا ہے؟'' وہ منہ پھاڑ کے بول پڑا: ''تو دفع ہو جاؤ،کس نے روکا ہے؟تم چاروں منہ لال کرلیاکرویانیلا پیلا.....''

مجھے جواب دو

انوارانجم
(مالیر کوٹلہ، بھارت)

''**پاپا!** بتاؤ نا میں کب چلنے پھرنے لگوں گی۔۔۔میرا من کرتا ہے کہ امن بھائی کی طرح میں بھی کھیلوں۔۔۔اس کے پیچھے پیچھے بھاگوں۔اس لیے جلدی بتایئے پاپا کہ میں کب چلنےلگوں گی۔'' جب بھی میری بیٹی خوشبو کے یہ الفاظ میرے کانوں میں پڑتے ہیں تو مجھ پر جیسے بجلی سی گر جاتی ہے۔میں گم سم کھڑا رہ جاتا ہوں۔میری آنکھیں خود بخود آنسوؤں سے بھیگ جاتی ہیں۔سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنی پھول جیسی بچی کو اس کے سوالوں کا کیا جواب دوں۔

خوشبو کی باتیں سُن کر نہ صرف میں بلکہ میری بیوی پرم جیت کور اور گھر کے تمام افراد اُداس نگاہوں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگتے ہیں۔سبھی کی آنکھوں میں آنسو بن بلائے مہمان کی مانند آجاتے ہیں کیونکہ ہمارے پاس خوشبو کے ان سوالوں کا جواب ہے ہی نہیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ جب خوشبو پیدا ہوئی تو اُسے نہ جانے کیسے آکسیجن کی کمی رہ گئی۔ڈاکٹر کا اس جانب دھیان نہیں گیا جس کی وجہ سے خوشبو کے دماغ کی چند نسیں دب گئیں۔اس کا اثر خوشبو کی ٹانگوں پر پڑ گیا اور وہ کمزور رہ گئیں۔شروع میں تو ہمیں اس بات کا کوئی احساس نہیں ہوا لیکن جیسے جیسے خوشبو بڑی ہوتی گئی تو ہمیں پتہ چلتا گیا کہ یہ بہت بڑی کمی ہے۔کیونکہ جس عمر میں بچے گھٹنوں کے بل چلنے لگتے ہیں خوشبو اچھے طریقے سے اپنی ٹانگوں پر بیٹھ بھی نہیں پاتی تھی۔عمر بڑھنے کے ساتھ اس کی ٹانگوں میں مزید کمزوری آتی گئی۔وہ تھوڑی اور بڑی ہوئی تو اس کی ٹانگوں نے چلنے پھرنے سے بالکل ہی جواب دے دیا۔اس طرح خوشبو بیچاری بالکل ہی لاچار ہو کر رہ گئی۔

جب خوشبو کا چھوٹا بھائی امن گھر میں اچھل کود کرتا ہوا اِدھر اُدھر بھاگتا پھرتا ہے تو خوشبو اُسے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی رہتی ہے لیکن کبھی کبھار اُسے امن کا یوں اُچھلنا کودنا گوارا نہیں ہوتا تو وہ آپے سے باہر ہو جاتی ہے اور چیخ چیخ کر آسمان سر پہ اُٹھا لیتی ہے اور ضد کرنے لگتی ہے کہ اُسے بھی امن کے ساتھ کھیلنا ہے۔پھر وہ فلک شگاف چیخوں کے ساتھ رونے لگتی ہے جسے سن کر پتھر دل انسان بھی موم ہو جائے۔ہم سبھی سے اُس کی یہ دلدوز چیخیں برداشت نہیں ہوتیں لہٰذا سبھی اپنے آنسوؤں کو اپنی پلکوں میں چھپائے خوشبو کو حوصلہ دینے لگتے ہیں۔

''خوشبو بیٹا! ڈاکٹر آنٹی نے کہا ہے کہ تم بہت جلدی چلنے پھرنے لگو گی بالکل اپنے بھائی امن کی طرح۔۔۔!!''

خوشبو سبھی کی باتوں کو غور سے سنتی رہتی ہے اور پھر ایک ایک سے سوال کرتی ہے،''سچ کہہ رہے ہو نا پاپا۔۔۔میں سچ مچ بھیا کی طرح چلنے پھرنے لگوں گی؟''

''مما! پاپا جھوٹ تو نہیں بول رہے؟'''' بڑے پاپا آپ ہی بتاؤ مجھے آپ کی باتیں سچی لگتی ہیں کیا میں جلدی چلنے پھرنے لگوں گی یا نہیں؟''

غرض خوشبو ہر کسی سے تسلی چاہتی ہے جیسے اُسے ہماری باتوں پر یقین ہی نہ ہو۔

دراصل اس میں خوشبو کا بھی کوئی قصور نہیں ہے وہ شروع سے ہی یہی کچھ تو سنتی آرہی ہے۔لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ہم نے خوشبو کا علاج نہیں کروایا۔

ہم شروع سے ہی اس کے علاج کے لیے جس ڈاکٹر کے پاس بھی گئے سبھی نے ہمیں تسلی دی کہ خوشبو بہت جلد ٹھیک ہو جائے گی اور اچھی طرح چلنے پھرنے لگے گی۔ہم ڈاکٹروں کی بات پہ بھروسہ کر لیتے اور اس کا علاج کروانے لگتے۔کئی ماہ تک کسی ایک ڈاکٹر سے اس کا علاج جاری رہتا۔مہنگی سے مہنگی دوائیاں منگوائی جاتیں مگر اس کے باوجود جب کوئی فرق نہ پڑتا تو ہم اُس ڈاکٹر کا علاج چھوڑ دیتے۔پھر دوسرے ڈاکٹر کا علاج شروع ہو جاتا۔وہ بھی خوشبو کے ٹھیک ہونے کی پوری گارنٹی لیتا۔ہم اس کی باتوں پر بھروسہ کرتے ہوئے اُس سے خوشبو کا علاج کرواتے رہتے مگر جب خوشبو کی حالت میں کوئی سدھار نہ آتا تو اس کا علاج بند کر دیتے۔پھر کوئی دوست یار شتے دار کسی دوسرے ڈاکٹر کا پتہ بتا دیتا تو ہم اُس سے خوشبو کا علاج کروانے لگتے۔مگر خوشبو کی حالت ویسی کی ویسی رہتی کوئی فرق نہ پڑتا۔اس طرح یہ سلسلہ ایسے ہی چلتا رہتا۔

ہم نے اب تک لاکھوں روپے خوشبو کے علاج پر خرچ کر دئے۔اگر خوشبو ٹھیک ہو جاتی تو کوئی بات نہیں تھی مگر وہ بیچاری تو اسی طرح لاچار ہے اس لیے میری بیوی پرم جیت کور اور میں خوشبو کو اس حال میں دیکھ کر اندر ہی اندر گھلتے رہتے ہیں۔بلکہ پرم جیت تو مجھ سے بھی زیادہ غم برداشت کیے جارہی ہے۔کیونکہ میں تو صبح ہوتے ہی اپنی سروس کے سلسلے میں دور کے ایک گاؤں کے لیے نکل پڑتا ہوں۔اور بیچاری پرم جیت جو کہ ایک پرائیویٹ کالج میں لیکچرار کی اچھی خاصی جاب کر رہی تھی نے یہ سوچ کر اپنی نوکری چھوڑ دی کہ اب خوشبو کو اس کے سہارے کی زیادہ ضرورت ہے۔یوں تو کسی سے بھی خوشبو کا دکھ نہیں دیکھا جاتا مگر پرم جیت کو تو خوشبو کے دُکھ نے گھن کی مانند اندر ہی اندر کھانا شروع کر دیا ہے۔پھر بھی وہ اُف تک نہیں کرتی کیونکہ ماں کا دل ہی خدا نے ایسا بنایا ہوتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو تکلیف میں دیکھ کر تڑپ اٹھتی ہے مگر اُف تک نہیں کرتی۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ پرم جیت کی ڈیوٹی بھی کتنی کٹھن ہے صبح سویرے سبھی گھر والوں سے پہلے نیند سے بیدار ہو جانا، سب کے لیے کھانا بنانا، امن اور خوشبو کو تیار کرنا۔حالانکہ امن دیپ تو خود ہی نہا لیتا ہے لیکن خوشبو کے سبھی

کام تو پرم جیت کو ہی کرنے پڑتے ہیں۔بستر پہ لٹانا،بستر سے اٹھانا،واش روم کے سبھی کام اُس کے کپڑے بدلنا،بالوں میں کنگھی کرنا اور اسکول یونیفارم پہنا کر کھانا کھلانا،سکول کے لیے تیار کرنا سبھی کام پرم جیت ہی تو کرتی ہے کیونکہ وہ نہیں چاہتی کہ کوئی بھی خوشبو کو ایک بوجھ سمجھے۔

صبح سویرے جب سکول وین گھر کے باہر آ کر ہارن بجاتی ہے تو پرم جیت بھاگ کر خوشبو کو گود میں اٹھا کر وین میں بٹھا آتی ہے۔سکول میں خوشبو کو کوئی تکلیف نہ ہو اس لیے وہاں بھی ہم نے اس کے لیے علیحدہ ٹرائی سائیکل رکھی ہوئی ہے اور اس کی دیکھ بھال کے لیے ایک آیا کا انتظام کیا ہوا ہے جو کہ اُسے وین سے اٹھا کر ٹرائی سائیکل میں بٹھا کر اُس کے کلاس روم میں پہنچاتی ہے۔یہی آیا اُسے واش روم وغیرہ لے کر جاتی ہے۔غرض کہ ہم نے ہر طرح سے خوشبو کا خیال رکھا ہوا ہے تا کہ وہ کسی طرح کے احساس کمتری کا شکار نہ ہو اور کوئی ایسی ویسی بات اس کے من میں نہ جائے۔

خوشبو پڑھائی میں بہت اچھی ہے۔کلاس میں جو طلباء اچھے نمبروں سے پاس ہوتے ہیں اُن میں خوشبو بھی شامل ہے۔سکول سے گھر آنے کے بعد وہ ہوم ورک کرنے کے علاوہ کئی گھنٹے تک اپنی سٹڈی بھی کرتی ہے۔سکول میں بچوں کو کھیلوں میں حصہ لیتے دیکھ اُس کا من بھی کرتا ہے کہ وہ بھی اپنے ساتھیوں کی طرح کھیلے۔گھر آ کر وہ ایک ہی سوال کرتی ہے کہ میں کب چلنے لگوں گی؟ تو خاموش رہنے کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں ہوتا۔وہ بیچاری بھی ہمیں چپ دیکھ کر کچھ نہیں کہتی بس تھوڑا اُداس ہو جاتی ہے اور اس کی آنکھوں سے گر رہے آنسو اس کے دل کی کیفیت ہم پر واضح کر دیتے ہیں۔

اب تو خوشبو پورے بارہ برس کی ہو چکی ہے ابھی پچھلے مہینے ہی تو ہم نے اس کا برتھ ڈے نہایت دھوم دھام سے منایا تھا۔لگتا ہے اب وہ کچھ زیادہ ہی سیانی ہو گئی ہے۔اس لیے پہلے کی نسبت زیادہ مایوس رہنے لگی ہے۔اُداسی اس کے چہرے پر ہمیشہ چھائی رہتی ہے۔وہ اکثر حسرت بھری نگاہوں سے دوسرے بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھتی رہتی ہے خاص طور پر اپنے چھوٹے بھائی امن کو چلتے پھرتے دیکھتی ہے تو اس کا بھی دل کرتا ہے کہ وہ بھی اُس کی طرح چلے پھرے اور خوب اُچھل کود کرے وہ بھی امن کی طرح بنے جو ابھی گھر کے اندر ہے تو ابھی باہر ابھی بیڈ کے اوپر ہے تو ابھی نیچے۔اس طرح اُچھل کود کرتے ہوئے کئی مرتبہ امن کے چوٹیں بھی لگی ہیں۔خوشبو کا دل بھی کرتا ہے کہ کاش وہ بھی اتنی اُچھل کود کرے کہ اس کے جسم کے مختلف حصوں پر چوٹیں آ جائیں۔وہ جب امن کو سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھتی ہے تو اس کے اندر سے ایک ہوک سی اُٹھتی ہے۔اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ بھی اس کی طرح سیڑھیاں چڑھے۔پھر وہ ایسے دردناک طریقے سے روتی ہے کہ ہم خود پہ کنٹرول نہیں رکھ پاتے اور سبھی رونے لگتے ہیں۔لیکن پھر اپنے دلوں کو سنبھالتے ہیں اور اپنے اشکوں کو صاف کرتے ہوئے خوشبو کو حوصلہ دینے لگتے ہیں۔وہ سمجھ جاتی ہے،بہل جاتی ہے اور سوچنے لگتی ہے کہ بہت جلد وہ اپنے پیروں پہ چلنے لگے گی،معصوم جو ٹھہری۔

لیکن اب ہمیں نہ جانے کیوں ایسا لگنے لگا ہے کہ شاید خوشبو زندگی میں اب کبھی چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہو پائے گی۔اُس کا علاج کروا کروا کے ہم تھک چکے ہیں اندر سے ٹوٹ چکے ہیں۔روشنی کی کرن اب ہمیں نظر نہیں آتی۔اس کے اپاہج پن کا ایک انجانہ خوف ہم پر ہمیشہ طاری رہتا ہے کہ وہ اس حال میں پہاڑ جیسی طویل زندگی کا سفر کیسے طے کر پائے گی۔اس کی یہ حالت دیکھ کر پرم جیت اندر سے ٹوٹ چکی ہے میں نے اکثر اُسے تنہائی میں روتے ہوئے دیکھا ہے۔وہ اکثر گم سم رہتی ہے ایک عجیب سا اضطراب اس کے چہرے پر ہمیشہ دیکھنے کو ملتا ہے کیونکہ خوشبو کا یہ دُکھ اب اس کے لیے نا قابلِ برداشت ہو گیا ہے۔

مجھے ابھی ایک جانی پہچانی آواز پھر سے سنائی دے رہی ہے۔وہی آواز میرے کانوں سے ٹکرانے لگی ہے۔لگتا ہے خوشبو پھر سے بگڑ گئی ہے۔وہ بلند آواز سے چیخ رہی ہے۔شاید مجھے ہی پکار رہی ہے اور وہی سوال دہرا رہی ہے۔

''میں کب چلنے لگوں گی پاپا۔۔۔آج مجھے سچ سچ جواب دو۔۔۔بولو نا پاپا۔۔۔میں کب چلنے لگوں گی؟''

یہ کیا میری آنکھوں سے آنسو خود بخود چھلکنے لگے ہیں۔کیوں کہ مجھے پتہ ہی نہیں ہے کہ میں اپنی پھول جیسی بٹیا کو اُس کے سوال کا کیا جواب دوں۔۔۔میں تھک چکا ہوں۔میں ٹوٹ چکا ہوں۔مجھ میں اپنی بیٹی کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے۔کیوں کہ میں اس کے سوال کا جواب ہی نہیں دے سکتا۔کیا آپ کے پاس میری بیٹی کے سوال کا جواب ہے؟

- بقیہ -

اوورکوٹ

پڑی جس کی پشت پر رابرٹ کا اوورکوٹ ٹنگا تھا۔شاید اس نے گھر پہنچ کر اپنا کوٹ لا پرواہی سے اس پر پھینک دیا تھا۔کوٹ کی ایک آستین کرسی کی پشت سے لٹک رہی تھی۔کھڑکی سے آنے والی ہلکی ہوا سے اس میں ارتعاش پیدا ہو رہا تھا اور وہ بہت آہستگی سے ادھر ادھر ہل رہی تھی۔اس نے دیکھا کہ اسکا کف بری طرح بوسیدہ ہو گیا تھا اور اس میں سے کچھ ادھڑے ہوئے تاگے نکل رہے تھے۔اس کے استر کا ایک ٹکڑا جو بدرنگ ہو چکا تھا آستین سے جھانک رہا تھا۔یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسا اس بدقسمت شخص کا تھا جو اسے ٹرین میں ملا تھا۔یہ دیکھ کر ان کا دل بیٹھ گیا اور وہ ایک ایسے احساسِ شرمندگی کے سمندر میں ڈوب گئیں کہ بڑی دیر تک وہ اس کیفیت سے نہیں نکل سکیں اور ان کو بے اختیار رابرٹ پر پیار آ گیا۔

کم سِن کلی

شاہد رضوان
(چیچہ وطنی)

بڑی کوٹھی کے گیٹ پر کال بیل بجی۔بیگم نے گیٹ کھولا۔بہت کم ایسا ہوتا، جب بیگم گیٹ کھولتیں۔ اکثر یہ کام بوڑھا چوکیدار ہی سرانجام دیتا۔ایک تنومند گوراچٹا، مضبوط کاٹھ کا نوجوان گاڑی پارک کر کے اترا تو بیگم کی دل فریب مسکراہٹ نے اس کا استقبال کیا۔یہ نوجوان کون ہے؟۔کہاں سے آتا ہے۔رئیس صاحب کی غیر موجودگی میں ہی کیوں آتا ہے؟۔ملازموں کواس سے کوئی سروکار نہ تھا۔بڑے گھروں کی بڑی باتیں۔ان کو کیا لینا دینا تھا۔یہ نوجوان پہلی بار نہیں آیا تھا۔جب سے بیگم بیاہی آئی تھی،تب سے اس کا آنا جانا تھا۔گھریلو ملازمین جس قدر بھی آنکھیں بند رکھیں اور معاملے سے دور ہی کیوں نہ رہیں، کچھ چیزیں محسوس ضرور کرتے ہیں۔بظاہر گونگے بہرے اور اندھے نظر آتے ہیں،لیکن ایسے ہوتے نہیں۔کچھ باتیں ضروران کے دل و دماغ پر کوڑے برساتی تھیں۔مثلاً جب یہ نوجوان پہلی بار آیا تھا تو اس کے پاس موٹر بائیک تھی۔اب گاڑی ہے۔ان کا خیال تھا تھا کہ بیگم نے ہی اس کو گاڑی لے کر دی ہے۔جب نوجوان آتا ہے،بیگم خود گیٹ کھول کر اس کا استقبال کرتی ہیں۔اپنے ہاتھ سے چائے پانی پیش کرتی ہیں۔کھانے پینے کی چیزوں میں تعدد اور تلون کے ساتھ ساتھ خاصا تکلف سے کام لیا جاتا ہے۔عام گھریلو استعمال کے برتن ایک طرف کر دیے جاتے اور نئے سیٹ لگائے جاتے ہیں۔وہ نوجوان صبح آتا تو دو پہر تک بلا جھجک بیٹھا رہتا، جیسے اسے فرصت ہی فرصت ہو۔نہ کسی کا ڈر نہ خوف۔

کنیز اوپر کی منزل پر کام کاج میں مصروف تھی۔اسے نوجوان کے آنے کی مطلق خبر نہ ہوئی۔وہ ہر کمرے کی جھاڑ پونچھ کے بعد بلا جھجک بیگم کے کمرے کا پردہ ہٹا کر اندر جا گھسی۔اس کی ننھی معصوم کچی بے گناہ آنکھوں نے وہ دیکھا، جو اسے نہیں دیکھنا چاہیے تھا۔اس نے بیگم کو اس عالم میں کبھی رئیس صاحب کے ساتھ بھی نہ دیکھا تھا۔بیگم اسے دیکھ کر غصے سے پھنکاری:''دفعہ ہو جاؤ۔۔۔بے شرم۔۔۔''وہ مارے شرم کے برق رفتاری سے پچھلے پاؤں مڑ کر باہر نکل گئی۔مارے خوف کے اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔اسے پتا تھا کہ بیگم معاف کرنے والی نہیں۔کچا چبا جائے گی۔اسے اچھی طرح یاد تھا،ایک بار جب شیشے کا جگ ٹھوکر لگنے سے ٹوٹ گیا تھا تو بیگم نے کس طرح اس کو جونڈے سے پکڑ کر اس کے سر کو ہلارے دیے تھے۔اس کو چکر آ گئے تھے۔پھر اس کے کلیوں کی طرح نرم و نازک منہ پر تابڑ توڑ تھپڑ بھی مارے تھے۔وہ دوسری منزل پر ایک کمرے میں سہم کر بیٹھ گئی۔چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔

رسوائی کا خوف،کوٹھی کی عزت،رئیس صاحب کا کروفر،ان کی اونچی ناک۔۔۔یہ سوچ کر بیگم کی آنکھوں کے سامنے طوفان آ گیا۔نوجوان تو ابھی کچھ دیر اور رکنے کا ارادہ رکھتا تھا،مگر بیگم کی اندرونی کشمکش نے اسے جلدی جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

''کجو۔۔۔کجی۔۔۔''نوجوان کے جاتے ہی بیگم چلائی۔بیگم کی تحکمانہ بھاری بھر کم آواز سن کر وہ بے چاری گھبرا گئی۔بیگم کے سامنے آنے سے اس کی جان نکل رہی تھی۔

''کجو۔۔۔کجو۔۔۔''اس نے کوئی جواب نہ دیا تو بیگم پھر چلائی۔

''باجی اوپر ہوں''کنیز کے گلے سے رندھی ہوئی آواز نکلی،جیسے وہ رو رہی ہو۔

''کہاں مر گی ہو،نیچے آؤ۔۔۔''وہ بے چاری آلتو جلالتو آئی بلا ٹالتو' زیر لب پڑھتی زینہ اترنے لگی۔اس کا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔

''جی۔۔۔''آخری زینے سے اترتے ہوئے اس نے بیگم کو اپنے آنے کی اطلاع دی۔بیگم کوری ڈور میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔

''کم بخت تجھے عقل کب آئے گی۔جب دل چاہتا ہے منہ اٹھائے کمرے میں چلی آتی ہو''کنیز کو دیکھتے ہی وہ کاٹ کھانے کو دوڑی۔

''باجی مجھے کیا پتا۔۔۔''؟وہ اپنی بات پوری نہ کر پائی تھی کہ بیگم نے اسے جونڈے سے پکڑ کر ایسے دبوچا،جیسے قصائی مرغی کو دبوچتا ہے۔اس کی گردن اپنی ٹانگوں میں دبا کر اس کی نازک کمر پر تھپڑوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔وہ بیچاری درد سے بلبلا اٹھی۔بیگم نے اس کی آہ وفغاں پر کان نہ دھرے۔وہ مار کھاتی رہی ،چیختی رہی، چلاتی رہی اور گھٹ گھٹ کر آنسو پیتی رہی۔مار کھا کھا کر اس کی کمر دہری ہو گئی اور چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا۔بے بسی سے آنکھوں میں طوفان امڈ آیا،لیکن کھل کر رو بھی نہ سکی۔آنسوؤں کا ذخیرہ گلے میں پھانس بن کر اٹک گیا تھا۔بیگم نے تب چھوڑا، جب اس کے ہاتھ تھک گئے۔وہ نیم بسمل تڑپتی رہی،زخم سہلاتی رہی روتی رہی۔بیگم نے کھنکار کر تھوکا اور جھنجلا کر ایک بار پھر چلاّئی:''خبردار!اگر تو نے کسی کے سامنے زبان کھولی۔۔۔زندہ درگور کروادوں گی مشٹنڈی کو''۔

''نہیں بتاتی۔۔۔۔''اس نے مجرموں کی طرح چھوٹے چھوٹے ہاتھ بیگم کے سامنے جوڑتے ہوئے معافی مانگی۔ایک بار معاملہ رفع دفع ہو گیا تھا۔اس کو ہلکا ہلکا بخار ہو رہا تھا اور بدن دکھ رہا تھا۔اس کو رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ بیگم کہیں نکال ہی نہ دیں۔اگر نوکری چھوٹ گئی تو کیا ہوگا۔یہاں تو کھانے پینے کو وافر ملتا ہے،آگے پتا نہیں کچھ ملے گا بھی یا نہیں۔اس سے چھوٹی بھی کام کرتی تھی۔باپ سر پر نہیں تھا۔بھائی اللہ نے دیا نہیں تھا۔ماں دمے کی مریض تھی،نوکری چھوٹ جانے کے خیال نے اس کے دل کو دہلا دیا تھا۔وہ خود کو قصوروار سمجھ رہی تھی اور اس وقت کو کوس رہی تھی، جب اس نے دستک دیے بغیر بیگم کے

کمرے میں قدم رکھا تھا۔

وہ کبھی کسی کو کچھ نہیں بتائے گی، اس نے دل میں گرہ دے لی تھی۔

بیگم اپنی جگہ پر سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی۔ وہ بتائے گی یا نہیں۔ زبان کھولے گی یا نہیں۔ بچی کا کیا اعتبار۔۔۔ ایسی بات تو اچھے بھلے ہضم نہیں کر پاتے، وہ تو پھر بچی ہے۔ اگر اس نے زبان کھول دی، تو سفید کوٹھی پر کالک لگ جائے گی، وہ تو معاف کرنے والے نہیں۔ میں ایک دم ملکہ سے مطعلقہ ہو کر رہ جاؤں گی۔ پھر اس نے اپنے آپ سے کہا، غلط کیا بچی کو مارنا نہیں چاہیے تھا۔ اس کو روپے پیسے یا کھانے پینے کا لالچ دینا بہتر تھا۔ مار کھا کر تو انسان ضدی اور چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ جس کام سے روکو وہی کرتا ہے۔ بیگم اپنے کیے پر پشیمان ہو رہی تھی، اور سوچ رہی تھی کہ کنیز نے منہ کھول دیا تو کیا بنے گا۔

اسی محلے کی ایک کوٹھی میں اس کی چھوٹی بہن کام کرتی۔ دونوں بہنیں اکٹھی آتی جاتی تھیں۔ چھوٹی پہلے کام نپٹا کر آ جاتی تو دونوں گھر کی راہ لیتیں۔ چھوٹی کے آتے ہی وہ حسبِ معمول بیگم سے اجازت لینے گئی۔ اس نے چھوٹی کو لان میں ہی کھڑا کر دیا۔ دوپہر سے اب تک وہ بیگم کے سامنے نہ گئی تھی اور چپکے چپکے اپنے زخم سہلاتی رہی تھی۔ اس نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں تھا۔

اس کو اپنی طرف آتا دیکھ کر بیگم کھل اٹھی اور چہرے پر مسرت کی پپڑی جما کر خوش دلی بولی: ''میرے پاس آؤ، تم تو میری چھوٹی بہن ہو۔ بڑی بہنیں مار ہی لیتی ہیں۔'' بیگم نے اس طرح پچکار کر اس کی بلائیں لیں اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، گویا کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ دس روپے کا نوٹ اس کے دوپٹے کے کونے سے باندھ دیا۔ ڈھیر سارا بچا کھچا کھانا دیا اور ہاتھ میں پھلوں سے بھرا شاپر پکڑاتے ہوئے شفقت سے کہا: ''دیکھو! بچی کسی کو کچھ بتانا نہیں''۔ یہ لمحہ قابلِ دید تھا۔ بیگم اپنی ہی ملازمہ سے بھیک مانگ رہی تھی۔۔۔ اپنی آبرو کی بھیک۔

ان کی آواز میں نرمی اور اپنائیت تھی۔ ایک وقت تھا جب بیگم ذرا ذرا سی بات پر ڈانٹ ڈپٹ کیا کرتی تھی اور وہ بیگم کی خوشامدیں کیا کرتی تھی۔ آج وہی بیگم اور وہی کنیز تھی، لیکن آج بیگم اس کی خوشامدیں کر رہی تھی۔

غریب آدمی کی اوقات ہی کیا ہے۔ روٹی پر راضی ہو جاتا ہے۔ اپنے آقا کی ایک مسکان پر مرمٹتا ہے۔ کوئی اس سے ہنس کر بات کر لے تو سارے غم اور کدورتیں بھول جاتا ہے۔ کشور نے بیگم کو اس قدر مہربان پایا تو غصہ تھوک کر کوٹھی سے باہر نکل آئی۔ وہ تو چلی گئی لیکن بیگم وسوسوں کے سیلاب میں بہہ رہی تھی۔

رئیس صاحب نے شرعی آڑ میں چار بیگمات رکھی ہوئی تھیں۔ ایک دور کھیل بھی تھیں۔ منہ سلونا کرنے کلب بھی جایا کرتے تھے۔ نامی گرامی طبیب ان کا ذاتی معالج تھا، اسی کے تیار کردہ کشتہ جات کھا کھا کر عمرِ رفتہ کو آوازیں دیتے رہتے تھے۔ کبھی ایک بیگم تو کبھی دوسری بیگم کے پاس جاتے۔۔۔ بعض اوقات تو مہینوں تک کسی ایک کے پاس بھی نہ پھٹکتے تھے۔

بیگم رات بھر سوچتی رہی: امید تو ہے کنیز کسی کو کچھ بھی نہیں بتائے گی۔ پھر خیال آتا کیا پتا بتا دے۔ اگر بتا دیا تو۔۔۔ وہ کسی اور کو بتائے نہ بتائے، اپنی چھوٹی بہن کو تو ضرور بتائے گی۔ بیگم سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی اور نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

کنیز صبح کوٹھی آتے وقت، گلی میں گیٹ کے سامنے ایک بڑی عمر کی عورت سے گپیں ہانک رہی تھی۔ چھوٹی بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ عورت بھی اسی گلی کی ایک کوٹھی میں کام کرتی تھی، اور اس کی اپنی جھونپڑی اسی محلے میں تھی، جہاں کنیز اپنی ماں اور بہن کے ساتھ رہتی تھی۔

بیگم بالکونی سے دیکھ کر آگ بگولہ ہو گئی، اسے لگا جیسے کنیز ان کو کل والی بات چٹخارے لے لے کر سنا رہی ہو۔ وہی چور کی داڑھی میں تنکے والی بات۔ ایک عورت جب دو عورتوں کو اکٹھا دیکھتی ہے تو یہی سمجھتی ہے کہ جیسے اس کی چغلیاں کی جا رہی ہوں۔

''ان سے کیا باتیں کر رہی تھی، کچھ بتایا تو نہیں''؟ گیٹ کے اندر داخل ہوتے ہی بیگم نے اس سے تفتیش شروع کر دی تھی۔ ''کچھ نہیں بتایا، ہم تو اپنی باتیں کر رہی تھیں''۔ کنیز نے اپنی صفائی دی۔ سچ میں بہت قوت ہوتی ہے، اور وہ اپنا آپ منوا کے ہی رہتا ہے۔ بیگم کو کچھ شانتی تو ہوئی، مگر وہ ایک بار پھر تنبیہہ کرنا نہ بھولی: ''کسی کے سامنے منہ نہیں کھولنا۔۔۔ اور آتے جاتے آپس میں گٹ پٹ کرنے کی ضرورت نہیں۔۔۔ منہ دھیان آیا جایا کرو۔۔۔ وقت بہت خراب ہے۔۔۔ کوئی کسی کا دوست نہیں۔۔۔ وہی عورت ایک دن مجھے کہتی تھی کہ کنیز کو نکال کر مجھے رکھ لو۔ میں نے کہا نہیں، کنیز تو بہت اچھی لڑکی ہے، میں اس کو کیوں نکالوں۔۔۔''؟

اس کے دل کو اپنی طرف سے صاف کرنے کے لیے بیگم نے ایک اور چال چلی تھی۔ وہ کام کاج میں لگ گئی تھی۔ بیگم رہ رہ کر یہی سوچ رہی تھی، اس نے اپنی بہن اور اس عورت کا کچھ بتایا ہوگا یا نہیں۔۔۔ سوفی صد اس کا دل کہتا تھا کہ ضرور بتایا ہوگا اور وہ بھی چٹخارے لے لے کر۔ اس لڑکی کو گھر سے نکال دینا ہی بہتر ہے۔ اگر رئیس صاحب کو پتا چل گیا۔۔۔ تو دیوار میں چنوا دی جاؤں گی۔ آخر تو ایک عورت ہوں ناں۔ میں تو ان سے یہ بھی نہیں کہہ سکتی، کہ آپ میرے حقوق پورے نہیں کرتے۔ وہ خود تو طرح طرح کی منڈلیوں کی سیر کرتے پھرتے ہیں، لیکن یہ نہیں سوچیں گے کہ میں بھی انسان ہوں، کچھ میرے بھی جذبات اور فطرتی تقاضے ہیں۔ سوچوں کی مسافت تھی کہ ختم ہونے میں نہیں آتی تھی، اور منزل کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ میری عزت۔۔۔ اس سے بڑھ کر کوٹھی اور رئیس صاحب کی ناک۔۔۔ اس فکر انگیخت کشمکش کے بعد بیگم نے شام جاتے وقت کنیز کا حساب چکتا کر دیا تھا۔

کہتے ہیں نا کہ ایک در بند ہوتا ہے تو سو در کھل جاتے ہیں۔ ساتھ والی کوٹھی میں اسے جگہ مل گئی تھی۔ اسے ایک دن بھی بیکار نہیں بیٹھنا پڑا تھا۔ اس کو اپنی نظروں سے دور دھکیل کر بیگم سمجھ رہی تھی کہ اس نے دودھ میں نہا لیا ہے۔ جب

اس کو پتا چلا کہ وہ ساتھ والی کوٹھی میں کام کرتی ہے، تو وہ تلملا اٹھی۔ غصے سے دل میں بھانبڑ مچنے لگے۔ اس نے تو سوچا تھا کہ موئی کہیں دور دفع ہو جائے گی۔ وہ تو اس کی چھاتی پر مونگ دلنے کے لیے دیوار کے دوسری طرف بیٹھی تھی۔

یہ لڑکی تو مجھے محلے میں کہیں کا نہیں چھوڑے گی۔ سب کچھ سچ سچ بک دے گی۔ غلط کیا۔۔۔ اس کو نکالنا نہیں چاہیے تھا۔ جب ایک دو ماہ گزر جاتے، بات خود ہی آئی گئی ہو جاتی۔ پھر چاہے اس کو نکال دیتی۔ روزانہ آس پاس کی کوٹھیوں میں کسی نہ کسی تقریب میں جانا ہی پڑتا ہے، میں کس منہ سے بیگمات کا سامنا کروں گی۔ وہ آپس میں میری باتیں کیا کریں گی، میں ان کا منہ ہی دیکھتی رہ جایا کروں گی۔ ان میں سے کوئی میری دل سے عزت نہیں کرے گی۔ ممکن ہے وہ مجھ سے میل جول ہی ترک کر دیں۔۔۔ اگر رئیس صاحب کو پتا چل گیا، ایک منٹ میں مجھے جونڈے سے پکڑ کر نکال باہر کریں گے، ان کو عورتوں کی کمی تو نہیں۔ نکاح کریں یا نہ کریں۔۔۔ ان کو کون پوچھتا ہے۔

اس کا ساتھ والی کوٹھی میں کام کرنا، صاف صاف خطرے کی گھنٹی ہے۔ کوشش کر کے اس کو وہاں سے نکلوا دینا ہی بہتر ہے۔ یہ سوچ کر بیگم ساتھ والی کوٹھی میں گئی، اور باتوں باتوں میں کائنات بیگم کے سامن کنیز کی ذات میں کیڑے نکالنے بیٹھ گئی۔ اسے بڑی رازداری سے بتایا کہ'' کنیز کو چوری چکاری کی بہت عادت ہے۔ میرے زیورات پر ہاتھ صاف کرنے ہی والی تھی کہ میں نے دیکھ لیا اور دفع دور کر دیا۔ آپ بھی اسے ہرگز نہ رکھیں''۔ کائنات نے سوچا کہ ابھی کچھ دن پہلے تو بیگم اس لڑکی کی بہت تعریفیں کر رہی تھی۔ آج کیا ہوا؟۔ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ اس نے کہا: ''فی الوقت تو مجبوری ہے، نکال نہیں سکتی، البتہ ایک ماہ بعد نکال دوں گی۔ جب تک کوئی دوسری مل جائے گی''۔

کنیز نے اپنی محنت اور دیانت داری سے کائنات بیگم کو اپنی گرویدہ بنا لیا تھا۔ وقت پر آتی جاتی اور کسی کام میں سرد مہری یا کاہلی کا مظاہرہ نہ کرتی۔ رئیس صاحب کی بیگم نے ایک دو کام کرنے والیوں کو بھی اس دوران کائنات کے ہاں بھیجا تھا۔ مگر کائنات بیگم کنیز کی جگہ کسی دوسری کو دینے کو تیار نہ تھیں۔

ایک ایک دن بیگم کے لیے ایک صدی کے برابر گزرتا تھا۔ مہنہ گزر گیا، دس دن اوپر ہو گئے، لیکن کنیز کو فارغ نہ کیا گیا تھا۔ بیگم رئیس ایک بار پھر جا کر کہنے لگی: ''آپ نے اس چھنال کو فارغ کیوں نہیں کیا؟۔ تب فارغ کرو گی جب وہ گھر کا صفایا کر دے گی''۔

بیگم کائنات نے بے دھیانی میں کہا: ''کشور تو کچھ اور ہی کہتی ہے''؟

بے دھیانی میں کہی گئی بات پرت در پرت معنی خیز تھی۔ بیگم کچھ کہہ نہ سکی، اس کے اندر آگ لگ گئی اور وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی تھی۔ وہ کوٹھی سے نکلتے سوچ رہی تھی۔ اس کلموہی نے سب کچھ بتا دیا ہے، گلی گلی میری رسوائی کا سامان کر دیا ہے۔ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل جائے گی۔ بیگم ناگ کی طرح پھنکار رہی تھی۔ جتنی جلدی ہو سکے، اس لڑکی کو اپنے ہاں پھر سے بلا لوں، خواہ کچھ بھی کرنا پڑے۔ یہ تو احساس ہوگا کہ وہ میرے پاس ہے۔ پتا نہیں سارا دن کیسی کیسی باتیں بناتی اور سناتی ہو گی۔ ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا، اگر اور دیر کر دی تو تیر بالکل ہی کمان سے نکل جائے گا، اور اس کا نشانہ بھی میں ہی بنوں گی۔ ایسی ضرب لگے گی، کہ خون بھی نہیں بہے گا اور تکلیف بھی عمر بھر ختم نہیں ہو گی۔

بیگم نے کسی کے ہاتھ کنیز تک پیغام بھجوایا کہ فوراً میرے پاس چلی آؤ۔۔۔ ڈبل تنخواہ دوں گی۔۔۔ دس بارہ دن جو تو نے کائنات بیگم کی طرف لگائے ہیں۔ اس کی پروا نہ کرنا، ان دنوں کی تنخواہ میں آتے ہی تم کو دے دوں گی۔ کنیز نے کائنات بیگم کو کام سے جواب دے دیا اور اگلی صبح رئیس صاحب کی کوٹھی میں چلی آئی تھی، جہاں بیگم اس کا شدت سے انتظار کر رہی تھی۔ سب سے پہلے بیگم نے دس بارہ دنوں کی تنخواہ ادا کی تھی۔

کنیز صبح آتی اور شام کو گھر لوٹ جاتی تھی۔ آتے جاتے اس کے ساتھ چھوٹی بہن اور محلے کی بڑی عمر کی عورت ہوتی تھی۔ دن گزر رہے تھے۔ مگر بیگم کے ذہن سے یہ بات نکل ہی نہیں رہی تھی۔ اس کو ہر وقت یہی کھٹکا لگا رہتا تھا، کہ جیسے سب کچھ چوپٹ ہونے والا ہے۔

جب کائنات بیگم کو پتا چلا کہ کنیز تو رئیس صاحب کی کوٹھی میں کام کرتی ہے، تو وہ بھی طنز کی تلوار سے لیس ہو کر بیگم رئیس کے ہاں چلی آئی اور چھوٹتے ہی کاٹ دار لہجے میں بولی: ''محترمہ! آپ تو کہتی تھیں کہ یہ لڑکی چور ہے، اور مجھے مشورہ دیتی تھیں کہ اس کو فارغ کر دو۔۔۔ اب خود اس کو گھر میں رکھ لیا ہے۔۔۔ کہتے ہیں ناں کہ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور۔۔۔''

بیگم نے بڑی معصومیت سے کہا: ''کیا کریں۔۔۔ کام کرنے والیوں کے نخرے ہی بہت ہیں۔۔۔ یہ لڑکی جیسی بھی ہے کام چور نہیں''۔

اس لڑکی نے مجھے منہ دکھانے لائق نہیں چھوڑا۔ ابھی پتا نہیں اس نے کیا کیا گل کھلانے ہیں۔ دوسروں کی تو خیر ہے، اگر رئیس صاحب کے کان میں بھنک پڑ گئی تو ۔۔۔۔ یہ سوچتے ہی اس کا دماغ پھٹنے لگا تھا اور وہ پھنکارتی ہوئی تیسری منزل کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

کنیز تیسری منزل پر کمروں کی کھڑکیاں کھول کر ان کی جھاڑ پونچھ کر رہی تھی۔ تا حدِ نظر تک چھتوں کے اوپر ایک الگ جہان آباد تھا۔ ٹیلی وژن کے انٹینے۔۔۔ پانی کی نیلی اور کالی ٹینکیاں۔۔۔ کبوتروں کی چھتریاں۔۔۔ مکانوں کے چھجے۔۔۔ ان پر بیٹھی چڑیوں کے غول۔۔ مسجدوں کے مینار۔۔۔ ان پر گونجتے لاؤڈ اسپیکر۔۔۔ کنکوے اڑاتی جوانیاں۔۔۔ چمنیوں کا دھواں۔۔۔ شوروغل۔۔۔ موٹروں کے بجتے ہارنوں کا شور۔۔۔ اور نیچے سڑک۔۔۔

وہ ہر چیز سے بے نیاز اپنے کام میں مگن تھی۔ بیگم نے دبے پاؤں پیچھے سے آ کر اس کو نیچے کی طرف دھکا دے دیا۔

’’فصلِ بہاراں‘‘

نقشبند قمر نقوی بھوپالی

(امریکہ)

ناک میں نتھنی، کان میں جھومر، آڑی مانگ نکالی ہے
وہ رنگین ادا تو گویا جادو کرنے والی ہے

چہرہ تو ایسا ہے جیسے صبح ہو شبنم نہلائی
زلف ہے پھولوں جیسی مہکی، رات کی جیسی کالی ہے

اچھا ہم اب سمجھے، اس کو دیکھا تھا، ہم جان گئے
کا جل والی آنکھیں اور صورت بھولی بھالی ہے

ہونٹوں پر مسکان بھی ہے، اور آنکھوں میں کچھ شوخی بھی
سیب کا جیسا رنگ ہے اس کا انگوروں کی ڈالی ہے

وہ ہے ایسی رنگیں جیسے قوسِ قزح سے نکلی ہو
سرو کا جیسا قامت اس کا چال بڑی متوالی ہے

وہ افسانہ ہے جو فصلِ بہاراں میں تحریر ہوا
شبنم اس کا آئینہ، رعنائی اس کی مالی ہے

وہ تو ہیرے جیسی ہے جو چاند کو بھی شرماتی ہو
وہ تو جیسے ایک کلی ہے جو بس کھلنے والی ہے

یہ تو قمر نقوی سے پوچھو عشق کی انکو کیوں سوجھی
انکے دل میں عشق کا جو خانہ ہے وہ تو خالی ہے

○

محمودالحسن (راولپنڈی)

غمِ جاں ،دردِ دل، سوزِ نوا ہے
یہ سب تیرا کرم، تری عطا ہے
مرا دل اب تو اُن کا ہوگیا ہے
کہ جن کی خاکِ پا بھی کیمیا ہے
سمجھتا تھا جسے میں جانگزا ہے
وہی غم اب مرے دل کی غذا ہے
علمبردا بازو کٹ چُکا ہے
مگر اُس کا علم لہرا رہا ہے
اگر جوشِ جنوں ہو کارفرما
تو پھر آسان ہر اِک راستہ ہے
عجب عالم ہے آشفتہ سری کا
کہ میرا ہاتھ دامن آپ کا ہے
علاجِ داغِ عصیاں خود ہی سوچو
بجز اشک ندامت اور کیا ہے
دماغ اب عرش پر کیوں ہو نہ اپنا
جبیں میری ہے اُن کا نقشِ پا ہے
میں تجھ سے مانگنے آیا ہوں تجھ کو
یہ میری سادگی کی انتہا ہے
حسینؓ اتنے کہاں سے لاؤ گے تم
کہ اب تو ہر قدم پر کربلا ہے
بظاہر پُرسکوں ہے صحنِ گلشن
مگر اِک حشر سا دل میں بپا ہے
نہ ہوگا آپؐ سا کوئی جہاں میں
نہ کوئی اِس جہاں میں آپؐ سا ہے
اُدھر دنیا کے مہر و ماہ و انجم
اِدھر بس ایک قندیلِ حرا ہے
مجھے محمود ہو کیوں فکرِ عقبیٰ
مرا آقا محمدؐ مصطفٰے ہے

اختر شاہجہاں پوری
(بھارت)

جو تھا دشت جنت نشاں کر دیا
مرے گھر کو اس نے مکاں کر دیا

سبھی غم سے نا آشنا تھے جہاں
وہاں قصۂ غم بیاں کر دیا

کمالات ہیں یہ مری فکر کے
ہر اک لفظ کو داستاں کر دیا

بھٹکتے تھے بے سمت راہوں پر جو
انہیں جوڑ کر کارواں کر دیا

وہاں بارشِ مشک و عنبر ہوئی
ترا ذکر ہم نے جہاں کر دیا

مجھے کیا دیا شاعری نے مری
یہی تو کہ بس جادواں کر دیا

اسے اس کا ادراک اختؔر کہاں
زمیں سے مجھے آسماں کر دیا

❍

مظفر حنفی
(دہلی، بھارت)

میرا اِک رُوپ نیا روز دکھاتا ہے مجھے
قطرہ قطرہ کوئی لمحوں میں جلاتا ہے مجھے

گُم رہی میری جبلّت، مری فطرت گردش
راستہ راہ کا پتھر نظر آتا ہے مجھے

راکھ کا ڈھیر ہوں میں، کون تڑپ کر مجھ میں
جگمگاتا ہے مجھے، آگ بناتا ہے مجھے

مجھ کو ہونے کا یہ احساس نہ جینے دے گا
سُوئی کی نوک پر ہر سمت گھماتا ہے مجھے

اپنی نظروں سے گراتا ہے مجھے کربِ وجود
پھر بگولے کی طرح سر پہ چڑھاتا ہے مجھے

میں کہ پامال ہوں اِک نقشِ کفِ پا کی طرح
بیٹھ جاؤں گا کہیں کون اُٹھاتا ہے مجھے

تم نے چوٹی پہ قدم اپنے جما رکھے ہیں
میں بھی مجبور ہوں، جھرنا لیے جاتا ہے مجھے

❍

پروفیسر خیال آفاقی
(کراچی)

سُنا ہے، دوستوں سے ایسی نادانی بھی ہوتی ہے
کہ دے کے دُکھ مجھے، ان کو پشیمانی بھی ہوتی ہے

بہت مشکل ہے راہِ شوق میں ثابت قدم رہنا،
مگر اس طور سے جینے میں آسانی بھی ہوتی ہے

یہ جب چاہیں دیارِ نفس کو زیر وزبر کردیں،
فقیروں کی ادا میں خوئے سلطانی بھی ہوتی ہے

سفینے میں قدم رکھنے سے پہلے سوچ لیجیے گا
فقط پانی نہیں، دریا میں طغیانی بھی ہوتی ہے

نہیں معلوم ان دانشورانِ عصر حاضر کو،
کہ اس دانائی میں اِک چیز نادانی بھی ہوتی ہے

اجل تو بعد میں آئے گی، پہلے زندگانی میں
سکوں بھی کھونا پڑتا ہے پریشانی بھی ہوتی ہے

عجب طرفہ تماشا ہے کہ بے دینوں کی میّت پر
پڑھے جاتے ہیں نوحے فاتحہ خوانی بھی ہوتی ہے

خیاؔل احباب تو جو ہیں مگر تُم کیا ہو یہ سوچو
گِلے سے بھی نہیں رُکتے، پشیمانی بھی ہوتی ہے

○

غالب عرفان
(کراچی)

پھیلتی جا رہی ہے مسافت مگر وقت اور فاصلہ میری آنکھوں میں ہے
اُس کے بس میں ہے روزِ قیامت مگر وقت اور فاصلہ میری آنکھوں میں ہے

اِک سفر خواب کا منزلِ دار تک ہے مسلّط میرے فہم وادراک پر
دسترس میں نہیں کوئی ساعت مگر وقت اور فاصلہ میری آنکھوں میں ہے

صبح سے شام تک میں تعاقب میں ہُوں، اس کی آواز کے لہجۂ راز کے
اُس سے ملنا ہے میری عبادت مگر وقت اور فاصلہ میری آنکھوں میں ہے

ٹوٹ کر اِک شجر سے یہاں آ گیا برگِ آوارہ کی طرح اُڑتا ہُوا
مَیں ہوا میں ہوں زیرِ حراست مگر وقت اور فاصلہ میری آنکھوں میں ہے

میں نے سیکھا ہے تاریخ سے ہر سبق میں نے دیکھا ہے تہذیب کا سینہ شق
بھول جانے کی ہے مجھ کو عادت مگر وقت اور فاصلہ میری آنکھوں میں ہے

ایک سیلاب مجھ کو بہاتا ہُوا لے کے آیا نہ جانے کہاں سے کہاں
شورِ دریا سے ہوں بے سماعت مگر وقت اور فاصلہ میری آنکھوں میں ہے

شہرِ عرفاؔں کو جاتی ہوئی اِک سڑک دیکھتی جا رہی ہے مجھے دُور تک
ہے الگ میری شکل و شباہت مگر وقت اور فاصلہ میری آنکھوں میں ہے

○

آصف ثاقب

(بوئی،ہزارہ)

عدو سے دوستی ہم نے بھی کی تھی
نکردہ عاشقی ہم نے بھی کی تھی

کسی کاغذ نے اپنایا نہ اس کو
وگرنہ شاعری ہم نے بھی کی تھی

ہمارا نام بھی لکھو فرشتو
کہ مدحِ آدمی ہم نے بھی کی تھی

فقط اک اشک سے تم نے بھی کی ہے
گلی میں روشنی ہم نے بھی کی تھی

غبارِ راہ کیا تمثیل لائے
کہ یوں آوارگی ہم نے بھی کی تھی

خدایا ہم کو بھی اپنا بنالے
عبادت کی خوشی ہم نے بھی کی تھی

چمن میں موسمِ گل سے بھی کھیلے
خزاں سے دل لگی ہم نے بھی کی تھی

ہمارا خون بھی ہے رنگ وبو میں
محبت پھول سی ہم نے بھی کی تھی

فلک سے کیوں پلٹ آئی ہے ثاقب
دعا اچھی بھلی ہم نے بھی کی تھی

○

محمود شام

(کراچی)

اس بار لُٹا اپنا نگر اور طرح سے
رکھے گئے بازار میں سر اور طرح سے

گرنے لگیں اپنی ہی چھتیں اپنے سروں پر
غائب ہوئے دیوار سے در اور طرح سے

ہم صاحبِ کردار دھنی مہر و وفا کے
درکار یہ سب کچھ ہے مگر اور طرح سے

تاریخ کے اوراق بھی رُوداد سے قاصر
اقوام ہوئیں زیر و زبر اور طرح سے

اب تو بھی مری جان بدل اپنی ادائیں
گردش میں ہیں اب شام وسحر اور طرح سے

ہشیار۔ خبردار۔ ہر اک گام پہ محتاط
دیتے ہیں فریب اہلِ نظر اور طرح سے

لہریں تو تھرکتی ہیں جوانی کے نشے میں
ہے رقصِ مسلسل میں بھنور اور طرح سے

یہ چاندنی ہرجائی ہے محفل کی ہے شوقین
اے چاند میرے چھت پہ اُتر اور طرح سے

اب رابطہ باقی نہیں کاغذ میں قلم میں
کرتی ہے سفر اب تو خبر اور طرح سے

رُسوا ہے سرِ عام مناجات کی حُرمت
ہوتا ہے دعاؤں کا اثر اور طرح سے

عالم بھی دکاں دار ہیں رہبر بھی ہیں تاجر
اے بنتِ وطن تو بھی سنور اور طرح سے

○

حسن عسکری کاظمی

(لاہور)

دستِ ہنر میں حرفِ یقیں کی کمان ہے
میرا ہدف تو شعر وسخن کا جہان ہے

آغازِ انقلاب کی صورت یہی نہ ہو
ڈوبا ہوا جو درد میں اس کا بیان ہے

میں نے بنا دیا ہے اسے مرکزِ نگاہ
قامت بتا رہی ہے کہ اچھی اُٹھان ہے

آئے گی آپ منزل گم گشتہ سامنے
میں تو شکستہ پا ہوں ارادہ جوان ہے

دل میں بسا ہوا ہے وہی دلستاں مگر
اوجھل مری نظر سے اسی کا مکان ہے

اس شہرِ کم نظر میں کوئی مطمئن نہیں
لگتا ہے یوں کہ جیسے شکنجے میں جان ہے

رکھا نہ میں نے دل میں کبھی گمرہی کا ڈر
ہر فرد اس سفر میں حسنؔ خوش گمان ہے

○

نسیم سحر

(راولپنڈی)

حِصارِ حاشیۂ کُن فکاں سے آگے چلیں
کبھی تو سرحدِ کون و مکاں سے آگے چلیں
ہمیں سلیقۂ منزل نُمائی آتا ہے
غُبار بن کے ہم اِس کارواں سے آگے چلیں
پیام دیتی ہے اِس کائنات کی وسعت
کہ ہم پُرانے زمیں آسماں سے آگے چلیں
یہاں رہیں گے تو ہونا پڑے گا خاک ہمیں
اِرادہ ہے کہ ہم اِس خاکداں سے آگے چلیں
ابھی تو اَور کئی انکشاف باقی ہیں
نہاں کی کھوج میں نکلیں، عیاں سے آگے چلیں
بُجھی ہوئی ہے ستاروں کی کالی راکھ یہاں
یہاں اندھیرا بہت ہے، یہاں سے آگے چلیں
اُدھر کی تیرگیوں میں بھی روشنی ہو گی
یہ دیکھنے کے لئے کہکشاں سے آگے چلیں
ہماری پیاس کی شِدّت کا یہ تقاضا ہے
یہ پیاس لے کے ہم آبِ رواں سے آگے چلیں
جہاں غُبار میں گُم ہو گئے ہیں سب رستے
رُکے بغیر وہاں اُس نشاں سے آگے چلیں
لُغت میں لفظوں کے معنی کُچھ اَور لکھے ہیں!
سو گوشوارۂ سُود و زیاں سے آگے چلیں
دَھنک میں اَور بھی کچھ رنگ ہم کریں شامل
وُہ رنگ لینے ذرا آسماں سے آگے چلیں
ہمیں جو وقت کی گردش پہ اختیار ہو کچھ!
تو اپنے قافلۂ رفتگاں سے آگے چلیں
یہ فیصلے کی گھڑی ہے، یہ سوچنا ہے نسیمؔ
کہ پیچھے لوٹ چلیں یا یہاں سے آگے چلیں!

○

مہندر پرتاپ چاند
(انبالہ، بھارت)

کچھ اب کے برس اور ہواؤں کا چلن ہے
بوجھل ہے فضا۔ وقت کے ماتھے پہ شِکن ہے

دیتی ہیں دُھواں اب بھی سُلگتی ہُوئی شامیں
ماحول پہ چھائی ہوئی ویسی ہی گھٹن ہے

اے غیرتِ ناہید! تری طرزِ تکلّم
سنگیت کی لَے ہے کہ یہ سورج کی کرن ہے!

نااہلیت اپنی کہ جو رُسوائے جہاں تھی
حیرت ہے، وہی آج کا سب سے بڑا فن ہے!

نِکھرا ہے ترا روپ مرے شعروں میں ڈھل کر
سنورا ہُوا میرا بھی ہر اک حرفِ سخن ہے

مہکی ہوئی سانسوں میں بَسی ہے کوئی مُورت
خوشبو ہے بَدن کی کہ یہ خوشبو کا بدن ہے!

سینے سے لگالو۔ اِسے پلکوں سے پہ سجالو
اے چاؔند! یہ بیتے ہوئے لمحوں کی چبھن ہے

○

اشرف جاوید (لاہور)

کچھ بھی کہو! غریب نے جانا تو ہے نہیں
ہم بیکسوں کا اور ٹھکانہ تو ہے نہیں
اب اُس کی بات بات کا ماتم کریں، تو کیا!
روتے ہوؤں کو اُس نے ہنسانا تو ہے نہیں
اِتنا نہ تیز چل کہ سنبھلنا محال ہو!
جو گر پڑے، کسی نے اُٹھانا تو ہے نہیں
بیٹھے ہو کس خیال میں در وا کیے ہوئے!
جب طے ہے اُس نے لوٹ کے آنا تو ہے نہیں
ہم نے تو ساتھ زادِ سفر بھی نہیں لیا
رستے میں کچھ بھی ملنا ملانا تو ہے نہیں
رِستا رہے گا پنبہ و مرہم کے باوجود
تازہ لگا ہے زخم، پرانا تو ہے نہیں
پھر در کُھلے کہ سر کُھلے اِمکان دونوں ہیں
پیچھے ،قدم بڑھا کے ،ہٹانا تو ہے نہیں
کب تک صفائی دیتے پھریں بے گناہی کی!
اُس بد گماں نے راہ پہ آنا تو ہے نہیں
کیا عشق میں حساب رکھیں نرم و گرم کا!
اب اِس کو کاروبا ربنانا تو ہے نہیں
کیا جانے کتنا پانی پُلوں سے گزر گیا!
وہ پہلی بات ، پہلا زمانہ تو ہے نہیں
خالی پڑا رہے گا ترے انتظار میں
گھر میں کرایہ دار کو لانا تو ہے نہیں
تم اُس کو روک لیتے تھے حیلے بہانے سے
اِس بار کوئی حیلہ بہانہ تو ہے نہیں
تاراج کر کے چلتا بنا دل کا سومنات
خاک اُڑتی ہے کھنڈر میں ، خزانہ تو ہے نہیں
پوچھیں گے مے کدے کی روایت ہی سے لوگ!
ساقی نے مُنہ کسی کو دکھانا تو ہے نہیں
دل پھر طوافِ کوے ملامت کو جائے ہے
دیوانہ ہے ازل سے، یہ دانا تو ہے نہیں

عرش صہبائی

(جموں،کشمیر)

جان ہونٹوں پہ جب اڑی ہو گی
اک قیامت کی وہ گھڑی ہو گی

جب بھی گزریں گے ہم مصائب سے
دھوپ یہ کسقدر کڑی ہو گی

جو یہاں ہو گا صاحبِ ایماں
اُس کی قسمت میں جھونپڑی ہوگی

جا ہی لیں گے ہم اپنی منزل کو
یہ مسافت مگر کڑی ہو گی

یہ حقیقت ہے ہر نظر اُس کی
موتیوں کی حسیں لڑی ہو گی

تُم نبھا پاؤ گے نہ دُنیا سے
اک نہ اک ضد پہ یہ اڑی ہو گی

بڑھ گئی ہوں گی دھڑکنیں دل کی
جب نظرسے نظر لڑی ہو گی

جن کا ہو گا بُلند تر کردار
اُن کی ہر بات بھی بڑی ہو گی

عرشؔ انسان کی اَنا ہے جو
اس کے قد سے کہیں بڑی ہو گی

○

ڈاکٹر جواز جعفری

(لاہور)

یوں ترے خواب کی توقیر بڑھا سکتا ہوں
سونے والے! میں ترے خواب میں آ سکتا ہوں

وہ کہانی جو مری ماں نے سنائی تھی مجھے
شہرِ بے خواب کے بچوں کو سُنا سکتا ہوں

نسل در نسل میں مٹی کا ہنر جانتا ہوں
اس خرابے میں نیا شہر بسا سکتا ہوں

مجھ پہ وا ہونے لگا قریۂ تخلیق کا باب!
میں ترے جیسے کئی اور بنا سکتاہوں

سہل مت جان ترے عشق کے ویرانے میں
میں اگر چاہوں بڑا نام کما سکتا ہوں

یاد ہے مجھ کو کوئی اسم جسے پڑھتے ہی
میں پرندوں کو ہتھیلی پہ بُلا سکتا ہوں

کیوں بناتے ہو مجھے شہر کا والی لوگو
قتل کر سکتا ہوں نے شہر جلا سکتا ہوں

مجھ سے غفلت نہ برت میرے محافظ، مرے دوست
اپنے مشکیزے میں خود زہر ملا سکتا ہوں

○

اوورکوٹ

(سیلی بینسن)

ترجمہ: ڈاکٹر فیروز عالم

(کیلیفورنیا)

(**سیلی** بینسن ۱۹۰۰ء میں سینٹ لوئی، امریکا میں پیدا ہوئی تھی اور ۱۹۷۲ء میں انتقال کر گئی۔ اس نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا ایک معمولی اخباری رپورٹر کی طرح کی۔ مگر بعد میں اس نے اخباروں کے ذریعہ فلموں پر تنقید نگار کی حیثیت سے اپنی پہچان بنائی۔ اس پیشے سے کئی سال منسلک رہنے کے بعد اس نے یہ کہانی لکھی اور امریکا کے سب سے باوقار مجلّے ''نیو یارکر'' کو بھیج دی۔ اسکی توقع کے خلاف نہ صرف اس مجلّے نے اسے اشاعت کے لئے قبول کر لیا بلکہ اس سے مزید کہانیوں کی فرمائش کی۔ اس کے ایک ناول'' MEET ME IN ST LUIS'' ایک فلم بنی جسے آج تک کلاسک کا درجہ حاصل ہے)

☆

مسز بشپ شہر کے اس ریسٹوران میں بیٹھی تھیں جو اپنے کھانوں کے علاوہ شور شرابے، ہلا گلا اور اپنے خوش باش ماحول کے لئے مشہور تھی۔ وہ کھانے سے بہت لطف اندوز ہوئی تھیں اور انہوں نے قیمتی شراب کا ایک پیگ پیا تھا اور کئی سینڈوچز اور آئسکریم کیک کھالئے تھے۔ ہلکے سے سرور اور بھرے ہوئے پیٹ کی وجہ سے اب ان کو ماحول کی گھٹن کا احساس ہونے لگا تھا۔ وہ ریسٹوران سے باہر نکلیں اور گھر کی راہ لی۔ مگر جب انہوں نے اپنے پرس میں ہاتھ ڈالا تو اس میں چند سکے تھے۔ چند بے حقیقت پائیوں کو شامل کرنے کے باجود ان کے پاس کل ستاسی پائیاں تھیں۔ یہ رقم گھر تک ٹیکسی لینے کے لئے ناکافی تھی۔ ان کو سخت جھنجھلاہٹ ہوئی کہ ان کے پاس کبھی کوئی معقول رقم نہیں ہوتی۔ انہوں نے سوچا کہ وہ جب بھی سہیلیوں کے ساتھ برج کھیلتے ہوئے ہار جاتی ہیں تو انہیں سخت شرمندگی کے ساتھ یا تو ان سے ادھار لینا پڑتا ہے یا پھر انہیں ایک مختصر نوٹ لکھ کر دینا پڑتا ہے کہ میں تمھاری قرضدار ہوں۔ اگر چہ یہ کہنا ضروری ہے کہ وہ یہ قرض وقت پر ادا بھی کر دیتی ہیں۔ خاص طور سے انہیں لیلا ہارڈی سے سخت جلن تھی جو لوگوں کو دکھانے کے لئے اپنے پرس سے دس دس ڈالر کے نوٹ نکال کر کہتی ہے کہ میرے پاس تو صرف بڑے نوٹ ہوتے ہیں۔ کیا کسی کے پاس اس کی ریزگاری ہے۔

انہوں نے فیصلہ کیا کہ گھر کے لئے بس لینے کے لئے کافی دیر ہو چکی ہے اس لئے انہیں زیر زمین ٹرین لینی چاہئے۔ اب ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی تھی اور جس فٹ پاتھ پر وہ چل رہی تھیں وہ بھی گیلی ہو گئی تھی اس کیفیت میں انہیں اپنے اوپر نہ صرف بہت رحم آیا بلکہ لحہ بہ لحہ ان کا غصہ بڑھنے لگا۔ انہیں یاد آیا کہ جب وہ ایک نوجوان لڑکی تھیں ان کو اپنے مستقبل کے بارے میں یقین تھا کہ جب ان کی شادی ہو گی تو ان کے پاس وافر مقدار میں روپیہ ہو گا جسے وہ جب چاہیں گی اور جیسے چاہیں گی خرچ کریں گی۔ اگر چہ ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والی خواتین بھی کبھی کبھی اس بات کا رونا روتی تھیں کہ ان کے پاس خرچ کرنے کو کافی رقم نہیں مگر ان کا تو حال ہی دوسرا تھا کہ ان کے پاس تو کبھی کچھ ہوتا ہی نہ تھا۔ یہ بہت تکلیف دہ تھا کہ جب وہ گھر سے باہر نکلتی تھیں تو ان کے پاس ایک پورا ڈالر بھی نہیں ہوتا تھا بلکہ صرف چند سکے ہی ہوتے تھے۔ انہیں یہ خیال آکر ایک جھرجھری سی آگئی کہ ایسی حالت میں اگر ان کو کوئی حادثہ پیش آجائے تو کیا ہوگا؟

کئی سال پہلے ان کے شوہر رابرٹ نے گھر کا بجٹ بنا کر ان کو مہینے کے شروع میں کچھ رقم دینی شروع کی تھی مگر اب چیزوں کی قیمتیں بہت بڑھ گئی تھیں۔ اس لئے اس نے یہ عادت بھی ترک کر دی تھی بس وہ وقتاً فوقتاً ان کے مانگنے پر ان کو کچھ ڈالر دے دیتا تھا۔ پھر بھی ایسا لگتا تھا جیسے رابرٹ کے پاس تو ہمیشہ ڈالرز ہوتے ہیں انہوں نے جھنجھلا کر سوچا کم بخت مرد ہوتے ہی ایسے ہیں۔ ان کی جیبیں ہمیشہ ڈالرز سے بھری ہوتی ہیں۔ مگر انہیں اس کا کبھی خیال نہیں آتا کہ کسی اور کو بھی ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ انہوں نے سوچا کہ انہیں رابرٹ سے یہ بات کرنی چاہئے کہ وہ ان کو اپنے ذاتی خرچ کے لئے ایک مقررہ رقم دیا کرے تا کہ وہ اس رقم کو اپنی مرضی سے خرچ کر سکیں۔ اس طرح ان کو کم از کم یہ تو معلوم رہے گا کہ ان کے پاس کتنے پیسے ہیں اور وہ ان کو کس طرح خرچ کریں۔ انہوں نے جیسے ہی یہ فیصلہ کیا ان کے دل کو ایک گونہ سکون حاصل ہوا۔

زیر زمین اسٹیشن میں کچھ گھٹن تھی مگر جب وہ ٹرین میں چڑھیں تو وہاں ماحول کچھ بہتر تھا۔ انہیں دروازے کے پاس ہی ایک اچھی نشست مل گئی اور اگر چہ ان کے اندر ایک باغیانہ کیفیت متلاطم تھی مگر ان کا چہرہ سپاٹ تھا۔ اٹھارہویں اسٹریٹ کے اسٹیشن پر بہت سے لوگ اترے اور بہت سے نئے مسافر چڑھ گئے۔ گاڑی کا ڈبہ کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ ان کے سامنے ایک آدمی چھت کے ڈنڈے سے ہاتھ پکڑے کھڑا تھا جیسے وہ لٹکا ہوا ہو۔ وہ ایک طویل القامت مرد تھا اور ایک بوسیدہ لمبا اوورکوٹ پہنے تھا۔ یہ کوٹ اس کے جسم پر بہت ڈھیلا ڈھالا تھا اور جب ٹرین ہلتی تھی تو یہ اوورکوٹ اس کے جسم پر ادھر سے ادھر جھکولے کھاتا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ اونی اوورکوٹ بارش کی وجہ سے کچھ بھیگ بھی گیا تھا اور اس میں سے ایک ناگوار بو بھی اٹھ رہی تھی۔ اس کوٹ کے بٹن انتہائی سستے تھے اور جو بٹن مسز بشپ کی آنکھوں کے عین سامنے تھا وہ ٹوٹا ہوا تھا اور اس کی جگہ پر ایک دوسرا بٹن کالے دھاگے سے ٹانکا گیا تھا جو کوٹ کی رنگت سے میل نہیں کھاتا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ اس کی آستین کے کناروں سے اون کے پھوسڑے نکل رہے تھے اور پھٹے ہوئے استر کا ایک بدرنگ ٹکڑا بھی آستین سے باہر جھانک رہا تھا۔ پھر ان کی نظر اس

کے ہاتھ پر جم گئی۔اس کی لمبی مخروطی انگلیاں نہ صرف بدرنگ تھیں بلکہ ان پرمحنت کشوں والے گٹے پڑے ہوئے تھے۔مسز بشپ جن کو اپنی قوت مشاہدہ پر بہت ناز تھا، نے اس بات کا اندازہ لگا لیا کہ یہ متوسط طبقہ کا محنت کش فرد ہے جو ایمانداری سے اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پال رہا ہے۔یقیناً یہ باپ ہے جس کے کئی بچے ہیں جس کے ذمہ ان کے اسکول کے اخراجات ہیں، وہ ایک ذمہ دار شوہر بھی ہے اور اپنی بیوی کی ذمہ داریاں بھی اٹھا رہا ہے۔انہوں نے سوچا کہ جب وہ گھر پہنچتا ہوگا تو گھر میں آرام اور سکون کی جگہ شور شرابہ مچا ہوتا ہوگا اور اس کی بیوی کچن میں کچھ پکا رہی ہوتی ہوگی۔جس کی وجہ سے پورے گھر میں کھانوں کی خوشبو پھیلی ہوتی ہوگی۔ان کو اس کی بیوی پر بڑا غصہ آیا کہ اس کی بیوی بہت کاہل اور موٹی ہو گی جس کو اپنے شوہر کی محنت کا کوئی احساس نہیں۔ان کے دل میں اس آدمی کے لئے انتہائی ہمدردی کے جذبات موجزن ہوگئے۔وہ آدمی کبھی کبھی دھیمے دھیمے کھانستا بھی تھا جس کی وجہ سے ان کے دل میں ایک ایسی ہمدردی پیدا ہونے لگی جسے وہ کوئی نام نہیں دے سکتی تھیں۔انہوں نے سوچا کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم جب وہ اگلے اسٹیشن پر اترے گا تو وہ اسے ایسی ہمدردانہ مسکراہٹ تو دے سکتی ہیں کہ جس میں یہ پیغام چھپا ہو کہ مجھے تمہارے خلوص، تمہاری محنت اور تمہاری ذمہ داری کا مکمل احساس ہے۔مگر جب ٹرین رکی تو وہ اور لوگوں کے ساتھ ڈبے سے اتنی جلدی باہر نکل گیا کہ ان کو یہ سب کرنے کا موقعہ ہی نہ مل سکا۔

مسز ملر اسٹیشن سے پیدل چل کر جب اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہوئیں تو ان کے گھر میں ناگوار بو اور گھٹن پھیلی تھی۔ان کے شوہر نے کھانے کے لئے چانپیں تلی تھیں جس کی مہک گھر بھر میں پھیلی ہوئی تھی اور چونکہ شراب اور سینڈوچز کی وجہ سے خود ان کا پیٹ بہت بھرا ہوا تھا اس لئے یہ مہک ان کو بہت ناگوار گزری۔رابرٹ صوفے پر نیم دراز تھا۔اور اس نے روشنی سے بچنے کے لئے اپنی آنکھیں شام کے اخبار سے ڈھانپی ہوئی تھیں۔قریب ہی اس کے چپل پڑے ہوئے تھے جو کثرت استعمال سے گھس گئے تھے۔سالوں پہلے جب ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی وہ ڈنر کے لئے باقاعدہ لباس تبدیل کرتا تھا اور دونوں کے لئے خوش رنگ کاک ٹیل بھی تیار کیا کرتا تھا جو وہ کھانے سے پہلے پیا کرتے تھے۔اب لگتا تھا کہ اس نے یہ سب چھوڑ دیا ہے۔جیسے وہ زندگی سے کچھ بے زار ہو گیا ہے اور اس نے حالات کے سامنے ہتھیار ڈال دئے ہیں۔ رابرٹ کو اس طرح آنکھوں پر اخبار رکھے گھٹنے موڑے صوفے پر نیم دراز دیکھ کر مسز بشپ کو اچھا نہ لگا وہ جھنجلا سی گئیں۔ایک دفعہ پھر انہیں لیلا ہارڈی سے جلن ہوئی کہ اس کے شوہر کو اگرچہ شراب کی لت پڑ چکی ہے مگر وہ اب بھی خوش لباس اور چونچال ہے۔ان کا دل چاہا کہ وہ رابرٹ کے چہرے سے اخبار اتنے جوش سے کھینچیں کہ وہ اخبار پھٹ جائے۔ان کے دل میں اب بھی رابرٹ کے لئے ایک غبار تھا جو دور نہیں ہو پا رہا تھا۔وہ کچھ دیر اسکے پاس کھڑی رہیں پھر انہوں نے کھڑکی کے پاس جا کر یہ کہتے ہوئے اسے جھٹکے سے کھولا کہ کیا کبھی ہمارے نصیب میں تازہ ہوا نہیں ہے، سارے گھر میں تلی چانپوں کی بو پھیلی ہے۔ رابرٹ اس آواز سے اچانک اٹھ بیٹھا۔اس نے آنکھیں کھول کر دھیمی آواز میں کہا ''ہیلو مولی۔۔تم گھر ہو؟'' مسز بشپ نے جلے کٹے لہجے میں کہا ''ہاں میں گھر آ گئی ہوں۔۔۔ٹرین میں آئی ہوں'' پھر وہ ایک کرسی کھینچ کر رابرٹ کے سامنے بیٹھ گئیں اور کہنے لگیں ''سچ مچ رابرٹ ۔۔۔یہ بڑی افسوس ناک بات ہے کہ میں اس برستی بارش میں ٹرین لے کر گھر آئی ہوں، زیر زمین ٹرین لیکر۔۔۔کیونکہ، جب میں ریسٹوران سے نکلی تو میرے پرس میں صرف ستاسی پیسے تھے، صرف ستاسی پیسے، جو ٹیکسی کے لئے بالکل ناکافی تھے''

''اوہ'' رابرٹ بولا ''یقیناً یہ افسوسناک ہے۔۔۔یہ لو'' یہ کہہ کر اس نے مٹھی بڑھائی اس میں ایک مڑا تڑا گندہ سا نوٹ تھا اور کہا ''یہ لو''۔مسز بشپ نے دیکھا یہ پانچ ڈالر کا نوٹ تھا۔انہوں نے نفی میں سر ہلایا اور کہا ''نہیں۔۔یہ مقصد نہیں، مجھے اسکی ضرورت نہیں۔میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ مجھے کسی طرح سے اپنے ذاتی خرچ کے لئے ماہانہ ایک مقررہ رقم کی ضرورت ہے۔حقیقت میں تمہیں میری لئے ایک ماہانہ رقم کا بندوبست کرنا چاہئے تاکہ میں اسے اپنی ضروریات کے مطابق استعمال کر سکوں۔میرے پاس کبھی کچھ رقم نہیں ہوتی، یہ کیفیت اب میرے لئے باعث شرم ہو چکی ہے'' رابرٹ نے اپنی انگلیوں میں پانچ ڈالر کے نوٹ کو گھمایا اور کہا ''یہ کیا مسئلہ ہے؟ مولی کیا میں تمہیں ہمیشہ مانگنے پر رقم نہیں دیتا'' مسز بشپ بولیں ''ہاں۔۔۔مگر لیکن وہ میری اپنی رقم نہیں ہوتی، ہر ماہ میری اپنی ضروریات کے لئے دی گئی ایک مقررہ رقم، میری اپنی رقم جو مجھے وقت ضرورت خرچ کرنے کا اختیار ہوگا'' رابرٹ نے بہت ہی ٹھنڈے لہجے میں کہا ''مولی۔۔۔اگر میں تمہیں ہر ماہ ایک مقررہ رقم دوں تو تم مہینے کی دس تاریخ تک اسے ٹھکانے لگا دو گی پھر۔۔''

مسز بشپ نے اسے بات پوری نہ کرنے دی اور تیز لہجے میں کہا ''رابرٹ میرے ساتھ بچوں کی طرح برتاؤ نہ کرو۔۔مجھے اس میں اپنی ہتک کا احساس ہوتا ہے''

رابرٹ اب بھی ٹھنڈے مزاج کے ساتھ بیٹھا اپنی انگلیوں میں پانچ ڈالر کا نوٹ گھما رہا تھا ''اس نے پوچھا تمہارا کیا خیال ہے، تمہیں کتنے روپئوں کی ضرورت ہوگی؟'' ''پچاس ڈالر ماہانہ'' اس کی آواز میں جھلاہٹ اور تیزی تھی۔وہ پھر کہنے لگیں ''کم از کم مجھے اپنے ماہانہ خرچ کے لئے اتنی رقم کی ضرورت تو ہے، میں اس میں کام چلا لونگی اگرچہ یہ اتنی کم ہے کہ اگر لیلا ہارڈی نے یہ سنا تو وہ مجھ پر ہنسے گی'' ''پچاس ڈالر'' یہ کہہ کر رابرٹ ہلکے سے کھنکارا جیسے وہ اپنی گھبراہٹ کو چھپا رہا ہو۔اس نے جیسے نروس ہو کر اپنے بالوں میں انگلیاں پھیریں، سر جھکا کر کچھ سوچا پھر کہنے لگا ''اس مہینے تو کچھ غیر متوقع اخراجات ہیں لیکن اگر تم انتظار کرو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں آئندہ ماہ کی چار تاریخ سے ہر ماہ تمہیں پچاس ڈالر ہاتھ خرچ کے لئے دیا کرونگا۔'' ''اوہ یہ بالکل قابل قبول ہے'' مسز بشپ نے مصلحت آمیز لہجے میں کہا کیونکہ وہ اپنی ''جیت'' کو مزید جتانا نہیں چاہتی تھیں۔انہوں نے پھر کہا ''مگر بھولنا نہیں۔۔کیوں کہ میں اسے ہرگز نہیں بھولوں گی'' یہ کہہ کر وہ کمرے میں گئیں تاکہ الماری کھول کر اپنی شال رکھ دیں کہ یکا یک ان کی نظر کونے میں رکھی کرسی پر

باقی صفحہ ۲۷ پر ملاحظہ کیجیے

زہریلا انسان

(ناول)

تابش خانزادہ (نیویارک)

قسط......۲

مجھے یوں لگا جیسے کسی سنگ تراش نے کالے مرمر سے تراشا ہوا کسی دیوی کا مجسمہ میرے سامنے رکھ دیا ہو۔ ایک تو یہ کہ میں نے اس سے پہلے کبھی عورت کا عریاں بدن نہیں دیکھا تھا اور دوسرا ان دنوں میں لڑکپن اور جوانی کی سرحدوں پر کھڑا تھا اس لیے میرے اندر کا لڑکا چند لمحوں کے لیے کہیں کھو گیا اور میں نے جوانی کی حدود سے اس قاتلہ پر نظریں ڈالیں۔ اپنے آگے ایک بھری جوانی کو اس انداز میں بیٹھا دیکھ کر میرا یقین کالے جادو پر اور بھی پختہ ہو گیا۔ میں نے دل میں سوچا، ہو نہ ہو کالا جادو اسی کا نام ہے۔ اس کے چہرے پر سانپ کی کاٹ کا کرب اور جوانی کے خمار کا آمیزہ مجھے مونا لیزا کے غمگین حسن کی یاد دلانے لگا۔ اگر میں بھی لینارڈو ڈونچی جیسا مصور ہوتا تو اس کے حسن کو کینوس پر امر کر دیتا۔ یا اگر میں مائیکل اینجلو جیسا سنگ تراش ہوتا تو اس کے سفید ملبوس میں کالے حسن کا مجسمہ بنا کر اسے کالی کے مندر میں رکھوا دیتا۔ مجھے یقین ہے کہ کالی کے مندر میں اسی دیوی کا مجسمہ رکھا ہے۔ اس سے پہلے کہ میری آنکھیں اس کے سراپے کی تاب نہ لاتے ہوئے خیرہ ہو جاتیں، میں نے خود کو سنبھالا اور اپنی نظریں جھکا دیں۔

دوسری بار میں نے اس پر ایک سپیرے کی نظر ڈالی۔ اس کی داہنی چھاتی کے اُبھار کی چوسنی کے نیچے خون کے دو باریک نشان سانپ کی کاٹ کی نشان دہی کر رہے تھے۔ میں نے اسے تخت پوش پر لیٹ جانے کو کہا۔ لیٹتے ہوئے اس نے حیا سے اپنی ساڑی کا پلو اٹھا کر اپنے چہرے پر ڈال دیا۔ سانپ کے زخم کو دیکھ کر میں نے کاٹنے والے سانپ کا اندازہ کر لیا تھا۔ رانی کو تیلی سانپ نے کاٹا تھا۔ سبزی مائل بھورے رنگ والا یہ سانپ کسی پنسل کی طرح پتلا اور اتنا ہی لمبا ہوتا ہے۔ یہ سانپ جھاڑیوں یا درختوں کی ٹہنیوں پر رہتا ہے اور لوگ عموماً جھاڑیوں میں کپڑے بدلتے ہوئے اس سانپ سے ڈسے جاتے ہیں۔ اس کی خوراک چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑے ہوتے ہیں، اس کا زہر انسان کو اگرچہ مارتا نہیں ہے لیکن مہینوں تک بے قرار ضرور رکھتا ہے۔ یہ زہر اگر جسم سے نہ نکالا جائے تو اس کی کاٹ والا حصہ زخم بھر جانے کے باوجود عمر بھر درد کرتا اور کھجلی کرتا رہتا ہے۔

میں نے رانی سے پوچھا کہ اسے سانپ نے کس وقت کاٹا تھا۔ رانی کی بجائے قریب کھڑی عورت نے جواب دیا، اب سے تقریباً آدھا گھنٹہ پہلے رانی جی کو سانپ نے کاٹا تھا۔ سانپ کی کاٹ کے زخم پر منکا لگانے کے لیے سانپ کے کاٹنے کے وقت کا تعین بڑا ضروری ہوتا ہے۔ کاٹ کا وقت ہمیں بتاتا ہے کہ جسم میں زہر کتنا پھیل چکا ہوگا۔ میں نے قریب رکھے ہوئے جار سے منکا نکال کر کاٹ پر لگانے کی بڑی کوشش کی لیکن نازک جگہ کی وجہ سے منکا زخم پر نہیں ٹھہرتا تھا۔ مجھے خطرہ تھا کہ اگر میں نے اپنا کام جلدی نہ کیا تو زہر پھیل جائے گا۔ میرے لیے اب ایک ہی راہ تھی کہ کاٹ سے زہر کو چوس کر نکالوں۔ زخم چوسنے کا مرحلہ چوسنے والے اور مریض دونوں کے لیے دشوار ہوتا ہے۔ چوسنے والے کو اپنے پھیپھڑوں کی تمام طاقت بروئے کار لا کر کسی طاقتور پمپ کی طرح زہر کو دورانِ خون کی مخالف سمت میں کھینچنا ہوتا ہے۔ جبکہ اس عمل سے مریض کو اپنے جسم کی تمام رگیں سکڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ زخم چوسنے کے لیے زخم کو چیر کر بڑا کرنا پڑتا ہے اور تمام زہر نکالنے کے لیے کاٹ کی گہرائی پر سانپ کے دانتوں کی گہرائی جتنا بڑا زخم لگایا جاتا ہے۔ زخم چوسنے کی مدت کا دارومدار زہر کی مقدار پر ہوتا ہے۔

چاقو سے سانپ کے دونوں دانتوں کے زخموں کو ملانے سے پہلے میں نے رانی سے کہا، میرے پاس آپ کی کاٹ سے چوس کر زہر نکالنے کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہیں ہے۔ اس سے پہلے میں کاٹ کے زخم کو چاقو سے کاٹ کر کچھ بڑا کروں گا۔ اس سے آپ کو تھوڑی سی تکلیف ضرور ہوگی لیکن یہ مرحلہ زہر چوس کر نکالنے کے لیے بہت ضروری ہے۔ آپ اپنا منہ مضبوطی سے بند کرنے کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے باندھ کر اپنے پیٹھ پر رکھ لیں۔ یہ ہدایت میں نے اپنے سانپ کاٹے کے ہر مریض کے زخم پر چیرا لگانے سے پہلے ضرور دیتا تھا۔ اس ہدایت کا مقصد مریض کو چاقو کی کاٹ کے لیے تیار کرنا ہوتا تھا۔

اس نے میری ہدایات پر عمل کیا تو میں نے پھرتی سے زخم کو چیرا۔ رانی کے بدن نے ایک جھرجھری لی لیکن اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ چاقو کے زخم سے جونہی خون رسنا شروع ہوا، میں نے زخم کے گرد اپنے ہاتھوں کا مضبوط ہالہ ڈالا اور زخم پر اپنے ہونٹ رکھے تو مجھے ایسا لگا جیسے میرے ہاتھ اور میرے ہونٹ برف کے کسی ٹکڑے پر پڑے ہوں۔ رانی کا جسم برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ جسم کا ٹھنڈا ہو جانا بھی سانپ ڈسے جانے کی کئی علامات میں سے ایک علامت ہے۔ سانپ کا زہر جیسے جیسے اثر کرتا جاتا ہے، جسم ٹھنڈا پڑتا جاتا ہے۔ جو بعض حالتوں میں موت کا پیش خیمہ یا موت کا باعث بھی بن جاتا ہے۔ زخم سے زہر کے مکمل اخراج کے لیے مریض کی حالت کے علاوہ مریض کے جسم کی گرمی کو بھی مدِنظر رکھا جاتا ہے۔ میں نے اپنے زہر چوسنے کے عمل کو اس وقت تک جاری رکھنا تھا جب تک مریض کے جسم کی گرمی بحال نہ ہو جاتی۔ زخم کے گرد اپنے ہاتھوں سے دباؤ ڈال کر اپنے ہونٹ زخم پر رکھ کر میں نے چوسنے کا عمل شروع کیا اور خود چوس چوس کر قریب پڑے ہوئے تھوکدان میں تھوکنا شروع کر دیا۔ مٹی کا یہ تھوک دان میں نے پہلے سے اسی مقصد کے لیے اپنے قریب رکھ دیا تھا۔

زخم چوسنے کے ابتدائی مرحلے میں رانی نے اپنا ایک ہاتھ میرے کندھوں پر رکھ دیا تھا۔ زخم چوسنے کے دوران رانی اپنے درد کا اظہار اپنے ہاتھ سے

میرے کندھوں کو دبا کر اور منہ سے کرب کی شدت سے سسکی لے کر کرتی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی کربیہ سسکیاں طربیہ سسکیوں میں تبدیل ہوئیں اور رانی کا ہاتھ میرے کندھوں سے سفر کرتا ہوا میری پیٹھ پر پہنچا اور پھر اس نے میری پیٹھ سہلانا شروع کر دی۔ اس کے ساتھ ہی رانی کے جسم کی برف پگھل کر تپنے لگی تھی۔ جسم میں تپش کا واپس آنا زہر کا اثر زائل ہونے کی دلیل تھا۔ میں نے زخم چوسنے کا عمل روک کر رانی کی جانب دیکھا۔ رانی کے چہرے سے ساڑی کا پلو ہٹ کر اس کے پاس پڑا تھا۔ اس کے لبوں پر نشیلی مسکراہٹ تھی اور وہ اپنی خمار آلود آنکھوں سے میرے سراپے کو تک رہی تھی۔ وہ مجھے دیکھنے میں اس قدر محو تھی کہ اسے اپنے ننگے پن کا احساس نہیں رہا تھا۔ پھر اس نے اپنا منہ میرے کان کے قریب کرتے ہوئے نرم اور نشیلی آواز میں کہا، میرا نام رمپا ہے خوبرو سپیرے۔ اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے میں نے اپنی نیم غشی پر قابو پاتے ہوئے رانی سے کہا، آپ اپنے کپڑے پہن لیں۔

میری آواز نے جیسے رانی کو الف لیلوی دنیا سے باہر نکال کر حقیقی دنیا میں واپس لا کر پٹخ دیا ہو۔ میری بات سے چونک کر اس نے اپنے سراپے کا جائزہ لیا اور پھرتی سے اُٹھ کر اپنے برہنہ جسم کو قریب پڑے ہوئے کپڑوں سے ڈھاپنے لگی۔ اس کی توانائی واپس آ چکی تھی جبکہ میں اپنی توانائی کھو چکا تھا۔ کسی دِق کے مریض کی طرح بڑی مشکل سے کُرتے کی آستین سے اپنے لبوں کا خون پونچھتے ہوئے میں جھونپڑی سے باہر نکل کر کسی اور طرف توجہ دئے بغیر سیدھا جھرنے پر جا کر پانی سے کُلی کر کے اپنے کُرتے کی آستین سے منہ صاف کرنے کے بعد نڈھال ہو کر وہیں بیٹھ گیا۔ سانپ کا زہر چوسنے والا کافی دیر تک زہر کے زیر اثر رہتا ہے۔ یہ اثر چند منٹوں سے کئی گھنٹوں تک برقرار رہتا ہے۔ باپو نے مجھے سہارا دے کر اُٹھایا اور جھونپڑی میں لے جا کر بستر پر لٹا دیا۔ جھونپڑی اس وقت تک خالی ہو چکی تھی۔

راجہ نے مجھے نڈھال ہوتے دیکھ کر باپو سے وجہ پوچھی تو باپو نے کہا، فکر کی کوئی بات نہیں یہ عارضی طور پر سانپ کے چوسے ہوئے زہر کے زیر اثر ہے، صبح تک ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے اپنی آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن توانائی نہ ہونے کی وجہ سے نہ کھول سکا۔ دوسری صبح باپو کی آواز سے میری آنکھ کھلی۔ باپو ہاتھ میں دودھ کا پیالہ تھامے میرے بستر پر بیٹھے تھے۔ میں بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب تمہاری طبیعت کیسی ہے رامو بیٹے؟ باپو نے سوال کیا۔ طبیعت اگر چہ بوجھل تھی لیکن میں خود کو اچھا محسوس کر رہا تھا۔ ٹھیک ہوں باپو، میں نے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی اٹھ کر جھرنے پر منہ دھونے چلا گیا۔ واپس آ کر میں باپو کے ہاتھ سے پیالہ لے کر آہستہ آہستہ دودھ پینے لگا۔ وہ اسکول سے چھٹی کا دن تھا اس لیے مجھے کوئی جلدی نہیں تھی۔ دودھ پینے سے طبیعت کا بوجھل پن بھی جاتا رہا۔

مجھے معتدل حالت میں دیکھ کر باپو کہنے لگے، رانی جی کے زخم کی نوعیت کی وجہ سے راجہ بھی عجیب مخمصے میں تھے۔ راجہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ رانی کے ننگے بدن کو کوئی غیر دیکھے یا ہاتھ لگائے۔ اگر چہ انہوں نے مجھے زخم دیکھنے کی اجازت دی تھی لیکن میں نے راجہ سے صاف کہہ دیا کہ نہ میں رانی کا زخم دیکھوں گا اور نہ ہی زخم کو ہاتھ لگاؤں گا۔ تمہارے بارے میں راجہ کو بتایا تو وہ کہنے لگا کہ وہ تمہیں دیکھنے کے بعد فیصلہ کریں گے کہ آیا تم رانی کا زخم اکیلے میں دیکھ سکتے ہو یا نہیں۔ اسی وجہ سے میں نے تمہیں بلا بھیجا تھا۔ تمہیں دیکھ کر راجہ نے بغیر کسی جھجک کے اجازت دے دی۔ جاتے وقت راجہ نے مجھے کچھ دان کرنا چاہا تو میں نے سختی سے منع کر دیا۔

پھر انہوں نے راجہ کا مزید تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ راجہ رمیش کا تعلق ریاست پٹنا سے ہے لیکن رہتے جنوبی افریقہ میں ہیں۔ جہاں سونے اور ہیرے کی کانوں میں ان کا حصہ ہے۔ راجہ کے حرم میں ایک وقت میں سولہ اور بیس سال کے درمیان پانچ رانیاں رہتی ہیں۔ سولہ سال کی عمر میں جو رانی ان کے حرم میں داخل ہوتی ہے اکیس سال کی ہوتے ہی اسے چلتا کرتے ہیں۔ راجہ کو صرف اور صرف کالے رنگ کی عورتیں پسند ہیں اس لیے اپنی زندگی افریقہ میں گزار رہے ہیں۔ راجہ یہاں اپنی نئی رانی کے ساتھ ہنی مون منانے آئے ہوئے ہیں۔ باپو سے باتوں کے دوران میں نے بے خیال میں اپنے کُرتے کی سامنے والی جیب میں ہاتھ ڈالا تو میرے ہاتھ میں ہیرے کی ایک انگوٹھی آئی۔ میں نے انگوٹھی جیب سے نکال کر باپو کو دکھاتے ہوئے کہا، یہ انگوٹھی میری جیب میں کیسے آئی باپو؟ باپو نے میرے ہاتھ سے انگوٹھی لے کر کچھ دیر کے لیے دیکھا اور کچھ سوچ کر کہنے لگے، اگر میری یادداشت غلط نہیں تو میں نے یہ انگوٹھی رانی کی انگلی میں دیکھی تھی۔ اگر ایسا ہے تو یہ میری جیب میں کیسے پہنچی؟ میں نے سوچتے ہوئے باپو سے سوال کیا۔ تمہارے بے ہوش ہونے کے بعد جب سب لوگ باہر جانے کو تیار تھے تو رانی ایک بار جھونپڑی میں تمہیں دیکھنے گئی تھی۔ میرا خیال اس نے یہ انگوٹھی جاتے جاتے تمہاری جیب میں اُڑس دی ہوگی، باپو نے جواب دیتے ہوئے انگوٹھی مجھے واپس کر دی۔ میں نے انگوٹھی باپو کو دیتے ہوئے کہا، یہ میرے کسی کام کی نہیں ہے۔ آپ اسے اپنے پاس رکھ لیں۔ اگر وہ لوگ آئیں تو انہیں واپس کر دیں۔ باپو کہنے لگے یہ میرے لیے اتنی ہی بیکار ہے جتنی تمہارے لیے۔ انہوں نے انگوٹھی لینے کی بجائے مجھے اسے کپڑوں والے گھڑے کی تہہ میں رکھنے کو کہا، اگر وہ لوگ واپس آئے تو میں گھڑے سے نکال کر انہیں ان کی امانت لوٹا دوں گا۔ میں نے باپو کے کہنے پر انگوٹھی گھڑے میں رکھ دی۔

سیاحوں کی وجہ سے باپو کا نام نہ صرف سندر بن کے علاقے میں یا صرف کلکتہ میں بلکہ پورے ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر کی دنیا میں جانا اور پہچانا جاتا تھا۔ ہمارے ہسپتال سے شفایافتہ مریض اور ان کے لواحقین ہمیں دنیا کے تمام ممالک سے شکریے کے خطوط بھی لکھتے تھے۔ کوئی ایسا دن نہیں گزرا جب ہمارے ہاں ڈاکیا ایک دو خط نہ لایا ہو۔ باپو خط پڑھتے ہلکا سا مسکراتے اور خط مجھے پکڑا دیتے۔ بیرونِ ملک سے آنے والے خطوط زیادہ تر انگریزی میں لکھے ہوتے تھے۔ شروع میں ان خطوط کو جوڑ توڑ کر کے پڑھتا تھا۔ اگر میں نہیں پڑھ سکتا تھا تو چاچو کے پاس لے جاتا۔ وہ نہ صرف خود پڑھ کر مجھے ان کا مطلب بتاتے بلکہ میرا

ذخیرۂ الفاظ بڑھانے کے لیے مجھے خطوط میں لکھے گئے الفاظ اپنے فقروں میں استعمال کرنے کو بھی کہتے۔

کامران نے آٹھویں کے بورڈ کا امتحان پاس کیا تو اسے ہائی سکول کے لیے پاہیرالہ داخل کرایا گیا جہاں وہ اپنی نانی کے ہاں رہنے لگا۔ کامران کے پاہیرالہ جانے کے بعد میں چاچو اور امی کی ساری توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ پکا ہوا کھانا بھی زندگی میں پہلی بار میں نے ماسٹر اسماعیل کے ہاں کھایا تھا۔ پہلے دن سے میں ہمیشہ دوپہر کا کھانا ان کے ہاں سے کھاتا۔ ابتداء میں وہ لوگ مجھے کھانے میں گوشت دینے سے کتراتے تھے۔ رفتہ رفتہ میرے کہنے پر انہوں نے مجھے گوشت بھی کھلانا شروع کر دیا۔ امی مجھے اپنے کامران کی طرح چاہتی تھیں۔ وہ میرے لیے نہ صرف کپڑے سیتی تھیں بلکہ میرے کپڑے دھونے کی ذمہ داری بھی انہوں نے سنبھال لی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ میں انہیں ان کے مرحوم بیٹے عمران کی یاد دلاتا ہوں۔ وہ اگر آج زندہ ہوتا تو بالکل میرے جتنا ہوتا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ عمران اپنی پیدائش کے تین دن بعد فوت ہو گیا تھا۔ امی کا لفظ میرے لیے بالکل اجنبی تھا لیکن ان کی خواہش پر میں انہیں امی کہہ کر مخاطب کرنے لگا۔ اپنا بچپن جنگل میں ایک مرد اور ایک ناگن کے ساتھ گزارتے ہوئے میں نے کبھی ماں جیسی شے کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ لیکن آمنہ کی بے لوث ممتا نے رفتہ رفتہ میری جوابی محبت جیتنا شروع کی۔ ان کی وجہ سے میں نے ماسٹر اسماعیل کو چاچو کہنا شروع کر دیا۔ سکول سے چھٹی کے دن میں ان کی کمی محسوس کرنے لگا اور سکول کے دوران جب بھی موقع پاتا ان کے ہاں چلا جاتا۔

سکول کی پڑھائی میں میری دلچسپی کا باعث امی، چاچو اور کامران تھے۔ وہی میرے سکول کی کتابیں، کاپیاں، تختی، قلم، دوات اور دوسری ضروریات کا ایسے خیال رکھتے تھے کہ مجھے ان سے کبھی کچھ مانگنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ انہی کی وجہ سے میں نے اردو، ہندی، بنگالی اور انگریزی زبانیں لکھنا اور پڑھنا سیکھ لیں۔ جہاں تک بولنے کا تعلق ہے تو میں ان ساری زبانوں میں دواخانے میں آنے والے سیاحوں کی وجہ سے پہلے ہی کافی شدھ بدھ رکھتا تھا۔ انہی دنوں ہمارے سکول کو مڈل سے ہائی سکول کا درجہ دے دیا گیا۔ میں آٹھویں سے نویں میں آیا تو چاچو نے مجھے سائنس کے مضامین دلوا دئے۔ فارغ اوقات میں یا چھٹیوں کے دنوں میں سکول کی لائبریری سے کتابیں لے جاتا اور ان کا مطالعہ کرتا رہتا۔ ہمارے سکول کی لائبریری اگرچہ اتنی بڑی بھی نہیں تھی اس کے باوجود اس میں کئی ایک زبانوں میں کتابیں تھیں۔ ایک وقت ایسا آیا کہ ہمارے سکول کی لائبریری میں کوئی ایسی کتاب نہیں بچی تھی جو میری نظر سے نہ گزری ہو۔

کتابیں پڑھنے کے ساتھ ساتھ باپو نے میری مراقبے کی تربیت بھی کرنا شروع کی۔ باپو نے مجھے مراقبے کی تربیت دیتے ہوئے بتایا کہ مراقبے میں انسان اپنی سوچوں پر قابو پانے کے بعد اپنے ذہن کو سوچ سے خالی کر دیتا ہے۔ سوچ سے خالی ذہن جلدی تازہ دم ہو جاتا ہے۔ میں نے ابتداء چند لمحوں کے مراقبے سے کی۔ وقت کے ساتھ ساتھ لمحے منٹوں اور منٹ گھنٹوں تک پھیل گئے۔ میں نے اپنے جاگنے کے دوران فرصت کے تمام لمحات مراقبے میں گزارنا شروع کر دیئے۔ مراقبے میرے لیے کسی طاقتور ٹانک کا کام کرتے تھے۔ مراقبے سے پہلے میں جتنا زیادہ تھکا ہوتا تھا مراقبے کے بعد میں خود کو اتنا ہی تازہ دم محسوس کرتا تھا۔ مراقبے میں جانے کا ایک اور فائدہ یہ بھی ہے کہ دورانِ مراقبہ، وقت کو پر لگ جاتے ہیں۔ مراقبے میں ڈوب کر انسان کسی ماحول میں رہتے ہوئے بھی ماحول سے دور رہتا ہے۔ جسمانی ماحول سے کٹ جانا ایک اچھے مراقبے کی سب سے بڑی نشانی ہے۔ اردگرد کے کھٹکے سے ٹوٹنے والے مراقبے گہرے نہیں ہوتے۔ میں سکول اور باپو کی مسلسل تربیت کے زیرِ اثر اپنی زندگی بڑی سادگی سے گزارتا رہا۔

ان دنوں میں نویں جماعت میں تھا۔ بہار کی آمد آمد تھی سیاحوں کے غول کے غول سندر بن آ رہے تھے۔ شکروار کا دن تھا مجھے سکول آتے ہوئے تقریباً نو برس ہو چکے تھے۔ پچھلے کئی برسوں سے رام داس کسی روبوٹ کی طرح مجھے سکول لاتا اور لے جاتا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان کوئی بات چیت نہ ہونے کے برابر ہوتی تھی۔ آج بھی میں حسبِ معمول رام داس کی سائیکل کے بستر بند پر بیٹھا تھا۔ ہماری سائیکل سکول سے واپس گھر کی جانب رواں تھی۔ رام داس اپنے راویتی انداز سے سائیکل چلا رہا تھا۔ ہم لوگ گھر سے کچھ قریب آ گئے تھے کہ اچانک جھیل کی جانب سے لوگوں کی چیخ پکار کی آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ رام داس نے اپنی سائیکل کا رُخ بے ساختہ جھیل سے آنے والے شور کی طرف موڑ دیا۔ چند لمحوں میں ہم جھیل کے کنارے پر تھے۔ کنارے کا منظر دیدنی تھا۔ کئی لوگ جھیل کے کنارے ایک جانب دیکھتے ہوئے خوف کے مارے چلاّ رہے تھے۔

میں نے ان کی نگاہوں کا تعاقب کرتے ہوئے دیکھا کہ ایک دس فٹ لمبا ایک فٹ کے لگ بھگ موٹا دریائی اژدھا ایک نوجوان کے سینے سے لپٹا ہوا تھا۔ سانپ نے نوجوان کے دونوں بازو سمیت سینے کو کچھ ایسی شدت سے جکڑا ہوا تھا کہ گھٹن کی وجہ سے نوجوان کی آنکھیں حلقوں سے باہر اُبلی پڑ رہی تھیں اور اس کا چہرہ دورانِ خون رک جانے کی وجہ سے کسی ٹماٹر کی طرح سرخ تھا۔ اتنی شدید گھٹن میں آواز تو کجا سانس بھی لینا ناممکن ہوتا ہے۔ سانپ کا منہ اور دُم پانی میں تھے جس سے ظاہر تھا کہ سانپ اپنے شکار کو کاٹنے یا کھانے کے بجائے دبوچ کر مارنے کی کوشش میں ہے۔ جبکہ اس کا شکار ٹخنے ٹخنے پانی میں بھی اپنا توازن کھو کر سانپ کی طاقتور جکڑ کے آگے تقریباً ہتھیار ڈال کر سانپ کے ساتھ پانی میں گرا جا رہا تھا۔ رام داس نے یہ سب کچھ دیکھا تو سائیکل کو ایک طرف پھینک کر رام رام کرتا ہوا خود بھی گر پڑا اور سائیکل کے ساتھ مجھے بھی زمین پر گرا دیا۔ مجھے ایسے لگا جیسے اس خوفناک منظر کی تاب نہ لا کر رام داس شاید اپنے ہوش کھونے والا ہے۔

اگرچہ سائیکل سے گرنے کی وجہ سے مجھے ہلکی سی چوٹیں ضرور آئیں تھیں اس کے باوجود میں گیلی زمین سے اٹھ کر کسی اور جانب توجہ دینے کی بجائے سیدھا سانپ کی جانب بڑھا جس نے اپنے شکار کے گرد دو لپیٹیاں ماری ہوئی

تھیں۔قریب پہنچ کر میں سانپ کی نبض ٹٹولنے کے لیے اس کے پیٹ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ایک اچھے نباض کو نبض ڈھونڈنے میں کبھی دقت نہیں ہوتی۔میں نے جونہی سانپ کی نبض پر گدگدی شروع کی، سانپ نے اپنے شکار پر پہلے اپنی گرفت ڈھیلی کرنا شروع کر دی۔پھر سانپ نے اپنے شکار کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا اور پانی میں غوطہ زن ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔یہ سب کچھ چند لمحوں میں ہوا تھا۔سانپ کا شکار سانپ کی گرفت سے آزاد ہو کر وہیں پانی میں گر پڑا تھا۔وہاں پر موجود لوگوں کے ذہن میں دور تک اس بات کا شائبہ بھی نہیں ہوگا کہ ابھی ان کی آنکھوں نے جو منظر دیکھا تھا وہ سچا بھی ہو سکتا ہے۔کیونکہ لوگ ایسے مناظر تو عموماً الف لیلوی کہانی میں سنا کرتے ہیں۔سارے تماشائی ابھی تک اپنی بینائی پر یقین کرنے یا نہ کرنے کی کشمکش میں مبتلا تھے۔شکار ابھی تک حواس باختگی کے عالم میں پانی میں گرا اپنے سانس درست کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔میں نے گرج دار آواز سے لوگوں کی توجہ سانپ کے شکار کی طرف مبذول کراتے ہوئے کہا، کوئی اس کو پانی سے نکال کر کنارے پر لے آئے۔میری آواز نے انہیں جیسے جھنجھوڑ کر جگا دیا تھا۔کنارے پر کھڑے تماشائی گرے ہوئے شکار پر اور مجھ پر گویا ایک ساتھ جھپٹ پڑے۔

اس سے پہلے کہ لوگ شکار کو پانی سے اُٹھا کر کنارے پر لاتے وہ کھانستا ہوا اور اپنے سانس بحال کرتا ہوا خود ہی کھڑا ہونے کی کوشش کرنے لگا۔اس کا چہرہ اب بھی ٹماٹر کی طرح سرخ تھا اور اسے ابھی تک سانس لینے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔اس نے ہاتھ کے اشارے سے لوگوں کو اپنے قریب آنے سے روکا، اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا اور پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا کنارے کی طرف جانے کی بجائے میری طرف بڑھا اور میرے قریب آ کر پانی میں ہی میرے سامنے گھٹنوں کی بل جھک کر کہنے لگا، گرو جی، آپ نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔مجھے اس وقت خیال آیا کہ میں بھی ابھی تک گھٹنوں گہرے پانی میں کھڑا تھا۔ایک پندرہ سالہ ناتجربہ کار لڑکا آخر اس کی بات کا کیا جواب دیتا؟ میں بے ساختہ کنارے کی طرف چل پڑا۔کنارے پر آتے ہی میں نے جھیل پر موجود اس واقعے کے شاہد سارے تماشائیوں کو اپنے آگے سجدہ ریز دیکھا۔رام داس ان سب میں پیش پیش تھا۔میں کسی طرح بھی لوگوں کے اس ردِّ عمل کے لیے تیار نہیں تھا۔اس لیے خوفزدہ ہو گیا اور اس خوف کے عالم میں کسی سے کوئی بات کئے بغیر اپنی جھونپڑی کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔

میں کسی دیوانے کی طرح بغیر پیچھے مڑ کر دیکھے بھاگ رہا تھا۔ایک ایسے دیوانے کی طرح جس کو خطرہ ہو کہ اگر وہ پیچھے مڑ کر دیکھے گا تو پتھر کا ہو جائے گا۔مجھے پتھر ہونے کے لیے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔لوگوں کے اپنے لئے عجیب سے رویے نے مجھے بالکل کسی برف کی طرح ٹھنڈا اور کسی پتھر جیسا بے جان کر دیا تھا۔بھاگنے کے دوران میں نے اپنے پیچھے کئی آوازیں آتی ہوئی محسوس کیں۔مجھے اپنے پیچھے کئی قدموں کی چاپیں سنائی دیں تو میں نے اپنے بھاگنے کی رفتار تیز سے تیز کر دی۔میں کھڈوں، جھاڑیوں، نالوں اور درختوں کی شاخوں سے الجھتا، ہانپتا اور پسینے سے شرابور اپنے گھر پہنچا تو میرے کپڑے پسینے سے شرابور اور کیچڑ سے لت پت تھے۔حواس باختگی کی حالت میں باپو کے سامنے کھڑا تھا۔باپو اس وقت سانپ کاٹے کے چند مریضوں میں گھرے تھے۔مجھے کسی باؤلے کی طرح دوڑ کر آتا دیکھ کر وہ بے چین ہو کر اپنی باہیں پھیلا کر میری طرف بڑھے۔میں نے خود کو ان کی آغوش میں پھینکا اور اس کے ساتھ ہی اپنے حواس کھو بیٹھا۔جیسے منزل پر پہنچ کر لٹا ہوا مسافر اپنی توانائی کھو بیٹھتا ہے۔

آنکھیں کھلیں تو میں نے خود کو کیچڑ سے لت پت کپڑوں میں اپنے بستر پر لیٹے ہوئے پایا۔باپو میرے بستر پر دائیں جانب سرہانے کی طرف بیٹھے میرے ہاتھوں کو سہلا رہے تھے۔چاچو اور امی میرے بائیں جانب تھے۔امی نے جسم پر ایک موٹی سی چادر کچھ اس انداز میں اوڑھ رکھی تھی کہ چادر نے ان کے چہرے کے علاوہ تمام جسم کو ڈھانپا ہوا تھا۔امی کا ایک ہاتھ میری پیشانی پر تھا اور دوسرے ہاتھ میں پانی کا کٹورہ تھا جس میں گیلا کپڑا تھا۔میرا بھیگا ہوا چہرہ اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ انہوں نے اسی کپڑے سے میرا چہرہ صاف کیا تھا۔امی کی بھیگی آنکھیں اس بات کی شاہد تھیں کہ وہ رو بھی رہی تھیں۔ان کے علاوہ کئی اور لوگ بھی مجھ پر جھکے ہوئے تھے اور کئی لوگوں کی آوازیں جھونپڑی سے باہر بھی آ رہی تھیں۔ایسے لگ رہا تھا جیسے لوگوں کا جم غفیر جھونپڑی کے اندر اور باہر موجود تھا۔میں نے خالی ذہن سے اپنے اطراف نظریں ڈالیں۔رام داس پر نظر پڑتے ہی جیسے میری یاداشت واپس آ گئی تھی۔بے حوش ہونے تک کے تمام واقعات ایک ایک کر کے میرے ذہن میں کسی فلم کی طرح ایک بار پھر چلنے لگے اور میں بے چینی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔مجھے آنکھیں کھولنے کے بعد اٹھتا دیکھ کر مجمع میں جیسے خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ایسے میں باپو نے میرا ماتھا چوما اور انہوں نے تمام لوگوں کو جھونپڑی سے باہر جانے کو کہا۔امی اور چاچو بھی باقی لوگوں کی ساتھ باہر جانے لگے تو باپو نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے میرے پاس رکنے کو کہا اور اس کے ساتھ ہی مجمع کو ایک بار پھر باہر جانے کی درخواست کرتے ہوئے خود بھی ان کے ساتھ باہر جانے لگے۔جانے والے لوگ جھونپڑی سے باہر نکلنے سے پہلے ایک عقیدت بھری نظر مجھ پر ڈالتے جاتے تھے۔کئی ایک نے تو جاتے جاتے میرے پاؤں بھی عقیدت سے چھوئے تھے۔لوگوں کے جاتے ہی امی مجھے اپنی بانہوں میں بھر کر رونے لگیں۔معلوم نہیں پھر مجھے کیا ہوا، میں بھی ان کے کندھوں سے سر ٹکا کر رونے لگا۔مجھے آج تک اپنے اُس دن والے رونے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔شاید زندگی میں پہلی بار مجھے رونے کے لیے کوئی کندھا میسر آیا تھا۔آج مجھ پر کندھے کی افادیت کا عقدہ کھلا تھا۔اگر آج سے پہلے میں کبھی نہیں رویا تھا تو شاید اس کی وجہ کندھوں کی غیر موجودگی تھی۔انسان تو انسان بادل کو بھی برسنے کے لیے زمین کے کندھوں کی ضرورت پڑتی ہے۔اگر اسے زمین کے کندھے میسر نہ ہوتے تو نہ جانے بادل کیسے برستا اور کس پر برستا۔جیسے بادل اپنے آنسو زمین کے کندھوں پر نکالنے کے

بعد ہلکے ہوکر ہوا میں تحلیل ہوجاتے ہیں، کئی منٹ تک رونے کے بعد میرا ذہن بھی ہلکا ہوگیا تھا اور میرے اندر کا غبار بھی ہوا میں تحلیل ہوگیا تھا۔

میں نے امی کے کندھوں سے الگ ہوکر ایک بار پھر اپنے اردگرد کا جائزہ لیا۔ باپو ابھی تک جھونپڑی سے باہر کھڑے لوگوں سے باتیں کررہے تھے۔ باہر کا شور خاصا مدھم پڑ چکا تھا جو اس بات کی دلیل تھا کہ بہت سے لوگ واپس جا چکے ہیں۔ میں نے اُٹھ کر باہر جانے کی کوشش کی تو چاچو نے مجھے روکتے ہوئے کہا، تم یہیں رہو میں شان جی کو تمہارے پاس اندر بھیجتا ہوں۔ وہ مجھے وہیں بٹھا کر جھونپڑی سے باہر چلے گئے۔ چند لمحوں میں وہ باپو کے ساتھ واپس آئے تو ان کے ساتھ رام داس کے علاوہ وہ نوجوان بھی شامل تھا جسے میں نے سانپ کے حملے سے بچایا تھا۔ اس بار وہ کچھ کہنے کی بجائے میرے سامنے پجاری کی طرح ہاتھ جوڑے کھڑا ہوگیا۔ رام داس بھی بالکل اسی انداز میں ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ باپو مجھے بتانے لگے کہ باقی سارے لوگ تو چلے گئے ہیں لیکن رام داس اور بلبیر سنگھ جی اور ان کے گھر والوں نے تم سے ملے بغیر جانے سے انکار کردیا۔ میں نے بتیرا کہا کہ آپ کل واپس آجائیں لیکن یہ کسی صورت ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ ایسے میں کئی مختلف العمر خواتین جھونپڑی کے اندر داخل ہوکر پجارنوں کی طرح میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہوگئیں۔

مجھے اب معلوم ہوا کہ جس شخص کو میں نے سانپ سے بچایا تھا اس کا نام بلبیر سنگھ تھا۔ بلبیر بیس سال کا نوعمر درمیانی قامت والا ایک خوش شکل نوجوان تھا۔ اس نے بوسکی کا کرتہ اور پاجامہ پہن رکھا تھا اور سر پر لال رنگ کی روایتی پگڑی تھی۔ بلبیر بڑی عقیدت سے میرے سامنے دونوں ہاتھ جوڑے ہوئے بولا، اب آپ آرام کریں پرماتما۔ میں کل آپ کے درشن کے لیے حاضر ہوں گا۔ اس کے ساتھ ہی بلبیر اور اس کے گھر والوں نے میرے پاؤں چھونے کی کوشش کی تو میں نے اپنے پاؤں سکیڑ لیے۔ ان میں موجود ایک معمر خاتون نے التجائی لہجے میں کہا مہاراج ہمیں اپنے چرن چھونے کی آگیا دیجیے۔ میں نے اپنے پاؤں سیدھے کر لیے۔ سب نے باری باری میرے چرن چھوئے اور دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد رام داس میرے قریب آکر کہنے لگا، پربھو میں کتنا بالک ہوں کہ آپ کو نہیں پہچانا۔ کبھی کوئی بھگوانوں کو اپنی پیٹھ دکھاتا ہے۔ میں روزانہ آپ کو اپنی پیٹھ پیچھے سائیکل پر لے کر آتا جاتا رہا ہوں۔ جب تک آپ مجھے شما نہیں کریں گے، میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ میری بجائے باپو نے جواب دیا۔ رام داس تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ تمہارے بھاگوں پربھو سالوں سے اسکول جارہے ہیں۔ تم نے ان کو اپنی گود میں کھلایا ہے اور تمہارے کارن پربھو نے آج کسی کی جان بچائی ہے۔ اگر تم نہ ہوتے تو پربھو نہ اسکول جاتے اور نہ آج کسی کی جان بچتی۔ پر شان جی یہ کام تو میں بڑے ماسٹر کے کارن اور اپنی نوکری کے ڈر سے کرتا رہا ہوں، رام داس نے باپو سے کہا۔ آج کے بعد میں یہ بڑے ماسٹر سے زیادہ اپنے لئے کروں گا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ شان جی، آپ نے میرے من کا بوجھ ہلکا کردیا۔ اب میں سکون سے گھر جاسکوں گا۔

یہ کہتا ہوا رام داس میرے قریب آیا۔ میرے پاؤں چھوئے اور اپنی سائیکل پر بیٹھ کر جانے لگا۔ وہ جاتے جاتے کچھ سوچ کر مڑ کر واپس آیا اور باپو سے پوچھنے لگا، شان جی ان تمام لوگوں کو آپ کے یہاں لاکر میں نے کوئی غلطی تو نہیں کی؟ میں نے ہی انہیں بتایا تھا کہ میں پربھو کو جانتا ہوں۔ نہیں رام داس تم نے کوئی غلطی نہیں کی، باپو نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ رام داس پھر چاچو کی جانب بڑھا اور کہا، بڑے ماسٹر جی میں آج تک پربھو کو اپنی نوکری کے خوف سے لاتا رہا ہوں۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ نے یہ کام سونپ کر مجھ جیسے عام سے شخص کو کتنا بڑا مان بخشا ہے۔ مجھے آپ سے صرف اتنی بنتی ہے کہ میرا یہ مان مجھ سے کبھی واپس نہ لیں۔ جب تک پربھو ہمارے سکول میں ہیں میں ہی انہیں سکول لانا اور لے جانا چاہتا ہوں۔ چاچو نے رام داس سے وعدہ کرتے ہوئے کہا تم چِنتا مت کرو رام داس۔ پربھو جب تک ہمارے سکول میں ہیں انہیں اسکول لانے اور لے جانے کی ذمہ داری تمہاری ہی ہوگی۔ رام داس خوشی سے چاچو کے سامنے کورنش بجاتا ہوا اپنی سائیکل پر بیٹھ کر گھر چلا گیا۔

رام داس کے جانے کے بعد باپو نے چاچو سے کہا، ماسٹر جی آپ لوگوں کا بہت بہت شکریہ کہ آپ یہاں تشریف لائے اور حالات کو سنبھالنے میں میری مدد کی۔ چاچو بولے، آپ ایسی باتیں مت کریں شان جی، رامو ہمارے لیے ہمارے کامران سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ ہمارے دلوں میں آپ دونوں کی جگہ اپنے گھر والوں کی سی ہے۔ ہمارے لیے اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہو گی کہ ہمیں آپ کی سیوا کا موقع ملا۔ جب مجھے رام داس نے آپ کا پیغام دیا تو میں تو کیا آمنہ بھی تڑپ کر رہ گئی۔ ہم ساری راہ دعا کرتے رہے کہ خدا کرے ہمارا رامو خیریت سے ہو۔ جب رام داس نے مجھے اس واقعے کی تفصیل بتائی تو مجھے اس بات کا اور زیادہ یقین ہوگیا کہ رامو کئی خداداد صلاحیتوں کا مالک ہے۔ اس نے جس چابکدستی سے ہمارے کامران کی جان بچائی تھی اسی دن میں نے اس کے اندر کا چھپا ہوا ایک بڑا انسان دیکھ لیا تھا۔ شان جی، آپ کی تربیت نے اس بچے کو گونا گوں کمالات سے مالا مال کیا ہے۔ ماسٹر جی میری زندگی کا مقصد صرف اور صرف رامو کو ایک بڑے دن کے لیے تیار کرنا ہے۔ دیوتاؤں نے اس کے لیے کچھ اور ہی لکھا ہے، باپو نے کچھ اور کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن نہ جانے کیا سوچ کر چپ ہوگئے۔

پھر کہنے لگے، ماسٹر جی میرا خیال ہے کہ آپ تھک گئے ہوں گے اور اندھیرا بھی چھانے والا ہے۔ اب آپ اپنے گھر واپس جائیں۔ کل آپ نے اسکول کا دھندا بھی چلانا ہے۔ ہاں میرا خیال ہے کہ ہمیں اب جانا چاہیے، چاچو نے کہا۔ امی نے کہا، بھائی صاب اگر آپ مناسب سمجھیں تو رامو آج رات ہمارے ہاں آجائے۔ ذرا ماحول کی تبدیلی سے اس کا جی بہل جائے گا۔ ہاں یہ بھی کوئی بُرا

خیال نہیں ہے، چاچو نے امی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔نہیں، اس تکلف کی ضرورت نہیں۔ میرے خیال میں رامو کو آج میرے قرب کی کچھ زیادہ ضرورت ہوگی، باپو نے جواب دیا۔اس میں تکلف کی کیابات ہے بھائی صاب، یہ اپنے گھر کا معاملہ ہے، امی نے کہا۔ ہاں بیٹی، گھر کا معاملہ ہی سمجھ کر میں نے آپ کو بلاوا بھیجا تھا۔اگر پھر ضرورت ہوگی تو میں آپ ہی کو تکلیف دوں گا۔اگر رامو کے بارے میں اپنے بعد میں کسی پر اعتماد کرتا ہوں تو وہ آپ دونوں ہیں۔ آپ جس پیار اور محبت سے اس پر نظر رکھتے ہیں، میں یہ اس کے روزانہ اسکول آنے اور جانے سے دیکھ کر اندازہ لگا چکا ہوں۔اس کے کھانے سے، اس کے کپڑوں سے اور سب سے بڑھ کر اس کی تعلیم سے مجھے آپ کی وجہ سے ہی بے فکری ہوئی ہے۔امی نے جانے سے پہلے میرے کیچڑ سے لت پت کپڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، چلو تم نہالو اور اور اپنے کیچڑ زدہ کپڑے مجھے دے دو تا کہ میں کل انہیں دھولوں۔ میں نے جھونپڑی میں رکھے ہوئے گھڑے سے کپڑے نکالے اور جھرنے پر نہانے چلا گیا۔ آج نہانے میں مجھے ایک عجیب سا لطف آ رہا تھا اس لیے میں ضرورت سے زیادہ دیر تک نہاتا رہا۔جسم خشک کر کے ستھرے کپڑے پہنے اور جھونپڑی میں داخل ہوا تو امی نے میرے گندے کپڑے سمیٹے اور مجھے بوسہ دیا، چاچو نے گلے لگایا اور پھر دونوں سائیکل پر سوار ہو کر اپنے گھر چلے گئے۔

جھونپڑی میں آ کر باپو نے مٹی کے کٹورے سے دارو نکال کر کٹورہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا، آج کا دن تمہارے لیے کافی بڑا تھا۔ دارو تمہارے عصاب پُرسکون کر دے گی۔ میں نے باپو کے ہاتھوں سے کٹورہ لیا اور باپو کے پاس ہی ان کے بستر پر جا بیٹھا۔ باپو نے دوسرے کٹورے میں اپنے لیے دارو ڈالی اور چسکیاں لے کر آہستہ آہستہ پینے لگے۔دارو کی ہلکی ہلکی چُسکیاں لینے کے ساتھ ساتھ میں نے باپو سے پوچھا، میری معمولی سی مدد پر آخر لوگوں کا ردِّعمل اتنا غیر معمولی کیوں تھا؟ دارو میرے جسم کے تمام اعضا کو ہلکی ہلکی تھپکیاں دینے لگی تھی۔میں نے اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ کر باپو کے جسم پر جیسے گرا دیا۔

باپو نے بڑی محبت سے میری پیٹھ سہلاتے ہوئے جواب دیا، میرے بچے، فطرت بعض اوقات ہمیں ایک ایسے مقام پر لے کر آتی ہے جس کے لیے ہم تیار نہیں ہوتے۔لوگوں کا ردِّعمل تو ویسا ہی تھا جیسا ہونا چاہیے تھا۔ دراصل کچی عمر کی وجہ سے تم اس بڑے واقعے کے لیے تیار نہیں تھے۔میری سمجھ کے مطابق آج کا واقعہ آج سے کئی سال بعد ہونا چاہیے تھا۔اور اگر یہ واقعہ آج سے دس سال بعد ہوتا تو تمہارے لیے اس کو تسلیم کرنا مشکل نہ ہوتا۔اگر اس واقعے کے صرف ہم دونوں ہی شاہد ہوتے تو صبح ہوتے ہی بھول گئے ہوتے۔لیکن اتنے گواہوں نے یہ واقعہ اب تک ہر طرف نشر کر دیا ہوگا۔میری تم سے بس ایک بنتی ہے کہ لوگ اس واقعے کو خواہ کتنا ہی اُچھالیں تو اس واقعے کو اتنی زیادہ اہمیت نہ دینا۔اس لئے کہ تم اس واقعے سے زیادہ بڑے ہو۔

چھوٹے لوگ اپنے اردگرد ہونے والے چھوٹے چھوٹے واقعات کو اچھال کر زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور بڑے لوگ بڑے بڑے واقعات کو بھی کم قابل توجہ سمجھتے ہیں۔اس واقعے کے بعد تم کوئی لوگوں کی نظروں میں جو کچھ بھی بن کر آ چکے ہو، اس کی وجہ سے تم پر دو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔پہلی یہ کہ تم اپنی نظروں میں راموہی رہنا اور دوسری یہ کہ اپنی کسی غیر ذمہ دارانہ حرکت سے لوگوں کی نظروں سے نہ گرنا۔ دنیا والے جتنی جلدی کس کو سر پہ چڑھاتے ہیں اس سے کہیں جلدی نظروں سے گرا دیتے ہیں۔اس کے ساتھ ہی باپو نے محسوس کیا کہ مجھے نیند آ رہی تھی، اس لیے وہ بڑی خاموشی سے مجھے اپنے بستر سے اٹھا کر میرے بستر پر لٹانے لگے تو میں نے سوال کرنے کے لیے اپنا منہ کھولنا چاہا ہی تھا کہ باپو بولے، ارے تم جاگ رہے ہو، میں تو سمجھا تھا تم سو گئے ہو۔نہیں میں آنکھیں موندے آپ کی باتیں سن رہا تھا، میں نے جواب دیا۔میرا خیال ہے کہ تم اب سو جاؤ تو بہتر ہوگا۔ باتیں کرنے کے لیے سارا جیون پڑا ہے۔ انہوں نے مجھے میرے بستر پر آرام سے لٹاتے ہوئے کہا۔ میں کوئی جواب دینے کی بجائے کروٹ بدل کر سو گیا۔

دوسری صبح باپو نے مجھے معمول سے پہلے ہی جگا دیا۔دودھ کا ناشتہ ہم نے اکٹھے بیٹھ کر کیا۔ناشتے کے دوران باپو نے مجھے میرے بے ہوش ہونے کے بعد کی روداد سناتے ہوئے کہا، کل جب تم گھر آ کر بے ہوش ہو گئے تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تمہیں اچانک کیا ہوا ہے۔میں ابھی اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ رام داس سو کے لگ بھگ لوگوں کے ایک جلوس کی قیادت میں یہاں پہنچا اور مجھے جھیل والا واقعہ بتایا۔ان کی باتیں سن کر ایک تو تمہارے بارے میری پریشانی ختم ہو گئی کہ تمہاری بے ہوشی کی وجہ ذہنی دھچکے کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ تم تھوڑی دیر بعد ہوش میں آ جاؤ گے۔میری اصل پریشانی کی دوسری اور بڑی وجہ اتنے سارے لوگوں کا جلوس تھا۔میں اگر جلوس کو دیکھتا تو تمہاری طرف سے غافل ہوتا اور اگر تمہاری تیمارداری کرتا تو مجھے خدشہ تھا کہ جلوس تمہیں پریشان کرے گا۔اس لیے میں نے رام داس سے کہا وہ ماسٹر جی کو بلا لائے۔رام داس کو بھیج کر میں نے لوگوں کو بتایا کہ تم گھر آنے کے بعد سے اب تک بے ہوش ہو۔لوگ تمہاری بے ہوشی کا سن کر زیادہ پریشان ہو گئے۔سب لوگ تمہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ میں نے لوگوں کو جھونپڑی سے باہر رکھنے کی جتنی کوشش کی، وہ اتنی شدت سے اندر آن کر تمہیں دیکھنے کے متمنی تھے۔ان میں سے کئی ایک نے وعدہ کیا کہ وہ تمہیں صرف ایک نظر دیکھنے کے بعد اپنی راہ لیں گے۔اسی طرح تقریباً پچاس کے لگ بھگ لوگ تمہیں دیکھ کر چلے گئے۔اتنے میں رام داس ماسٹر جی کو اور ان کی بیوی کو لے کر آیا۔انہیں تمہارے پاس ٹھہرایا اور باہر آن کر باقی لوگوں سے بنتی کی کہ وہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں۔چند لوگوں نے کہا کہ جب تک تمہیں ہوش نہیں آئے گا وہ یہاں سے نہیں جائیں گے۔کبھی میں باہر جا کر ان سے بات کرتا اور کبھی اندر آ کر تمہیں دیکھتا۔تم تقریباً دو گھنٹے بعد ہوش میں آئے۔ میں نے باہر آ کر تمہارے ہوش میں آنے کی اطلاع دی تو باقی سب چلے گئے صرف رام داس اور بلبیر سنگھ اور اس کے گھر

والے تمہارے چرن چھونے کے بعد جانا چاہتے تھے۔

باپو نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، آج تم حسب معمول سکول جانا۔تمہارا آج کا سکول جانا باقی دنوں سے مختلف نہیں ہونا چاہیے۔تم کسی کے سامنے کل کے واقعے کا بھی ذکر مت کرنا۔ اگر کوئی پوچھے بھی تو سنی ان سنی کرتے ہوئے بات کو ٹالنے کی کوشش کرنا۔سب سے بُرا وہ نیک کام ہوتا ہے جس کی تشہیر اس کے کرنے والا خود کرتا پھرے۔کل بلبیر نے اور رام داس نے مجھے پرماتما اور پربھو کیوں کہا تھا باپو؟ میں نے اپنی سمجھ کے مطابق باپو سے ایک مشکل سوال کیا تھا۔ باپو نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، میرے بچے تمہیں خواہ کوئی کسی بھی نام سے پکارے،تم صرف اور صرف رام ہو اور صرف رامو ہی رہنا۔ پرماتما، پربھو، گرو اور بھگوان تو بہت دُور کی بات ہے، انسان ہونا بھی خاصا مشکل کام ہے۔ ہماری باتیں ابھی جاری ہی تھیں کہ رام داس اپنی سائیکل پر مجھے لینے آ گیا۔ رام داس سائیکل کھڑی کر کے میرے قریب آیا بڑی عقیدت سے پہلے مجھے اور پھر باپو کو پرنام کرنے کے بعد کہنے لگا، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے پربھو؟ اگر آج آپ سکول سے ناغہ کرنا چاہیں تو میں کل پھر آپ کو لینے آ جاؤں گا۔ میں نے جواب دیا،نہیں رام داس میں اچھا بھلا ہوں اور چوکی سے اٹھ کر سائیکل کے بستر بند پر بیٹھنے کے لیے بڑھا تو رام داس نے کہا، میں اب کے بعد آپ کو اپنی پیٹھ پیچھے نہیں بٹھاؤں گا پربھو۔ میں نے آپ کے لیے مستری سے رات کو ہی ہینڈل والا بستر بند لگوایا تھا۔

میں نے سائیکل کے ہینڈل پر گدّی والا بستر بند لگا دیکھا تو اپنی مسکراہٹ نہ روک سکا۔ میں رام داس کا دل رکھنے کے لیے سائیکل کے ہینڈل پر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگا تو رام داس نے سائیکل کو بڑی مضبوطی سے سنبھال لیا۔ ہینڈل پر بیٹھ کر مجھے اپنا توازن برقرار رکھنا مشکل نظر آیا تو میں گرنے سے پہلے ہی ہینڈل سے اتر آیا اور رام سے کہا، ہینڈل پر بیٹھنے سے گرنے کا خطرہ ہے اس لیے میں تو پہلے کی طرح پچھلے بستر بند پر بیٹھ کر جاؤں گا۔ رام داس کو بھی شاید اس خطرے کا احساس ہو گیا تھا اس لیے مجھے وہ ایک بار پھر اپنی سائیکل کے پچھلے بستر بند پر بٹھانے کو تیار ہو گیا اور ہم سائیکل پر بیٹھ کر سکول کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں رام داس نے مجھ سے کہا، پربھو آپ نے اپنی انگلی کے ایک اشارے سے اتنے بڑے سانپ کو ایسے پچھاڑا جیسے کرشن مہاراج نے کالیے کو دریائے جمنا میں پچھاڑا تھا۔ ایسا کام انسان نہیں بھگوان کرتے ہیں۔ رام داس کی بات سن کر میں نے خود سے سوال کیا، کیا میں واقعی کرشن ہوں؟

دل میں یاد آئی تو جادو کی طرح پھیلے گی
اس اندھیرے میں یہ جگنو کی طرح پھیلے گی

دن کسی چہرۂ زریں کی طرح اُبھرے گا
رات اک ریشمی گیسو کی طرح پھیلے گی

دل کی جو بات ہے وہ دل میں چھپی رہنے دو
لب پہ آئے گی تو خوشبو کی طرح پھیلے گی

کہیں ٹھہرے گی نہ اک بوند لہو کی دل میں
نوکِ مژگاں پہ یہ آنسو کی طرح پھیلے گی

ہم گھریں گے جو بھنور میں تو ہماری خاطر
موجِ طوفاں کسی بازو کی طرح پھیلے گی

یہ تمنا کی صدا ہے نہ دباؤ اس کو
اس کی جھنکار تو گھنگھرو کی طرح پھیلے گی

مرا پیغام محبت کا ہے پیغامِ سحرؔ
یہ صدا وارثؔ و باہوؔ کی طرح پھیلے گی

پروفیسر حسین سحر (ملتان)

تیرگی میں روشنی مہنگی پڑی
چاند سے بھی دوستی مہنگی پڑی

اب زمیں پر پھر رہے ہیں در بدر
آسماں سے دشمنی مہنگی پڑی

لائی ہوں دونوں جہاں دے کر اُسے
کیا محبت بھی کبھی مہنگی پڑی

عمر بھر کے دُکھ گنوانے پڑ گئے ہیں
زندگی میں اِک خوشی مہنگی پڑی

ایک دل تھا اور وہ جاتا رہا
اہلِ دل کو دل لگی مہنگی پڑی

ہم نے تمثیلہؔ اُٹھائے دُکھ ہی دُکھ
سچ تو یہ ہے زندگی مہنگی پڑی

تمثیلہ لطیف (پسرور)

چند سیپیاں سمندروں سے

(سفرنامہ ساؤتھ امریکہ)

پروین شیر (امریکہ)

قسط......۱

جہانِ ابر

زمین سے دور۔۔۔آسمان سے قریب۔۔۔خلاؤں میں،خواب سی فضاؤں میں۔۔۔جسم بھی،ذہن بھی،دونوں پرواز میں تھے۔ذہن کی کائنات بھی عجیب ہوتی ہے۔شاید بیرونی کائنات سے کئی گنا زیادہ وسیع اور اتھاہ۔۔۔! خیالات کے ان گنت ستارے اور سیارے رقصاں رہتے ہیں۔سوالات کے لاکھوں سمندر،اور ان سوالات کی کوکھ سے جنم لینے والے ہزاروں نئے نئے سوالات کی ندیاں رواں رہتی ہیں۔

طیارے کی بہت چھوٹی سی کھڑکی سے بہت بڑے آسمان میں نگاہیں کھوگئی تھیں۔وہاں بادلوں کی اپنی ایک دنیا بسی ہوئی تھی۔کہیں کہیں بادلوں کے پہاڑ تھے اور ڈوبتے ہوئے سورج کی نرم،سنہری دھوپ ان پہاڑوں کی پرچھائیاں بنارہی تھیں۔عجیب خوابناک دنیا تھی۔بادلوں کی گوناگوں شبیہات کا ہجوم تھا۔کہیں دومحبت کرنے والے بانہوں میں بانہیں ڈالے ہوئے،کہیں خوفناک چہرے،کہیں پرندے،کہیں مویشی اور کہیں آسمان کی نیلی جھیل کے قریب کوئی بیٹھا ہوا۔۔۔یہ تھا جہانِ ابر۔۔۔پھر آہستہ آہستہ جب سورج اس آسمان سے کہیں دور چلا گیا تو بادلوں کی اس انوکھی دنیا نے سیاہ چادر تان لی تھی۔اُس نے بھی اپنی آنکھوں کے دریچے بند کر لیے تھے۔طیارہ اپنے آہنی پروں کو پھیلائے ہوئے پیرو،ساؤتھ امریکہ(Peru, South America) کی طرف اڑان بھر رہا تھا۔

یادِ ایام

طیارے سے باہر قدم رکھتے ہی وطن کی یاد نے اپنے آغوش میں لے لیا تھا۔ہواؤں میں وہی مانوس سی خوشبو،وہی رطوبت،وہی گہما گہمی،وہی طرح طرح کے شوخ رنگ ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔چہروں اور بالوں کی رنگت بھی اپنوں کی یاد دلا رہی تھی۔صرف پوشاک اور زبان مختلف تھی۔یہ ملک پیرو کے شہر۔۔۔لیما(Lima) کا ہوائی اڈہ تھا۔لیما شہر۔۔۔جو پے سیفک سمندر (Pacfic Ocean) کے حسین ساحل پر فخر سے مسکراتا ہے۔لوگوں کا جمِ غفیر تھا۔افراتفری تھی۔اوپر گول سی بالکنی میں بھی لوگوں کے سینکڑوں چہرے نظر آرہے تھے۔سبھوں کی نظریں کسی کے انتظار میں پلین سے باہر آنے والوں پر ٹکی ہوئی تھیں۔سبھوں کے چہروں پر کچھ عجیب سی خوشی کے تاثرات رقصاں تھے اور پروین کے دل میں وطن کی یادیں۔۔۔!اُس کی آنکھیں چاروں طرف اس نئی دنیا کو دیکھ رہی تھیں جو کچھ اپنی اپنی سی لگ رہی تھی۔سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس دنیا کا نظارہ کرے یا اپنے گائڈ کو تلاش کرے جو ہزاروں کی بھیڑ میں کہیں گم تھا۔جب تلاش شروع کی تو اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ہر طرف مختلف کمپنیوں کے رہبر اپنے اپنے مہمانوں کے نام کے جھنڈے اٹھائے ہوئے کھڑے تھے اور اپنے گروپ کے لوگوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے اُن کی منزلوں تک لے جارہے تھے۔رات کے گیارہ بج رہے تھے اور پروین کے گروپ کے گائڈ کا کوئی پتہ نہیں تھا۔انجانی زبان بے چارگی کے احساس کو گہرا کر رہی تھی۔سینکڑوں آوازوں کا ملاپ ایک شور بن گیا تھا۔۔۔گنگناتا ہوا شور۔۔۔یکایک ایک جھنڈی پر اُسے اپنا نام نظر آہی گیا جسے ایک جواں عمر شخص نے تھام رکھا تھا اور لہرا رہا تھا۔اُسے دیکھ کر تحفظ کا احساس ہوا۔کیونکہ زبان کا پُل اگر دو مختلف تہذیبوں اور نسلوں کے درمیان نہ ہو تو پھر دوسرے سیارے پر پہنچ جانے کا احساس اور بے سہارا ہونے کا احساس شدید ہو جاتا ہے۔وہ اُس سرزمین پر تھی جہاں کے باشندے آج بھی اپنی زبان فخر کے ساتھ محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔عالمی اور تجارتی انگریزی زبان لیٹن امریکہ کے لیے ضروری نہیں۔وہ لوگ اسپینی اور کیچوا زبانیں بول رہے تھے۔انگریزی کم کم اور کسی کسی پیشے کے لیے ضروری ہے جیسے سیاحوں کے گائڈ کے لیے اچھی انگریزی کا علم ضروری ہے۔وہاں وہ انجانی زبان کی گنگناہٹ سن رہی تھی اور زندگی میں زبان کی اہمیت کے متعلق سوچ رہی تھی کہ اگر اس کا سہارا نہ ہو تو زندگی کیا ہو؟ زمین پر بالکل تنہا ہونے کا احساس کیسا ہو؟ زبان ایک برقی تار ہے جس پر احساسات کی لہریں چل کر دوسروں تک پہنچ جاتی ہیں۔یہ تار ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہوتا ہے۔زبان اپنی مضبوط بانہوں میں لوگوں کو سمیٹ کر محفوظ رکھتی ہے۔

وین سیاحوں کو لے کر ہوٹل Antiqua Miraflores کی طرف رواں تھی۔ڈرائیور جس کا نام اوکٹیوا(Octiva) تھا اسپینی لہجے میں وقتاً فوقتاً باتیں کیے جاتا تھا۔پروین کی نظریں وین کی کھڑکی سے باہر اس نئی سرزمین کے ہر ذرے کو اپنے اندر جذب کر لینا چاہتی تھیں۔رات کے بارہ بجے لیما شہر کہیں اونگھ رہا تھا،کہیں سو گیا تھا تو کہیں کہیں پوری طرح بیدار تھا۔پے سیفک سمندر(Pacific Ocean) کے کنارے وین دوڑتی جارہی تھی جس میں سات سیاح مختلف ممالک کے اور بھی تھے۔یہ سب پروین کے گروپ کے ساتھی تھے جن کا ساتھ پیرو کی سیاحت تک تھا۔یہ وین ایک چھوٹی سی دنیا تھی مسافروں کی۔۔۔صرف پل بھر کے ساتھ کے لیے۔اس بڑی سی دنیا کی طرح۔۔۔جس کا ساتھ بھی کچھ ہی پلوں تک ہے۔دونوں مختصر۔۔۔کچھ کم کچھ زیادہ!

لیما کی سڑکیں اور عمارتیں کبھی ساؤتھ افریقہ کبھی کراچی تو کبھی دہلی جیسی نظر آرہی تھیں اور ہواؤں میں گہری رطوبت وطن کی بھیگی بھیگی ہواؤں کی یادیں لا لا کر بے چین کر رہی تھیں۔وہی مانوس بے ترتیبیاں،وہی سڑکوں پر

ٹریفک، وہی چھوٹی چھوٹی دوکانوں کے اسٹال۔۔۔کہیں ناہموار ٹوٹی پھوٹی سڑکیں، تنگ گلیاں اور بدرنگ در و دیوار۔۔۔اور کہیں عالیشان چمکدار عمارتیں، چکنی جگمگاتی ہوئی سڑکیں، سمندر، کنارے۔ وہی تضاد ہر طرف بکھرا پڑا تھا۔ سیاح کبھی کبھی ڈرائیور وکٹیوا سے پیرو کے متعلق سوالات کرتے جاتے تھے۔ وہ بتا رہا تھا۔۔۔ لیما شہر کی آبادی 9 ملین ہے۔ پیرو کو انکاز (Incas) کی سرزمین کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ انہوں نے 1438 سے 1533 تک اپنی عالیشان سلطنت قائم کی تھی۔ یہ نام۔۔۔ انکاز۔۔۔ ان حکومت کرنے والوں کے خاندان کی نشاندہی کرتا تھا۔ ان کی تواریخ تحریری صورت میں کبھی نہیں ملی۔ آج کل 80 فی صدی لوگ یہاں اسپینی زبان بولتے ہیں۔ کچھ اسکولوں میں کیچوا پڑھنا بھی ضروری ہے۔ اسکول کی تعلیم مفت ہے اور ضروری بھی۔ پیرو میں 83 فی صد بچے اسکول جاتے ہیں۔''

اوکٹیوا کی ان دلچسپ اور معلومات افزا باتوں نے ایئر پورٹ سے ہوٹل تک کے ڈیڑھ گھنٹوں کا راستہ جلد ختم کر دیا تھا۔ ہوٹل پیسی فک سمندر (Pacific Ocean) سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ جب وہ اندر داخل ہوئی تو وہاں بھی وطن یاد آیا تھا۔ اس کے کمرے کے سامنے آنگن تھا۔۔۔ بالکل وطن جیسا۔۔۔ اور اس کے درمیان ہرا بھرا اونچا درخت۔ جسے دیکھ کر بچپن کی یادوں نے تڑپا دیا تھا۔ وہ آنگن یاد آیا تھا جہاں وہ پلی بڑھی تھی۔۔۔ جس کے بیچوں بیچ آم کا درخت تھا اور گھر کے سامنے چھتنار جھومتا ہوا نیم کا درخت۔۔۔ جس کی سرسراہٹیں ہواؤں کی چھیڑ خانیوں سے اُس کے بدن میں سنسنی سی پیدا کر دیتی تھیں۔ یہاں بھی وہی نظارے تھے جو ساعت رفتہ کی یادوں میں الجھا رہے تھے۔ ایک انجانا سا احساس تھا۔ بے نام سی خلش تھی۔ کچھ سکون کچھ بے چینی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر اُس نے فون کر کے پانی کی بوتل منگوائی تو ہوٹل کی ریسپشنسٹ اسپینی زبان میں جواب دے رہی تھی اور وہ انگلش میں۔ دونوں اپنی اپنی زبانوں میں ایک دوسرے کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہے لیکن ناکام رہے تھے اور۔۔۔ وہ سوچنے لگی تھی کہ یہ تو جسمانی زبان کے مسئلے ہیں جو آسانی سے دور ہو سکتے ہیں۔ روحانی زبان کے مسئلے تاعمر برقرار رہتے ہیں۔ روح کا ہم زباں کہاں ملتا ہے اس دنیا میں۔۔۔ کسی کو شاید ملتا ہو۔ لیکن شاید۔۔۔!

سرِ ساحل۔۔۔(Lima لیما)

صبح ہوتے ہی لیما شہر میں گائڈ پیٹ ریشیو وی وانڈ (Patricio Vivanda) شہر کی سیر کے لیے وین لے کر آ گیا تھا۔ سب سیاح وین کی سیٹوں پر پیٹ ریشیو سے اس کے ملک کی باتیں کر رہے تھے۔ سوالات پوچھ رہے تھے اور وہ فخر سے جواب دے رہا تھا۔ پروین سوچ رہی تھی کہ یہ لوگ کتنے محبِّ وطن ہیں۔۔۔ وین سیاحوں کو تھامے ہوئے پورے شہر کا چکر لگا رہی تھی۔ جب کوئی اہم مقام آ تا تھا تو رک جاتی تھی۔۔۔ سیاح باہر نکل کر کچھ دیر تک اس جگہ کی اہمیت اور خصوصیت کے بارے میں معلومات حاصل کر لیتے تھے۔ کچھ دیر بعد 200 قبل مسیح میں بنی ہوئی پہاڑ کی بلندی پر ایک عبادت گاہ نظر آ رہی تھی۔ اس کا نام Vaca Punyana تھا۔ پیٹ ریشیو نے بتایا تھا کہ خدا کا گھر بلندی پر ہوا کرتا تھا اور اس کے قدموں تلے لوگوں کے گھر۔ وہ اس عبادت گاہ کو دیکھ رہی تھی اور صدیوں پرانی ہواؤں کو محسوس کر رہی تھی۔ پیٹ ریشیو ریڈیو کی طرح بولتا جا رہا تھا۔۔۔''لیما کو بادشاہوں کا شہر کہا جاتا ہے۔ یہ لیٹن امریکہ کے پانچ سب سے بڑے شہروں میں ایک ہے اور پیرو کا دارالسلطنت ہے۔ اسے ایک اسپینش فاتح فرانسسکو پیزارو Francisco Pizarro نے 1535 میں فتح کیا تھا۔ لیما پیرو کا صنعتی شہر ہے۔ آج کل لیٹن امریکہ میں سب سے اہم شہر لیما ہی ہے۔ یہاں بہت قدیم، مختلف اور شاندار گرجے اور محل ہیں جو 17ویں صدی میں بنائے گئے تھے۔''

کچھ دیر بعد لیما کی سب سے قدیم یونیورسٹی National University of St Marco کی زرد رنگ کی عمارت سامنے کھڑی تھی جو 1551 میں قائم کی گئی تھی اور آج تک قائم ہے۔ یہ عمارت آج بھی چمک رہی تھی۔ پروین یونیورسٹی کے کچھ عہدے داروں سے گفتگو کر رہی تھی۔ وہاں کے ادیبوں کے متعلق۔ وہ لوگ بے حد خوش مزاج تھے اور انتہائی فخر کے ساتھ بتا رہے تھے کہ ان کے ملک کا عظیم مصنف Mario Vargas Closa بہت ہر دل عزیز تھا۔ وہ ایک درجن سے زیادہ ناولوں کا مصنف، ڈرامہ نگار اور صحافی تھا۔ 2010 میں اسے ادبی نوبل پرائز سے نوازا گیا تھا۔ اس کے سب سے مشہور ناولوں کے نام ہیں۔۔۔The Story Teller اور The Green House جن کا موضوع پیرو ہے۔ ماریو ورگاس سیاست میں بھی دل چسپی رکھتا تھا لیکن اس میدان میں اُسے کامیابی نہیں ملی تھی۔ پیرو کا سب سے مشہور شاعر Cesar Vallejo ہے جس کے صرف تین مجموعے ہیں اس کا شمار بیسویں صدی کے نمایاں ترین شعرا میں ہوتا ہے۔ پیرو کی بہت کامیاب اور مشہور فلم ساز ادیب ماریو ورگاس کی بھانجی Claudia Llosa ہے جس کی فلم The Milk of Sorrow اکیڈمی ایوارڈ کے لیے ایک بہترین فلم کے طور پر Foreign Film کے لیے نامزد ہوئی تھی۔

سیاحوں کی وین اب لیما کے مین اسکوائر (Main Squire) کی طرف رواں تھی۔ یہ ایک وسیع اسکوائر ہے۔ خوبصورت پھول چاروں طرف مسکرا رہے تھے۔ درمیان میں کانسی کا خوبصورت فوارہ کھِل کھِلا رہا تھا۔ ہر طرف سیاحوں کی بھیڑ تھی۔ پروین ایک بنچ پر بیٹھ کر لوگوں کے چہروں پر ملے جلے تاثرات دیکھ رہی تھی۔ مختلف انجانی زبانوں کی آوازیں سن رہی تھی اور 1750 کے بنے ہوئے خوبصورت فوارے، اُبلتی ہوئی پانی کی پھول جھڑیاں بھی دیکھ رہی تھی۔ گائڈ کے مطابق یہ وسیع و عریض اسکوائر 1535 سے شہر کا مرکز ہے جہاں تفریح کے لیے کھلی ہوا میں تھیٹر اور Bull Fight جیسے کھیل وغیرہ کا بھی اہتمام ہے۔ پروین کے گروپ کے بقیہ سیاح تصویریں لینے میں مصروف تھے۔ پیٹ ریشیو (Patricio) نے پندرہ منٹ کا وقت دیا تھا اور اب وہ سبھوں کو کہیں اور لے

جانے کے لیے آ گیا تھا لیما کی خاص شناخت دکھانے۔ کچھ ہی دیر میں لیما کی خاص قدیم عمارتیں Colonial بالکنی کے ساتھ بے حد منفرد نظر آ رہی تھیں۔ یہ 16ویں صدی میں بنائی گئی تھیں۔ بالکنی پر لکڑی کی بنی ہوئی اسکرین تھی جس سے عورتیں اُس وقت پردے کے پیچھے سے سڑک کا نظارہ کیا کرتی تھیں۔ ایک قدیم، شاندار عمارت ایستادہ تھی جس کا نام Casa Riva Aguero تھا۔ جب اسپینش یہاں آئے تھے تو انہوں نے اس شہر کا نام Rimca سے Lima کر دیا تھا۔ رِمکا، کیچوا زبان کا لفظ ہے جو اُن کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ سیاحوں میں ایک عورت فرانس کی تھی جس کا نام کیتھی تھا۔ کیتھی بہت خوش مزاج اور ذہین تھی۔ وہ بھی گائڈ سے طرح طرح کے سوالات کرتی رہی۔

کچھ دیر بعد لیما کا سب سے مشہور خاص کر سیاحوں کا پسندیدہ شاپنگ پلازہ Larcomar استقبال کر رہا تھا۔ یہ پے سیفک سمندر کے کنارے ہے۔ اس لیے سیاحوں کا اڈہ ہے۔ نیلم جیسے پانی کی لہریں ساحل سے اٹھکیلیاں کر رہی تھیں۔ کھُلا کھُلا نیلا آسمان، چاروں طرف ساحلوں پر پائن کے درخت، سمندر سے آتی ہوئی بھیگی ہوائیں اور سامنے کھڑے ہوئے بلند پہاڑوں کے سلسلے۔۔۔ ساحلوں پر خوبصورت تگ برنگے چھاتوں والی قطاروں میں کیفے۔۔۔ پلازہ کی اونچی بالکنی سے یہ سب کچھ چھوٹے چھوٹے نظر آ رہے تھے۔ جیسے تصویریں ہوں۔ لیکن اس قدرتی حسن کی دوسری طرف تضاد تھا۔ تجارتی سماں تھا۔ دوکانیں قیمتی ڈزائنرس کی، چمکتا ہوا شاپنگ مال، ریسٹوران اور شورغُل۔ زبان کے علاوہ سب کچھ کینیڈا یا امریکہ جیسا تھا جسے دیکھ کر لوگ خوش تھے، مگن تھے لیکن کچھ ایسے دیوانے بھی تھے جو قدرت کے حسین نظاروں کی شراب نظروں سے پی رہے تھے اور نشے میں چور تھے۔

ہوٹل واپس جاتے ہوئے رات شباب پر تھی۔ ہر طرف قہقہے بکھرے ہوئے تھے۔ موسم خوش گوار تھا۔ سیاحوں سے بھرا ہوا شہر جاگ رہا تھا۔ کہیں موسیقاروں کے نغمے تھے جو سڑکوں پر اپنی فنکاری کا مظاہرہ کر کے پیسے کمانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کہیں جادو کے تماشے تھے کہیں کرتب کے۔ جسے جن چیزوں کا شوق تھا وہ اسے دیکھنے میں مگن تھا۔ ریسٹوران، کیفے تمام مقامات پر رنگ بکھیر رہے تھے۔ فضاؤں میں نغمے تیر رہے تھے اور پروین انسانی فطرت کی یکسانیت کے متعلق سوچ رہی تھی۔۔۔ زمین کے کسی بھی حصے پر جایئے زبان اور لباس کے علاوہ بنیادی طور پر ہر جگہ زندگی کے رنگ ایک ہیں۔

آسماں کے قریں۔۔۔ (پونو Puno)

لیما سے صبح ہی فلائٹ جولی آ کا (Juliaca) کے لیے تھی۔ ایئر پورٹ کی دنیا اسے پھر سے وطن کی یاد دلا رہی تھی۔ بے ترتیبیوں میں کتنا اپنا پن محسوس ہو رہا تھا جو کینیڈا میں کہیں نظر نہیں آتیں یہ بے ترتیبیاں۔ لوگوں کے جمِ غفیر میں، ماحول میں۔۔۔ ہواؤں میں۔ دو گھنٹے میں جہاز ''جولی آ کا'' پہنچ گیا تھا۔ یہ ایئر پورٹ بہت چھوٹا تھا اور بے حد پُرسکون۔

کوئی بھاگ دوڑ نہیں۔ کوئی شور شرابا نہیں۔ پونو میں ایئر پورٹ نہ ہونے کی وجہ سے ''جولی آ کا'' آنا پڑتا ہے جو پونو سے ایک گھنٹے کے فاصلے پر تھا کار کے ذریعہ۔ سب سیاح اب وین سے پونو جا رہے تھے جس کو قدرت نے آسمان سے قریب بنایا تھا۔ زمین سے چار ہزار میٹر یعنی تیرہ ہزار فٹ سمندری سطح سے اوپر۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں آنے کے لیے اور حفظ ماتقدم کے طور پر ایک دن قبل دوا شروع کرنی ہوتی ہے ان اونچی بلندیوں کی وجہ سے۔ اتنی بلندی پر جانے سے کوئی بے ہوش بھی ہو سکتا ہے سر درد اور چکر بھی آ سکتے تھے۔ وین ٹی ٹی کا کا جھیل کے ساحل پر چل رہی تھی اور گائڈ اپنے ملک پیرو کے ماضی کے دریچے وا کر رہا تھا۔ اس کی باتوں میں ڈوب کر پروین کو محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بھی اس صدی میں پہنچ گئی ہو۔ گائڈ کی آواز مائیک کے ذریعہ گونج رہی تھی۔۔۔ 1438 میں جب انکاز (Incas) کی سلطنت عروج پر تھی وہ صرف 1535 تک قائم رہی۔ کوئی نہیں جانتا یہ انکاز کہاں سے آئے تھے لیکن یہ ارسطور (Myth) ہے کہ ایک مرد اور عورت Manco Capac اور Mama Ocllo دونوں جھیل ٹی ٹی کا کا (Lake Titicaca) سے ایک دن نمودار ہوئے تھے۔ ان کا باپ سورج تھا جو خدا تھا۔ اسی خدا نے انہیں یہاں بھیجا تھا۔ انہیں ایک سونے کی چھڑی دی تھی جو جادو کی تھی۔ انہیں سورج خدا نے یہ کہا تھا کہ یہ چھڑی جس زمین پر گرے گی وہیں انکاز کی سلطنت قائم ہوگی۔''

رفتہ

پروین کے سیاحوں کے گروپ میں ایک جرمن لڑکی تھی۔۔۔ جولی۔ وہ بھی اس پر اسرار سلطنت اور اس کی تہذیب کے متعلق بہت متجسس تھی۔ کئی سوالوں کے جوابات گائڈیوں دے رہا تھا۔۔۔ ''انکاز کی زبان کیچوا تھی جو آج بھی بولی جاتی ہے۔ کیچوا کے معنی ہیں حکومت کرنے والا۔ Ruler یا Lord۔ ان کے عہد کے واقعات کے بارے میں کوئی تفصیل کہیں نہیں ملتی کیونکہ ان کی سلطنت میں تحریری زبان نہیں تھی۔ ان کے یہاں سکّے کا چلن بھی نہ تھا۔ کام کے عوض گورنمنٹ لوگوں کی بنیادی ضرورتیں پوری کیا کرتی تھی۔ معاشرے کا ڈھانچہ معاشی درجوں میں بٹا ہوا تھا۔ پہلے درجہ پر بادشاہ تھا۔ دوسرے پر اس کے رشتہ دار، تیسرے پر آرکی ٹیکٹ۔ جنہیں بہت عزت حاصل تھی ان کے ہنر کی وجہ سے۔ اس کے بعد کاشت کار تھے۔ ہر درجے کے لوگ اپنے اپنے گروپ کے ساتھ رہتے تھے۔ سب سے نیچے درجے پر غلام تھے۔

سرکاری زبان کیچوا تھی لیکن انکاز سے قبل جو قبیلہ تھا اُس کی زبان آئی مارا Aymara تھی۔ انہیں اپنی زبان برقرار رکھنے کی اجازت تھی۔ انکاز نے بغیر کسی بیرونی اثرات کے اپنی خوش حال سلطنت قائم کی تھی۔ جس میں ذاتی ملکیت کسی بھی مال و جائیداد کی نہیں تھی۔ پوری سلطنت ایک خاندان تھا اور گورنمنٹ اس کی سرپرست۔ لیکن یہ دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک خواص اور دوسرا عام لوگوں کا۔ اس طرح یہ ایک طبقاتی معاشرہ تھا لیکن یہ معاشرہ سبھوں کے لیے تحفظ

اور سارے حقوق مہیا کرتا تھا۔ اس سلطنت میں دس ملین افراد تھے۔ دولت مند لوگوں کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ ایک بیوی اور کئی داشتائیں رکھ سکتے تھے۔ لیکن عام لوگوں کو صرف ایک بیوی رکھنے کی اجازت تھی۔ لڑکے تعلیم حاصل کرتے تھے اور لڑکیاں گھر کے کام سیکھتی تھیں۔ اتنی بالترتیب سلطنت تھی کہ کوئی بھوکا نہیں رہتا تھا۔ ان کے تین بنیادی قانون تھے۔ جھوٹ نہیں، بیکاری نہیں اور بھرپور محنت اور ایمانداری۔۔۔ ان قوانین کے ساتھ زندگی گزارنا ان کا شیوہ تھا۔ ان کی شاندار سلطنت ختم ہونے کی خاص وجہ تھی خانہ جنگی۔ کیونکہ دو بادشاہ تھے دونوں سوتیلے بھائی تھے ان کے نام تھے ہواسکر Huascar اور اَتا ہولپا Atahualpa ان دونوں میں لڑائی ہوگئی اور اَتا ہولپا نے ہواسکر اور اُس کے خاندان کو ختم کر دیا۔ اس جنگ کے بعد انکاز کی طاقت کم ہوگئی۔ وہ کمزور ہوگئے۔ اس کا فائدہ اسپینیوں نے اٹھایا۔ انہوں نے آ کر قبضہ کر لیا۔'' گائڈ پیٹ ریشیو کی معلومات سے سب سیاحوں نے فیض حاصل کیا تھا۔ لیکن یہ داستان ختم ہوگئی تھی کیونکہ وین منزل مقصود۔۔۔ ہوٹل کسونا پلازہ (Casona Plaza) تک آ کر رک گئی تھی۔ جو زمین سے بہت دور۔۔۔ ہزاروں فٹ دور تھا۔ قدرت کی کاریگری تھی یہ۔ پہاڑوں سے گھرا ہوا پونو شہر۔ جھیل ٹی ٹی کا کا کے کنارے۔ تین ہزار آٹھ سو بیس میٹر سمندری سطح سے اوپر۔ یقین نہ آتا تھا کہ وہ زمین سے 13 ہزار فٹ دور پہاڑوں پر رہنے آئی تھی۔

کیرولینا

ہوٹل کے اندر داخل ہوتے ہی میزبانوں نے مسکرا کر خوش آمدید کہا تھا۔ وہاں کی خاص اور اہم کوکا چائے سے نوازا تھا۔ کیونکہ کوکا کی پتیوں سے بنی ہوئی چائے اونچے پہاڑوں پر رہنے والوں کے لیے بہت فائدہ مند ہوتی ہے۔ اس سے طبیعت خراب نہیں ہوتی۔ ہوٹل کے استقبال کرنے والے گرم جوش تھے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ شہر 1668 میں قائم ہوا تھا اور اس کی آبادی ابھی 160 ہزار ہے۔ اونچائی کی وجہ سے راتیں بہت سرد اور دن گرم ہوتے ہیں۔ آکسیجن کی کمی کی وجہ سے ہر کمرے میں اس کا انتظام تھا اور آکسیجن سلنڈرس رکھے گئے تھے۔ اگر کسی کی طبیعت زیادہ خراب ہو تو ہیلی کاپٹر سے نیچے لے جاتے تھے۔ سب سیاح گرم کوکا چائے پی رہے تھے جو سبز چائے جیسی تھی۔ کچھ دیر بعد اس گائڈ سے میٹنگ تھی جس کا ساتھ پیرو میں قیام تک تھا۔ یہ گائڈ۔۔۔ ایک بے حد خوش مزاج، نرم گفتار اور پرکشش سی لڑکی تھی جس کا نام کیرولینا آکوسٹا (Carolina Acosta) تھا۔ وہ ڈیڑھ گھنٹے تک اپنے ملک کی تفصیلات بتاتی رہی اور ضروری ہدایات، اہم معلومات سیاحوں کو دیتی رہی۔ لوگوں کے سوالات کے جواب میں وہ کہہ رہی تھی ''پونو میں زیادہ تر گیہوں کی کاشت ہوتی ہے۔ موسم میں تضاد ہے'' اس کی ہدایت تھی کہ پونو میں زیادہ سے زیادہ کوکا چائے پینی ضروری ہے۔ پروین نے دیکھا تھا وہاں کے باشندے کوکا پتیوں کو چبا رہے تھے۔ کیرولینا نے بتایا تھا یہاں لوگ اسے چبایا کرتے ہیں کیونکہ اس سے سانس لینے میں آسانی ہوتی ہے۔ کیرولینا بہت پرمذاق تھی۔ اس کے مطابق پونو کا موسم مردوں کے موڈ جیسا ہوتا ہے۔ کب کیا ہو جائے پتہ نہیں چلتا کچھ کہا نہیں جا سکتا اس لیے اس کا مشورہ تھا چھتری ہمیشہ ساتھ رہنی چاہیے۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ پہلے دن پونو میں آرام کرنا بہتر ہے تا کہ جسم اونچائی کا عادی ہو سکے۔ اس نے کچھ اسپینی زبان کا سبق بھی سیاحوں کو دیا تھا جس کا امتحان وہ دوسرے دن لینے والی تھی کیونکہ چند الفاظ سہولت کے لیے جاننا ضروری تھے۔ مثلاً کسی چیز کی قیمت پوچھنی ہو تو کہنا تھا کوآنٹو کوئسٹا (Cuanto Cuesta) یعنی اس کی کیا قیمت ہے۔ مجھے یہ پسند ہے۔ می گسٹا (Me Gusta) اور شکریہ کو گراسیاس (Gracias) کہنا تھا۔ بہت فینسی دوکانوں کے علاوہ ہر جگہ مول تول کرنا ضروری ہے۔ اگر 100 سولیز (Soles) جو وہاں کے سکے کا نام ہے کسی کی قیمت ہے تو اسے 50 سولیز کہنا چاہیے۔ وہاں ایک ڈالر کے 6 سولیز (Soles) تھے اس لیے چیزیں بہت کم قیمت کی محسوس ہوتی تھیں۔ پروین کو وطن کی پھر یاد آئی تھی جہاں خریداری میں Bargaining عام ہے۔ کیرولینا کے مطابق بغیر کسی ہچکچاہٹ کے مول تول کرنا ضروری تھا۔ اس نے سیاحوں کو خبردار کر دیا تھا کہ اگر طبیعت خراب محسوس ہو، سر درد یا چکر وغیرہ آئے تو آرام کرو، کوکا چائے پیو اور گھبراؤ نہیں کہ پونو آ کر ہر کوئی اس سے گزرتا ہے۔'' کیرولینا مستقل بول رہی تھی اور پروین کو اس کا اسپینی لہجے میں انگریزی بولنا بہت انوکھا اور دلچسپ محسوس ہو رہا تھا۔ اس میں دوسری خاص بات یہ تھی کہ پروین کو وہ بالکل ہم وطن لگ رہی تھی۔ گندمی رنگت، سیاہ زلفیں، سیاہ آنکھیں، نازک اندام، نرم لہجہ اور خوش مزاج۔ وہ اپنی ذاتی زندگی کے بابت بھی باتیں کرنے لگی تھی کہ وہ ویک اینڈ (Week end) آتا ہے تو اپنے گھر جایا کرتی ہے۔ اُس کی ماں بہت خوش ہوتی ہے۔ اس کے لیے خاص قسم کے کھانے پکاتی ہے۔ اس کی ماں اسپینی نہیں بول سکتی صرف کیچوا (Quechua) زبان جانتی ہے کیونکہ زیادہ تر بزرگ اور گاؤں کے لوگ صرف کیچوا بولتے ہیں۔ اور نئی پیداوار اسپینی۔ پیرو کی سرکاری زبان اسپینی ہے۔ شہر میں اب لوگ انگلش بھی بول لیتے ہیں۔ کیرولینا خبردار کر رہی تھی کہ وہاں جیب کاٹ لینا اور پرس چھین لینا عام ہے۔ لٹیرے اُس وقت تک گلا دبائے رکھتے ہیں جب تک کہ کوئی بے ہوش نہ ہو جائے۔ اس کے بعد اُسے آرام سے لوٹ لیتے ہیں۔ کیرولینا کی اس بات نے پروین کو چونکا دیا تھا۔ وہ کچھ اور ہی سوچ میں ڈوب گئی تھی کہ۔۔۔ کس طرح محبت کا ڈھونگ رچا کر کوئی کسی معصوم کے ہوش چھین لیتا ہے۔ جب ہوش آتا ہے وہ معصوم کھوکھلی ہو چکی ہوتی ہے اور تنہا کھڑی ہوئی خود سے ملتی ہے۔۔۔ کیرولینا یہ بھی کہہ رہی تھی کہ پیرو میں لوگ دعوتوں میں ایک ایک گھنٹہ دیر سے پہنچتے ہیں۔ یہی دستور ہو گیا ہے۔ پروین کو پاکستان، ہندوستان کے علاوہ کینیڈا کی اور پورے نارتھ امریکہ کی دیسی دعوتیں یاد آ رہی تھیں جہاں لوگ وقت سے بہت بعد میں پہنچتے ہیں۔ گویا پیرو کا بہت کچھ اپنا سا لگ رہا تھا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ کچھ بے ترتیبیاں، گندگی، مکھیاں، شور و غل۔۔۔ ان سب میں ایک اپنے پن کا احساس ہو رہا تھا کیونکہ یہ سب کچھ بچپن کے ساتھ جڑا ہوا ہے جسے پروین کبھی بھول نہیں پائی۔

''زخمِ تنہائی''

کرامت بخاری (لاہور)

جب مہکتا ہے زخمِ بینائی — پھیل جاتا ہے دشتِ تنہائی
وقت کی بے کنار وسعت بھی — دل کی جو لانیوں نے کم پائی
دیکھ سیراب ہو گیا صحرا — کام آئی ہے آبلہ پائی
کتنی مانوس ہو گئی مجھ سے — میری ہم عمر میری تنہائی
کوئی دیوانہ وار گلیوں میں — بانٹتا پھر رہا ہے دانائی
آج کے عشق کی فسوں کاری — کھو چکی اپنا حُسنِ زیبائی
باکرامت ہے میرا رنگِ سخن — غم کی دولت جو میرے ہاتھ آئی

○

عارف شفیق (کراچی)

ہے بہت نازک وہ احساسات کا — ذکر مت کر شہر کے حالات کا
پھول بھیجے اس نے مرجھائے ہوئے — جانے کیا مطلب تھا اس سوغات کا
تھے سبھی دن کے اجالوں کے اسیر — دکھ کوئی سمجھا نہیں ہے رات کا
ساری کچی بستیاں جل جائیں گی — پھر سے موسم آ گیا برسات کا
روز دنیا قتل کر دیتی ہے کیوں — میری سوچوں کا مرے جذبات کا
لکھ رہا ہوں میں نئی نسلوں کے خواب — اک خزانہ ہیں یہ امکانات کا
دکھ ہے یہ شیشے سے پتھر ہو گیا — خوش ہوں عادی ہو گیا صدمات کا
آدمی ہوں میں بھی سب سے مختلف — کیوں برا مانوں کسی کی بات کا
میرے اور عارف خدا کے درمیاں — اک سمندر ہے شعورِ ذات کا

○

ظہیر اقبال زیدی (میرپورخاص)

اُجڑے اُجڑے ہوئے خرابوں میں — زمیں کٹ گئی عذابوں میں
حسن کے دام بڑھ گئے ہونگے — صورتیں چھپ گئیں نقابوں میں
توسنِ عمر دم نہیں لیتا — پاؤں دُکھنے لگے رکابوں میں
جب ریاکاریوں کے چرچے ہوں — کیا بھلا رہ گیا ثوابوں میں
ہم نے یوں ہی کہی تھی جگ بیتی — تذکرے چھڑ گئے نِصابوں میں

○

پرتپال سنگھ بیتاب

(ممبئی، بھارت)

ریت ہے اور بیکرانی ہے اور صحرا کی کیا کہانی ہے
کھول کر دیکھو در مکانوں کے لا مکانی ہی لا مکانی ہے
کِسی دھرتی کے یہ نہیں ہوتے پانیوں کی یہی کہانی ہے
راستہ کس سے مانگتے ہو میاں بھیڑنے کِس کی بات مانی ہے
اپنے قدموں کے نقش غائب ہیں بے نشانی سی بے نِشانی ہے
برف ہے یہ جو رہ گئی جم کے اور جو بہہ گیا وہ پانی ہے
ہمیں کُچھ رُک گئے سے ہیں بیتابؔ ورنہ چاروں طرف روانی ہے

○

نعیم الدین نظرؔ

(میرپورخاص)

بے حسی کے ہاتھ، آہیں چھِن گئیں ابھرا جب سورج تو راتیں چھِن گئیں
اُس شجر کا حال پوچھو گے نہیں جس سے اُس کی زرد شاخیں چھِن گئیں
جب گیا اہلِ خرد کے شہر میں ایک دیوانے کی باتیں چھن گئیں
اس ادا سے ریگِ صحرا اُڑ گئی رہ نُما گم صم ہے راہیں چھن گئیں
پھنس گیا یادوں کے جب گرداب میں ڈھل گئے دن اور شامیں چھن گئیں
وقت کی بے رحم گردش میں نظرؔ کتنے ہی بچوں کی مائیں چھن گئیں

○

شگفتہ نازلی

(لاہور)

(محترمہ کشورناہید کی نذر۔۔۔بصد خلوص۔۔۔)

کوئی بھی پھُول کیاری میں کھِلتا ہُوا نہ تھا جیس کہ طاق پر دِیا جَلتا ہُوا نہ تھا
تصویر کا کوئی زاویہ بھایا نہ آنکھ کو پھر رنگ بھی تو مرضی کا گھُلتا ہُوا نہ تھا
چاہا بہت کبھی نہ اِس کی زد میں آ سکیں لمحہ کِسی بھی طور پر ٹلتا ہُوا نہ تھا
کب کب نہ سوچا، سوچ کے ہوتا رہا ملال سایہ وہ نارسائی کا ڈھلتا ہُوا نہ تھا
چاروں طرف سے پیڑ تھے گھیرے ہوئے اُسے اُس گھر کا راستہ کوئی کھُلتا ہُوا نہ تھا
کچھ شام سے ہی وہ یونہی لگتی اُداس تھی کچھ اوڑھنی کا رنگ بھی کھِلتا ہُوا نہ تھا

○

خورشیدانوررضوی (اسلام آباد)

پھر وہی اشکِ شب غم ہونگے — پھر وہی درد کے موسم ہونگے
پھر وہی ہجر کا نِشتر ہو گا — پھر وہی وصل کے مرہم ہونگے
پھر وہی محفلِ یاراں ہو گی — پھر وہی دلبر و ہمدم ہونگے
پھر وہی حُسن کے تیور خورشیؔد — پھر وہی عشق کے دم خم ہونگے
یہ سبھی کچھ تو یونہی ہو گا مگر — پھر خدا جانے کہاں ہم ہونگے
ہم یہ سمجھے پہ غلط سمجھے تھے — اِک مرے دل میں ہی ہم ہونگے
چاہنے والے تجھے ہونگے بہت — ہم سے اے دوست مگر کم ہونگے

○

ابنِ عظیم فاطمی (کراچی)

سوال یہ ہے کہ زندگی میں عذاب اتنے کہاں سے آئے — کوئی بتاؤ کہ خواہشوں کے گلاب اتنے کہاں سے آئے
عطا ہوئیں بے حساب ہم کو جو نعمتیں پھر یہ ماجرا کیا — جزا،سزا کی یہ بات اب کیوں حساب اتنے کہاں سے آئے
یقیں ہی ایمان کی کسوٹی ، اسی پہ ایمان کی پرکھ ہے — یہ سرکشی پھر کہاں سے آئی ، یہ خواب اتنے کہاں سے آئے
خدانے انساں کوشرف بخشا کہ ساری خلقت میں محترم ہے — کوئی بتائے جہاں میں آخر خراب اتنے کہاں سے آئے
اگر خطا ہے یہ آدمی کی کہ باغ ِ رضواں کو چھوڑ آیا — جزا کی باتوں کا کیا ہے مطلب ثواب اتنے کہاں سے آئے
ہمارا ہراک عمل ہے تابع اس ایک مالک کے حکم سے جب — سوال اتنے کہاں سے آئے جواب اتنے کہاں سے آئے
تمام انساں کے جدِامجد ہیں ایک آدمؑ تو پھر بتاؤ — یہ پیرزادے، یہ خان، سید، نواب اتنے کہاں سے آئے
چمن میں ہرسو ہے خار وخس کی جو حکمرانی تو پھر بتاؤ — یہ سوسن و موتیا و نرگس ، گلاب اتنے کہاں سے آئے
جومعاملے اسکے طےشدہ ہیں، جوفیصلے اس کےسب اٹل ہیں — تو پھر بتاؤ سراب اتنے، حباب اتنے کہاں سے آئے
یہ ساز ونغمہ حرام ہے جب عظیؔم کیا تم بتا سکو گے — یہ بانسری، یہ ستار، چنگ و رباب اتنے کہاں سے آئے

○

پرویزمظفر (برمنگھم)

غم کے بادل چھائے ہوئے — شعر ہمیں گرمائے ہوئے
آئینوں سے ڈرتے ہیں — سب سے دھوکا کھائے ہوئے
عجیب سلسلہ ہے، خواب ہے — ہجر کو زندگی سے ملائے ہوئے
وہ دو آنکھیں رکھتی ہیں — دل میں آس جگائے ہوئے
ہمدردوں سے دیکھے گا — اپنے زخم چھپائے ہوئے
ہر بستی میں کیوں پروؔیز — رہتے ہو اُکتائے ہوئے

○

شاہد رضوان

(چیچہ وطنی)

موجِ خوں سر سے گزرتی ہے کہیں جا کر کے
بام سے دھوپ اترتی ہے کہیں جا کر کے

دور افق پار کہیں قوسِ قزح محوِ خرام
وہ خوش انداز ٹھہرتی ہے کہیں جا کر کے

موجۂ بادِ بہاری کی طرح ، زلفِ دراز
ترے شانوں پہ بکھرتی ہے کہیں جا کر کے

اور بھی تار الجھتے گئے ، سلجھانے سے
زیست کی زلف سنورتی ہے کہیں جا کر کے

موجۂ بحر ہے اک سمت دعاؤں کا ہجوم
ڈوبتی ناؤ ابھرتی ہے کہیں جا کر کے

رات بھر مست نگاہوں کے لنڈھاتے رہے خم
یہ خماری سی اترتی ہے کہیں جا کر کے

وصل کی رات رہا ہجر کا کھٹکا ہر سو
نیتِ شوق تو بھرتی ہے کہیں جا کر کے

قطرہ قطرے سے ملے اور سمندر ہو ، پھر
موجِ صد رنگ بپھرتی ہے کہیں جا کر کے

آرزو دفن ہوئی خاک میں دب کر شاہدؔ
یہ تمنّا بھلا مرتی ہے کہیں جا کر کے

○

جمال زیدی

(اسلام آباد)

ہوائے شہر نے ہم سے حساب مانگا ہے
اگرچہ سہل ہے پر لاجواب مانگا ہے

جو رتجگے ہی ہمارے لیے تھا چھوڑ گیا
اسی نے نیند بھرا ایک خواب مانگا ہے

ہماری نظریں بھلا کب رہیں چمن کی طرف
بس ایک بار فقط اک گلاب مانگا ہے

یہ جانتے ہوئے ممکن نہیں دوبارہ مگر
ہر ایک شخص نے عہدِ شباب مانگا ہے

وہ جس کی آس میں تم نے بتائی عمرِ جمال
جوان ہوتے ہی اُس نے حجاب مانگا ہے

○

زاہدہ عابد حنا

(لاہور)

وہی اک سوختہ تن اور دل دلگیر دیکھو گے
محبت کرنے والوں کی یہی جاگیر دیکھو گے

ابھی تو گھر مہکتا ہے مری سانسوں کی خوشبو سے
ابھی آ جاؤ ورنہ پھر مری تصویر دیکھو گے

ملا دو گے اگر تم خاک میں ہم غم کے ماروں کو
تو پھر اس خاک میں خاصیتِ اکسیر دیکھو گے

عداوت کے لیے تو بس تمھیں اک نام کافی ہے!
سزا دینے سے پہلے تم کہاں تقصیر دیکھو گے؟

تمہارے دل میں اپنی وحشتیں یُوں چھوڑ جائیں گے
کہیں، چاہے چلے جاؤ، وہی زنجیر دیکھو گے

کبھی شدت، کبھی نرمی، کبھی ٹھنڈک، کبھی گرمی
محبت میں عجب ہر بار اک تاثیر دیکھو گے

حناؔ یوں سلسلہ چلتا رہے گا بزمِ ہستی میں
اگر ہم خواب دیکھیں گے تو تم تعبیر دیکھو گے

○

ابراہیم عدیل

(جھنگ)

جو محسنوں کو بھی چاہیں گرا دیا جائے
اب اُن کو کیسے بھلا حوصلہ دیا جائے

جو گھر سے ٹھان کے نکلیں چراغ گُل کرنے
بڑا غضب ہے انہیں راستہ دیا جائے

یہ پردہ کس لیے خالق اور اس کی خلقت میں
زمیں کے سر سے فلک کو ہٹا دیا جائے

ستم کو صبر سے بھی مات ہوتے دیکھی ہے
یہ کیا ضرور کہ محشر اٹھا دیا جائے

اسے وہ جرم بغاوت شمار کرتے ہیں
ورق پہ جو کوئی جگنو بنا دیا جائے

وقارِ غم کے لیے حرمتِ قلم کے لیے
جو اپنے پاس ہے وہ سب لگا دیا جائے

حویلیاں یہ ہماری پرند کہلائیں
اگر زمیں کو ہوا میں اڑا دیا جائے

عدیلؔ شب کو بھی آرام کی ضرورت ہے
یہ مشورہ ہے سحر کو جگا دیا جائے

○

آفتاب خان

(لاہور)

کسی پہ کُھل نہ سکا رازِ کائنات ابھی
نہاں پڑی ہے پَرت میں ہر ایک بات ابھی

سمجھ رہا ہے رہائی مجھے نصیب ہوئی
قفس میں قید ہے گو آدمی کی ذات ابھی

بدن کی کھال اُترنا اگرچہ سہل سہی
مگر یہ روح کہاں کھا سکے گی مات ابھی

ذرا سی دیر پرندوں تم آشیاں میں رہو
کہ کچھ شکاری لگائے ہوئے ہیں گھات ابھی

خزاں رسیدہ سمجھ کر نہ کاٹ دینا کہیں
کہ اُس شجر پہ سلامت ہیں چند پات ابھی

شبِ سیاہ کے کاکل سنوارنے کے لیے
گزارنی ہے کسی طور غم کی رات ابھی

تمازتوں کے لیے آفتابؔ کافی ہے
یہ سرد ہجر سے دے گا تمہیں نجات ابھی

○

ڈاکٹر افشاں شیخ

(کراچی)

سلسلے کتنے خیالوں کے بندھ جاتے ہیں
جب بھی تمنّا کے ہم پر پھیلاتے ہیں

جو بھی مناظر ماضی کے دل میں اُبھریں
ایسے مناظر دل کو لہو رُلاتے ہیں

انکی دید سے ہوتے ہیں ہم جب محروم
اُن کی یادوں سے دل کو بہلاتے ہیں

مجھے نہیں دنیا سے کوئی بھی شکوہ گلہ
میرے اپنے بھی پتھر بن جاتے ہیں

صبر کی سرگوشی میں اکثر اے افشاںؔ
ہم اپنے زخموں کو بھول جاتے ہیں

اِس دُنیا سے کر لیں کنارہ ہم افشاںؔ
دل میں خیال ایسے بھی کبھی آ جاتے ہیں

○

صدائے عندلیب برشاخِ شب

نوشادکامران
(الہ آباد، بھارت)

قدیم زمانے سے ہی کہانی اور قصے سے عورت کو ایک خاص نسبت رہی ہے۔محنت ومشقت کے اس دور میں زندگی اتنی آسان نہیں تھی اور آرام و آسائش کے سامان نہ تھے ۔ کہانیاں ہی اس دور کے انسان کی تفریح طبع کا واحد اور مستقل وسیلہ تھیں۔اس غیر مہذب سماج میں جہاں خورد ونوش ہی زندگی کا مقصد تھا،کہانیوں اور قصوں کی مقبولیت کا اندازہ ان تصویری خاکوں سے لگایا جا سکتا ہے جو مختلف مقامات پر پہاڑوں پر، پیڑوں کی چھالوں اور غاروں کی دیواروں پر کھینچے گئے ہیں۔فکرودانائی سے عاری یہ خاکے سیدھے سادے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔دھیرے دھیرے انسان مہذب ہوا، تہذیب زندہ ہوئی، سماج وجود میں آیا، رسم ورواج عمل میں آئے، انسان کے رہن سہن اور خورد ونوش میں بہت سی اخلاقی پابندیاں عائد ہوئیں، اسے اپنی آرزوؤں کی تکمیل میں دوسروں کے جذبات کا خیال رکھنا پڑا، اس طرح اس کی آزادی بھی سلب ہوئی، تو قصے اور کہانیوں میں بھی پابندیاں عائد ہوئیں اور کچھ آزادیاں سلب ہوئیں۔ان آزادیوں اور پابندیوں سے گزرتے ہوئے کہانی، خوبصورت اور سڈول ہوتی گئی اس میں فکرودانائی کے عنصر بھی شامل ہونے لگے۔

جدید انقلاب کے بعد دنیا میں کہانی کا جو روپ سامنے آیا وہ ناول کا روپ ہے۔عورت اپنی فطرت کی وجہ سے ہمیشہ قصوں، کہانیوں سے جڑی رہی۔ دنیا کی ہر بڑی زبان میں عورتوں نے ناول نگاری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔اردو میں بھی عورتوں نے مردوں کے شانہ بہ شانہ ناول تخلیق کئے۔رسیدۃ النساء بیگم ،سب سے پہلے ''اصلاح النساء'' لکھ کر خواتین ناول نگاروں کی میر کارواں بنیں۔ رشید جہاں، عصمت چغتائی، قرۃ العین نے بھی اس فن میں ید طولیٰ رکھتی ہیں۔اس کے بعد خدیجہ مستور، جیلانی بانو، جمیلہ ہاشمی، ذکیہ مشہدی، بانو قدسیہ، وغیرہ نے بھی اس فن میں اپنے ہنر کا مظاہرہ کیا اور کامیاب رہیں۔اسی روایت کی ایک کڑی شائستہ فاخری ہیں۔انھوں نے اردو اور ہندی ادب میں خوب لکھا اور ایک معتبر فکشن نگار کی حیثیت حاصل کی۔فکشن اور بالخصوص نسوانی ادب کے حوالے سے ان کا ایک اہم مقام ہے۔''صدائے عندلیب بر شاخ شب'' ان کا ''نادیدہ بہاروں کے نشاں'' کے بعد دوسرا مکمل ناول ہے۔

'صدائے عندلیب برشاخ شب' کا مرکزی کردار نازنین بانو ہے۔بچپن میں سوتیلی ماں کی بے توجہی اور باپ کی بے اعتنائی کی وجہ سے اس کے مزاج میں ضد اور کجی در آئی تھی، جو راتوں کو اس لئے جاگتی رہتی تھی کہ وہ ماں باپ کی تنہائی کے لمحوں کو دیکھ سکے۔یہی نازنین بانو جوان ہوتی ہے تو (اس کی دلچسپی کے بغیر) ایک امیر زادے کاشف اصغر سے منسوب کر دی جاتی ہے۔شادی کی پہلی رات ہی نازنین بانو کو خبر ہوجاتی ہے کہ شہر کے مضافاتی بستی کی ایک لڑکی ستارہ کاشف اصغر کی زندگی میں پہلے ہی سے ہے۔زندگی کا سفر طے کرتے ہوئے نازنین بانو ایک عام عورت سے ''فیملی ویلفیئر منسٹر'' بن جاتی ہے مگر ایک عورت ہونے کے ناطے وہ کاشف اور ستارہ کے رشتے کو لے کر ابلتی رہتی ہے۔نازنین بانو، کاشف، ستارہ کے مثلث پر ہی ناول کی عمارت کھڑی ہے لیکن اس کے علاوہ کئی چھوٹے چھوٹے پلاٹ اور کردار بھی ہیں جو ناول کے مرکزی پلاٹ کو آگے بڑھانے میں معاون ہوتے ہیں۔گھر سے شروع ہو کر سماج تک پھیلے اس ناول میں انسان کا سماج میں اپنا تشخص قائم رکھنے کی جائز و ناجائز کوششیں، ظاہر داریاں، سیاست و معیشت، آپسی رقابت، مرد عورت کے رشتے، جلوت اور خلوت کے جذبات ،نوک جھونک، بحث و تکرار اور حالات کی گنجفہ کے درمیان ایک عورت کے مسلسل تبدیل ہوتے ہوئے جذبات قاری کے دل میں گھر کر جاتے ہیں۔بچپن میں ماں، باپ کی بے توجہی اور جوانی میں شوہر کی بے اعتنائی، ظلم و زیادتی کی شکار ایک عورت کا خوشحالی کا سوانگ بھر کر حالات کو زیر نگیں کرنے کی داستان ناول میں بڑے دلکش انداز میں بیان کی گئی ہے۔پورے ناول کی فضا نسوانی جذبات سے معمور ہے اور شائستہ فاخری کی بولتی ہوئی تحریر، ان کا خاص رنگ اسلوب اس میں اور بھی جاذبیت اور حلاوت پیدا کر دیتا ہے نیز اس ناول میں تجسس کا پہلو اس قدر تیز ہے دو چار صفحات پڑھ لینے کے بعد جب تک اسے مکمل نہ کر لیا جائے وہ ذہن پر حاوی رہتا ہے۔

اپنے مواد کے اعتبار سے یہ ناول ایک عورت کی کہانی اسی کی زبانی ہے۔ایک عورت کی زندگی کے مسئلہ و مسائل، خوشی و غم اور خوف و امید، اس کی جسمانی خواہشات اور ذہنی ضروریات پر مشتمل یہ ناول جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے اس کا کینوس وسیع ہوتا جاتا ہے اور اس میں ہندوستان کے ہر طبقے کی نمائندگی ملنے لگتی ہے۔بالخصوص اعلیٰ سوسائیٹی کی معاشرت، زندگی جینے کا ان کا نظریہ، دولت کی فراوانی، سماجی رفاہی اقدام اور اس کے پس پردہ ذاتی مفادات کا تحفظ، سیاسی داؤ پیچ اور ادنی سوسائیٹی کی معاشرت اور نظریہ، آپسی چشمک و رقابت، رسم و رواج، مروت و محبت، پاک بازی و پراگندگی، عقائد و توہمات، میلے ٹھیلے اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ ناول کے ایک بڑے حصے کو محیط ہیں لیکن بڑی بات یہ ہے کہ ان کی یہی طرز معاشرت اونچے طبقے کے بہت سے افراد کی جھوٹی انا اور وحشی جذبات کا تسکین باعث بنتی ہے۔

''صدائے عندلیب برشاخ شب'' میں کئی طرح کے تجربے بھی کئے گئے ہیں۔پورے ناول کو انیس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر باب پر ایک عنوان دیا گیا ہے۔ابواب کی تقسیم اور اس پر عنوان لگانا نئی بات نہیں ہے لیکن ہر باب کا آغاز ایک تصویر، ایک نظم اور فلسفیانہ نثر سے کرنا بالکل نیا طریقہ ہے۔نظم اور اقتباس بہت بلیغ اور جامع خیالات پر مشتمل ہیں اور ان سے منسلک باب گویا انھیں کی تشریح و توضیح ہے۔اسی طرح ہر باب کے شروع میں پیش کردہ تصویر متعلق باب

کے عنوان کا حکم رکھتی ہے، اگر چہ ہر باب کا عنوان بھی مصنف نے قائم رکھا ہے۔

عصر حاضر کے سماجی منظر نامے پر لکھا گیا یہ عمدہ ناول کئی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ بادی النظر میں یہ ناول بہت جذباتی اور نسوانی تحریک کی اندھی تقلید کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس میں احتجاج اور 'کراہ' کی زیریں لہریں شدت سے محسوس ہوتی ہیں لیکن باریک بینی سے اس کا مطالعہ کرنے پر اس میں ایک طرح کا توازن واعتدال ملتا ہے جو اسے عام ناولوں سے ممتاز بناتا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''عورت کی آزادی کے معنی محض کسی تحریک سے ہی نہیں جڑے ہیں۔ جب تک خود عورت اپنی اس آزادی کو محسوس نہیں کرے گی تب تک نہ تو وہ اپنی زندگی اپنے طریقے سے جی سکے گی اور نہ مردوں کو اپنی اس آزادی کے معنی سمجھا سکے گی۔ آزادی بے سمت اڑان کا نام نہیں۔ بلکہ ذہنی جکڑنوں اور جسمانی زیادتیوں کے خلاف عورت کا احتجاج ہے۔.'' (صفحہ ۱۷۹۔۱۸۰)

شوہر کی زیادتیوں کو سہتے سہتے ایک دن نازنین کے اندر کی عورت بیدار ہو جاتی ہے اور وہ تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے اپنے شوہر کے آگے خود کو بچھا دیتی ہے۔

''میری آنکھیں اب انھیں خوابوں کو سجاتیں جو کشو جیسا مرد میری آنکھوں میں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ میرا مالک تھا۔ اور اسکی بات ماننا میری مجبوری تھی۔..''

ایک شخص کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھ لینا، خواہ وہ شوہر یا بیوی ہی کیوں نہ ہو ، مجبوری ہی ہو سکتی ہے، حقیقتاً مشترک خوشی تو اسی وقت ہو سکتی ہے جب من تو کا امتیاز مٹ کر دو روحوں کا اتصال وجود میں آئے۔ نازنین بانو ان خوش نصیب عورتوں میں سے نہیں تھی جو دنیاوی دولت کے ساتھ ساتھ عزت نفس کی بھی مستحق ہوتی ہیں۔ وہ اگر چہ دنیا والوں کی نظر میں بہت زیادہ عزت دار اور ثروت مند عورت ہے لیکن گھر کی چہار دیواری کے اندر اس کی کیا حیثیت ہے وہ نازنین بانو ہی جانتی ہے۔ اپنے شوہر کے طنز و تشنیع کے جملے اور حملے سے روز اس کی روح زخمی ہوتی ہے۔ روز روز کی تذلیل اسے اس بات کو محسوس کرنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ کاشف اصغر کی بیوی ہوتے ہوئے بھی اس کے گھر میں اس کی حیثیت ثانوی ہے۔ دراصل یہ کہانی نہ صرف نازنین بانو کی ہے بلکہ اعلیٰ سوسائٹی میں رہنے والی ہر اس عورت کی ہے جو اپنے شوہر کے ساتھ ایک چھت کے نیچے زندگی بسر کرتے ہوئے شوہر کی محبت بھری نظر کے لئے ترستی ہے۔ مردوں کے استحصال، ناانصافی، بے عزتی کو بھی وہ خندہ پیشانی سے قبول کرتی ہے۔ وہ مرد کے پھینکے ہوئے چلو بھر ترحم کے پانی سے اپنی روح کو شاداب کرتی ہے اور اس کی بھیک میں دی ہوئی مسکان سے اپنے خارجی وجود کی حنابندی کرتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ عورت اس ظلم کو نہیں سمجھتی یا وہ بیوقوف ہے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ اس کے باغی ہوتے جذبات اور احتجاج پذیر خیالات نسوانیت کے خول میں سمٹ کر دم توڑ دیتے ہیں۔ انھیں گھر کی محفوظ چہار دیواری تو ملتی ہے مگر ذہنی ناآسودگی کی وجہ سے یہ محفوظ دیواریں قید خانے کی مضبوط آہنی دیواروں میں منتقل ہو جاتی ہے ہیں، جہاں ہر طرف آدھی ادھوری خواہشوں اور ناکام آرزوؤں کے مہیب سائے لہراتے ہیں۔ یہ اذیت ناک لامحدود قید محض جسمانی نہیں بلکہ ذہنی اور تصوراتی بھی ہوتی ہے۔ وہ سماج کے بنانے ہوئے نسوانیت اور نزاکت کے مروجہ سوچ سے باہر نہیں نکل پاتیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی بھی طرح کا احتجاج اور اعتراض درج کرانے کا حوصلہ خود میں نہیں پاتیں۔ اور ان کی زندگی کا تبسم و تکلم بھی مردوں کے زیر عنایت رہتا ہے۔ ان حرماں نصیبوں کو شوہر تو ملتے ہیں مگر شوہر سے زیادہ مالک کے روپ میں، جو بیویوں کو نوکروں سے زیادہ عزت کا حامل نہیں سمجھتے۔ کیونکہ موجودہ سماجی ڈھانچے میں 'مرحلہ شادی کا ہو یا طوائفیت کا دونوں مورچوں پر عورت ہی خریدی اور بیچی جاتی ہے۔' مرد ان سے ان کی گونگی ہار تسلیم کروا کر ایک طرح کی طمانیت محسوس کرتے ہیں۔ عورت کے ضمیر کی پاسداری، اس کی خواہشات کی تکمیل اور اس کی عزت نفس کے تحفظ کو وہ غیر ضروری اور اپنے شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

''بہت سے مرد سارا دن عورت کو ذلیل وخوار کر کے رات کو شلوار کھول دینے کی درخواست کو اس کی عزت افزائی سمجھتے ہیں۔ میں یہ جانتی ہوں کہ عورت کے لئے عشق کا مطلب جسم کی مکمل سپردگی ہے۔ عورت بلاشرط اور بلا کم و کاست سب کچھ عشق کی بارگاہ میں قربان کر دینا اپنا ایمان سمجھتی ہے۔ لیکن....مرد ایک عورت سے چاہتا ہے.....اس کے جسم کے روئیں روئیں کی گرمی....اس کے جسم کی حدت، اس کے جسم کی وہ زبان جو بالکل ننگے لفظوں کے ساتھ باتیں کریں۔ ایک ایک اشارے پر کئی کئی زاویوں سے اس کے لئے دعوت تعیش پیش کرے......اور مرد جی بھر کر لطف اٹھاتا ہے اور جب اس کا جی بھر جاتا ہے تو عورت اس کے لئے ایک بیکار شے ہو جاتی ہے اور پھر اس کی ساری جذباتی ہم آہنگی اور جذباتی رشتے برف بن جاتے ہیں۔ مرد کبھی بھی عورت کے سرد جسم کو قبول نہیں کرتا لیکن عورت.....عورت مرد کو ہر صورت میں قبول کرتی ہے۔ اس پر قربان ہونے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتی ہے...ان دنوں، کاشف رشتے داروں سے ملنے اکیلے ہی جاتا کیوں کہ بھر پور خوراک لینے کے بعد وہ کافی چست درست ہو گیا تھا۔ اس کا مردانہ حسن بڑھ گیا تھا، وہ اچھے لباس پہنتا، پرفیوم لگاتا، گاڑی میں لوگوں کے دئے جانے والے تحائف بھرتا اور نکل جاتا۔ دیر رات تک جب واپس لوٹتا تو میں روتے روتے تھک چکی ہوتی اور بستر پر اپنے جسم کا ڈھیر لئے اونگھ رہی ہوتی۔ اس کے آتے ہی ہم دونوں کے بیچ تکرار شروع ہو جاتی۔ تکرار اور جھگڑے اس وقت تک چلتے رہتے جب تک میرے گالوں پر دو چار تھپڑ اور کمر پر دو چار لات نہ پڑ جاتی۔ کئی بار میرے ہونٹ بھی پھٹ گئے۔ خون کی باسی لکیریں میں صبح اپنے ہاتھوں سے رگڑ رگڑ کر چھڑاتی اور کوئی اینٹی سپٹک کریم لگا کر اس طرح روزمرہ کے کاموں میں لگ جاتی جیسے کل رات کچھ ہوا ہی نہیں۔'' (صفحہ ۴۰ تا ۴۲)

گھر کی چہار دیواری کے اندر تحفظ اور محبت کے نام پر مرد عورت کے ذہنی، جسمانی اور جنسی استحصال کو اپنا حق سمجھتا ہے۔ اس قدر ظلم، زیادتی اور ناانصافی کرنے کے باوجود مرد یہ خواہش رکھتا ہے کہ جب اس کی مرضی ہو وہ چند وعدہ ووعید سے عورت کو قائل کر لے اور عورت اپنے پورے خلوص کے ساتھ اس پر

اپنی محبت انڈیل دے۔عورتوں کے بارے میں مردوں کے اس تصور کے تضاد کو پورے ناول کے کینوس پر جگہ جگہ بے باکی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جس سے ان موقعوں پر ایک عجیب کاٹ پیدا ہوگئی ہے جو قاری کو سماج کے اس دوغلے رویہ پر غور کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

''مرد یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ عورتیں اگر فاحشہ نہیں ہیں تو تحفے تحائف سے نہیں بلکہ مرد کی دلجوئی سے خوش ہوتی ہیں۔ پیار محبت کی باتوں سے خوش ہوتی ہیں ۔ناز نخرے اٹھوا کر خود کو عظمت کی بلندیوں پر بیٹھی محسوس کرتی ہیں۔صدیوں سے مرد عورت کو برتتا چلا آرہا ہے اور عورت کی اتنی سی نفسیات نہیں سمجھ پایا۔کیوں کہ وہ جانتا ہے جب وہ چاہے گا پیروں تلے روند دے گا اور عورت ایک مسلے ہوئے کیڑے کی طرح دبک جائے گی اور جب وہ چاہے گا اسے پلکوں پر سجالے گا اور عورت اپنی خوش نصیبی پر رشک کرتے ہوئے پچھلا سب کچھ بھول جائے گی۔(صفحہ ۲۴۶)

لیکن جب ناانصافی انتہا کو پہنچ جاتی ہے اور ہر ممکن کوشش کے باوجود بھی جب ذلت و پستی کا یہ بوجھ ہلکا نہیں ہوتا تو صبر کا پیمانہ چھلک اٹھتا ہے۔نرم و نازک نازنین بانو کے وقار کو قائم کرنے کے لئے اس کی فطرت میں از خود کچھ ڈرامائی خصوصیات پیدا ہونے لگتی ہیں۔اس کے اندر کی وہ تمام نسوانی طاقتیں بیدار ہونے لگتی ہیں جن سے وہ ہمیشہ بیزار رہی تھی۔ایک تہذیب یافتہ گھرانے میں پرورش پائی ہوئی عورت کا اپنی فطرت کے خلاف خود میں ایک فاحشہ کی خصوصیات پیدا کرنا کس قدر اذیت ناک ہو سکتا ہے اس کا اندازہ شاہد رعنا، امراؤ جان ادا، بازارِ حسن، لیلیٰ کے خطوط کے مطالعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔لیکن وہاں عورت گھر کا دروازہ توڑ کر نکل جاتی ہے اور بازار قائم کرتی ہے، یہاں گھر کی چہار دیواری کے اندر اپنے شوہر کو رام کرنا مقصود ہے۔ وہاں یہ باتیں حقیقی ہیں جن کی معاشی توجیہات ہیں، یہاں یہ ایک سوانگ ہے جو شوہر کے ظلم و زیادتی، ذلت واستحصال کے برعکس اپنے تشخص اور وقارِ نفس کے لئے رچا جا رہا ہے۔نازنین اپنے شوہر کے ساتھ تہذیب سے پیش آتی تھی اور خوار ہوتی تھی۔چنانچہ مجبوراً اسے عورت کے ان منفی ہتھیاروں کو اپنانا پڑا جس سے اس نے ہمیشہ نفرت کیا تھا۔لیکن یہ بھی سچ ہے کہ کبھی کبھی برائی کو برائی سے ہی کاٹا جاتا ہے۔

نکالا کانٹے سے کانٹا کبھی کبھی ہم نے
چبھے تو دونوں، مگر ایک مہرباں ٹھہرا

غلام مرتضیٰ راہی

اس نے اپنے قدسی صفات اور شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر اپنی طبیعت کو انھیں راستوں پر رواں کیا جن پر چل کر وہ کاشف اصغر کے گھمنڈ کے پہاڑ پر کمند ڈال سکے۔نازنین بانو کو اس نے تھپک کر ہمیشہ کے لئے سلا دیا اور اس کے اندر سے ایک نئی عورت بیدار ہوئی۔یہ مسز کاشف اصغر ہے...جو وقت کی جلی اور حالات کی چھلی وہ عورت تجربہ کار ہے جو مرد کی نس پکڑے بغیر اس کا حال بیان کر سکتی ہے۔

''جس عورت نے مرد کو سمجھ لیا، اس عورت کیلئے کتنا آسان ہو جاتا ہے اس مرد کو اپنی انگلی پر نچانا۔میں بھی کتنی بیوقوف تھی۔اپنی انا کی جھوٹی لڑائی لڑتی رہی۔ارے وجود تو باہر ثابت ہوگا مگر اس سے پہلے گھر کی چہار دیواری کی جدوجہد سے تو پار اتر لیں۔بند کمرے میں کون دیکھ رہا ہے کہ باہر گرجنے برسنے والی باوقار عورت بستر پر کس فاحشہ کا کون سا سوانگ رچ رہی ہے۔میں نے اب تک کوئی سوانگ نہیں کھیلا تھا اس لئے کشو جیسے مرد کے ہاتھ کا کھلونا بنی اپنی زندگی فٹ پاتھ پر لا رہی تھی مگر اب نہیں۔اب میں سوانگ کی ایک ماہر کھلاڑی بنوں گی اور میں نے آج اپنا پہلا داؤ کھیلا تھا۔

اس درمیان میں نے خاص طور سے غور کیا کہ کشو کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔یعنی اس نے شراب پی رکھی ہے۔میرے علم میں پہلی بار یہ ہوا تھا۔میں نے اسے کبھی شراب پیتے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے کوئی دکھ نہیں ہوا۔ پیتا ہے تو پئے کمبخت، اگر کبھی میرے ہاتھ سے پینا چاہے گا تو میں اپنے ایک نئے سوانگ کے ساتھ اسے ضرور پلاؤں گی اور پلا پلا کر اس کے سر پر ناچوں گی۔ مجھے لگا کہ نازنین بانو ہمیشہ کے لئے گہری نیند سونے کی تیاری کر رہی ہے۔کوئی افسوس نہیں، مرتی ہے تو مر جائے مگر مسز کشو زندہ رہے گی اس وقت تک اپنے سوانگ سے اپنا رتبہ اپنی شان بنائے رکھے گی جب تک اس کے جسم میں ایک بھی سانس باقی رہے گی۔میں بہت ڈرامائی انداز میں پچکار رہی تھی، دلار رہی تھی، جنسی خواہش ابھار رہی تھی تا کہ اسے میری ضرورت کا بھی احساس ہو۔'' (صفحہ ۱۷۵)

دیگر اہم نسوانی کرداروں ستارہ، نیفو، بھانکی، چمپا کاکی اور جھگی بستی کی سیکڑوں عورتیں بھی مردوں کے ظلم و جبر اور استحصال کا شکار دکھائی گئی ہیں۔بالخصوص ستارہ کی زندگی مردوں کے فریب اور دھوکے میں پھنس کر ذلت و رسوائی کی داستان بن جاتی ہے۔وہ کھلے بندوں گناہ کے راستے پر چلنے لگتی ہے۔ناول کے آخر میں وہ اپنی دوشیزگی کی ردا چاک کرنے والے پہلے مرد کاشف اصغر سے HIV کا مرض بانٹ کر اپنی زندگی بھر کی ذلالت کا بدلہ لیتی ہے۔یہ ایک ایسا گناہ ہے جسے بڑے سے بڑا رحم دل بھی معاف نہیں کر سکتا۔لیکن شائستہ فاخری کی تحریر کا جادو ہے کہ اتنے بڑے گناہ کا ارتکاب کرنے کے باوجود قاری کی ہمدردی ستارہ کی طرف ہی رہتی ہے۔نیفو کی شادی اور طلاق کے بیان میں شائستہ فاخری نے اختصار سے کام لیا ہے۔ایسے موقعوں پر جہاں اناڑی ادیب کا قلم بہک جاتا ہے اور دنیا بھر کی غیر ضروری تفصیلات سے اپنی تخلیق کو بوجھل کر دیتا ہے۔یہ شائستہ فاخری جیسی پختہ کار ناول نگار کا فن ہے کہ انھوں نے ان واقعات کی اتنی ہی تفصیل بیان کی ہے جتنی نازنین بانو اور کاشف مرزا کی زندگی اور رشتے کو متاثر کر سکتی تھیں۔شائستہ فاخری نے اس ناول میں عورتوں کے اندر طلاق کے خوف کو بڑی دردمندی سے بیان کیا ہے۔طلاق عورت کو دھمکانے کے لئے مرد کا سب سے آسان ہتھیار ہے۔یہ ایک ایسی برہنہ تلوار ہے جو عورت کے سر پر ساری عمر لٹکتی رہتی ہے۔طلاق کے خوف کو شائستہ فاخری نے ایسے دلدوز انداز میں بیان کیا ہے کہ پڑھنے والے کا دل پگھل جاتا ہے۔

''اگر کشو پاس ہوتا تو میں اس کے قدموں میں گڑگڑا کر اس سے معافی مانگتی۔اس سے کہتی مجھے اپنے گھر کی داسی بنی رہنے دو۔طلاق دیکر مجھے بے

گھر مت کرو۔ میری زندگی کو چوراہے پر لاکر مت کھڑا کرو، میرے بدن کو سڑک کے کنارے کا سوکھا ناٹا ٹھونٹھ مت بناؤ کہ وہ ہر ایک کے لئے سُلجھ شو چالے بن جائے۔ بیتے دنوں میں جو ذہنی تکلیفیں اٹھائیں تھیں، اس نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا۔

لوگوں کی نگاہوں، لوگوں کی پھبتیوں، آڑے ترچھے اشارے .....
اف... ایک عورت کو مردوں کی دنیا میں قطرہ قطرہ کتنا زہر پینا پڑتا ہے۔'' (صفحہ ۱۶۹)

یہ سچ ہے کہ شائستہ فاخری نے اس ناول کے ذریعہ عورتوں کے اوپر ہورہے ظلم و زیادتی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا ہے اور موجودہ دور کے مردانہ سماجی ڈھانچے میں عورت کو اپنی طاقت پہچاننے کی ترغیب دی ہے۔ لیکن یہ معاملہ یک طرفہ نہیں ہے شائستہ فاخری اس بات کا اعتراف کرتی ہیں کہ مرد اور عورت ایک دوسرے کے بنا ادھورے ہیں۔ ایک کی تکمیل کے لئے دوسرے کا وجود ضروری ہے۔ انھوں نے جہاں مردوں کی نفسیاتی کمزوریوں اور جبلی بہیمیت کو بے نقاب کیا ہے وہیں عورتوں کی فطری کجی کو بھی ظاہر کرنے سے خود کو روک نہیں سکی ہیں۔ انھوں نے اس بات کا بھی واضح اشارہ کیا ہے کہ جہاں سیدھے سادے مرد ہوشیار عورتوں کے ہتھے چڑھتے ہیں تو ان کا بھی استحصال ہوتا ہے۔ چنانچہ ناول میں رحمو بابا، ڈاکٹر رحمٰن، گڈو، وولکی جیسے مرد کردار بھی ہیں، جو سیدھے سچے مرد ہیں۔ الزابتھ کی بہو نے انھیں ضعیف العمری میں ان کے بیٹے سے جدا کردیا تھا۔ وہ معمر خاتون گھر کا سارا کام کرنے کے ساتھ ایک ہسپتال میں نوکری بھی کرتی تھیں۔ لیکن ان کی بہو کو رحم نہیں آسکا۔

''ان کا بیٹا کافی فرمانبردار تھا مگر بہو نے ایسی گوٹیاں بچھائیں کہ بیٹے کو بہت مجبوری میں اپنی ماں کے سینے پر گھنٹوں آنسو بہانے کے بعد ماں کا یہ فیصلہ ماننا پڑا کہ اسے اپنا گھر چلانے کے لئے الگ ہونا ہی پڑے گا۔'' (صفحہ ۲۰)

نازنین بانو ڈاکٹر رحمٰن کی سادگی کا فائدہ اٹھا کر اس سے اپنی مطلقہ بہن کی شادی کرا دیتی ہے۔ نازنین کے والد نے نیفو کی شادی ڈاکٹر رحمٰن سے کرانے کا اشارہ کیا۔ ڈاکٹر رحمٰن کو قائل کرنے کے لئے نازنین جو دام تزویر بچھاتی ہے وہ بہت دلچسپ ہے۔

''ڈاکٹر رحمٰن! بہت سی باتیں لوح قلم سے ماتھے پر لکھ دی جاتی ہیں۔ اللہ کی مرضی ہوگی تبھی یہ بات میں نے سوچی۔ اب دیکھئے نا! شادی بیاہ کا معاملہ بھی تقدیر کا ہوتا ہے میری بہن نیلوفر پڑھی لکھی ہے، خوبصورت، تہذیب یافتہ سلیقے مند ہنر والی لڑکی ہے مگر مس میچ ہونے کی وجہ سے میاں بیوی میں طلاق ہوگیا۔''

''ارے!'' ڈاکٹر رحمٰن کا چہرہ سنجیدہ ہوگیا۔

''چند سال، چند مہینے، چند ہفتوں میں نہیں، چند دنوں میں ہی یہ حادثہ ہوگیا۔ دولہے صاحب تو پہلے سے ہی شادی شدہ تھے۔ یہ سب باتیں کہیں چھپتی ہیں، کھل گئیں۔ ہم لوگوں نے رائے مشورے کے بعد نیلوفر کو علاحدہ کروادیا۔''

''بالکل ٹھیک کیا! ایسے مردوں کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔''

''ڈاکٹر رحمٰن ہم لوگ صرف تین بہنیں ہی ہیں۔ نیلوفر سب سے چھوٹی ہے۔ بھائی نہیں ہے۔ ابّی ضعیف ہوگئے ہیں۔ کشو انڈیا سے باہر رہتا ہے۔ ایسے میں میں لڑکا ڈھونڈنے کہاں جاؤں اگر آپ کی نظر میں ہو تو بتائیے گا۔''

''بالکل بتاؤں گا۔ یہ تو کار خیر ہے۔۔ بڑا ثواب ہے اس کا۔''

میں جھٹ اندر گئی اور البم سے نیفو کی کئی خوبصورت تصویریں نکال کر ڈاکٹر رحمٰن کے ہاتھ پر لاکر رکھ دی۔ ''اسے آپ اپنے پاس رکھ لیجئے تاکہ کہیں بات بنے تو اسے آپ دکھا سکیں۔''

ڈاکٹر رحمٰن شرما گئے۔ ''نہیں نہیں ضرورت ہوگی تو آپ سے مانگ لوں گا۔''

میں نے وہ فوٹو زبردستی ڈاکٹر رحمٰن کی جیب میں ڈال دی۔ جانتی تھی۔ شریف مرد ہے۔ کنوارا ہے۔ ایک اچھی ساتھی کی ضرورت تو محسوس ہوتی ہو گی۔ خوبصورت لڑکی کی فوٹو جیب میں موجود ہوگی تو خود بخود ارادہ بنے گا۔

میں کشو سے اس سلسلے میں بات کرنے سے پہلے ڈاکٹر رحمٰن کی طرف سے پوری طرح مطمئن ہو جانا چاہتی تھی۔ دوسرے دن ہی نتیجہ سامنے آگیا۔ میں بھابی سے 'باجی' بن گئی۔ میرے گھر میں ان کی آمد و رفت بڑھ گئی۔

میں ان کے سامنے خود کو بیحد مصروف اور نیفو کے لئے فکر مند دکھاتی وہ بیچارہ میرے ذکر کرنے پر ہر بار سر جھکا لیتا جیسے وہ اس کے لیے خود ذمہ دار ہو۔ میں آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔'' (صفحہ ۲۵۶۔۲۵۷)

ناول میں اس طرح کے کئی اور حوالے ہیں جہاں ناول نگار نے عورتوں کی زیادتیوں کہیں اشارتاً اور کہیں وضاحتاً بیان کیا ہے۔ غرض یہ کہ ''صدائے عندلیب بر شاخ شب'' ایک جذباتی ناول ہوتے ہوئے بھی معتدل نقطۂ نظر (balance view) کا حامل ہے۔

نسیمِ سحر کا اعزاز

نظریۂ پاکستان کونسل (ٹرسٹ)، اسلام آباد موٴقر ادارے کی جانب سے ایک شایانِ شان تقریب میں سینئر شاعر، کالم نگار اور صحافی نسیمِ سحر کی چار دہائیوں سے زائد عرصے پر محیط گراں قدر علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں ۲۰۱۶ء کا علاّمہ اقبال گولڈ میڈل ایوارڈ محسنِ پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے دستِ مبارک سے پیش کیا گیا۔ اس تقریب میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے کُل سترہ پاکستانیوں کو مختلف نامور شخصیات سے منسوب گولڈ میڈل ایوارڈ پیش کئے گئے۔ جن میں ڈاکٹر انور نسیم، نوید حیدر ہاشمی، محمد بشیر ملک، ڈاکٹر سید حامد حسین (شہید)، ڈاکٹر مسعود غنی اور گلالئی اسمٰعیل جیسی معروف ہستیاں شامل تھیں۔

○

تعزیتی مکالمہ

''سورگباش جوگندر پال جی کی اہلیہ سے ٹیلی فونک تعزیتی مکالمہ''

شہناز خانم عابدی
(کینیڈا)

پنج ند میں شائع ہونے والی یہ روح فرسا خبر پڑھی تو اپنے آنسو ضبط کرنے میں ناکام ہوگئی کہ'' آج ۲۳ اپریل ساڑھے گیارہ بجے (انڈیا کے وقت کے مطابق) جوگندر پال جی، ہماری آپ کی اور اردو ادب کی دنیا سے رخصت ہو گئے۔'' کچھ عرصہ پہلے ان کے حواس میں زوال کے آثار دکھائی دینے لگے تھے ۔فون پر جب بھی بات چیت ہوتی تو ان کی بات چیت میں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہو جاتی ۔جس کو کرشنا بھابھی جوڑتی جاڑتی رہتیں ۔ کرشنا بھابھی بینائی سے محروم ہونے کے بعد پہلے سے زیادہ خوش گفتار اور ذہنی طور پر چاق و چوبند ہوگئی تھیں ۔کتابوں سے ان کے لگاؤ میں بھی کوئی کمی نہیں آئی تھی۔انہوں نے بتایا تھا کہ وہ شملے کی 'امریکن آڈیو سینٹر' کی ممبر ہیں، وہی ان کو انگلش کتابوں کی سی ڈی جو یہ چاہیں بھیجتے رہتے ہیں۔ میں یہ سوچ کر بڑی طمانیت محسوس کرتی تھی کہ جوگندر پال جی بھابھی کی زبان سے بولتے اور کرشنا بھابھی پال جی کی آنکھوں سے دیکھتی ہیں۔افسوس اس جوڑے کو وقت کی نظر لگ گئی۔ جوگندر پال جی سورگباش ہو گئے ۔ان کو وہاں نہ قلم اور قرطاس کی حاجت ہوگی اور نہ ہی کمپیوٹر یا پرنٹر کی اور نہ ہی زبان و بیان کی۔ بھابھی اکیلی رہ گئیں۔

میں نے کرشنا بھابھی سے تعزیت کرنے کے لئے فون کیا۔

''بھابھی! سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا کہوں۔۔۔'' پھر ہمت جٹا کر میں نے کہا'' بہت دکھ ہوا جوگندر پال جی کے جانے کا۔''

کہنے لگیں (ان کے لہجے اور آواز میں ضبط گریہ قیامت ڈھا رہا تھا)'' پال جی چلے گئے۔۔۔لیکن انہوں نے ایک بھرپور زندگی گزاری۔ جو چاہا وہ کیا۔ کوئی تشنگی نہیں تھی ان کو۔ میں نے بھی اپنی پوری زندگی ان کو دے دی تھی۔ میرا ہر لمحہ ان ہی سے وابستہ تھا۔ اور اب وہ مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔'' پھر ایک لمحہ توقف کے بعد بولیں'' وفات سے چند روز قبل ایک دن مجھ سے کہنے لگے''

''میرے دن پورے ہونے والے ہیں تمہیں ہمت سے کام لینا ہو گا۔''

''کیا طبیعت زیادہ خراب تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک ہفتہ پہلے سانس لینے میں زیادہ دقت محسوس ہوئی۔ ہسپتال لے کر گئے کہ شاید آکسیجن کی کمی ہے۔ بس پھر تو وہ وہیں کے ہو کر رہ گئے۔'' فون شاید بہ سبب گریہ ایک بار پھر ساکت ہوگیا۔ چند لمحوں کے بعد ان کی دوبارہ آواز آئی۔'' ایک بیٹا جو امریکا میں تھا وہ بھی آگیا تھا، بیٹی سکریتا جو اپنی بیٹی سے ملنے امریکہ گئی تھی وہ بھی آگئی تھی اور تیسرا بیٹا تو یہیں میرے پاس ہے، آرکیٹیکٹ ہے، ایک رسالہ بھی نکالتا ہے۔ ان کے آخری وقت میں تینوں بچے ان کے پاس تھے۔ پال جی نے تینوں بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور پھر تینوں کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا۔'' جوگندر پال جی ایک سچے قلم کار تھے۔ انہوں نے بھرپور کام کیا اور اپنی پسند سے کیا، کبھی شہرت کی پرواہ نہیں کی۔ آسمان ادب میں وہ ہمیشہ ایک درخشندہ ستارے کی طرح جگمگاتے رہیں گے۔ اس کے علاوہ وہ ایک بہت اچھے اور محبت کرنے والے انسان بھی تھے۔ خوشیاں بانٹتے تھے اور لوگوں کو خوشیاں دے کر خوش ہوتے تھے۔ (یہاں مجھے کرشنا بھابھی کا بتایا ہوا ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔'' ایک مرتبہ اخبار بانٹنے والے لڑکے کے ہاتھ میں انہوں نے سو(۱۰۰) کا نوٹ دیا۔ لڑکا نوٹ لے کر پوچھنے لگا

''صاب جی! کیا منگوانا ہے۔''

کہنے لگے'' جاؤ لے جاؤ۔'' لڑکا خوشی خوشی نوٹ لے کر بھاگ گیا۔ وہ اس لڑکے کے چہرے پر اس خوشی کو دیکھنا چاہتے تھے جو نوٹ ملنے کے بعد اسے حاصل ہوئی۔''

میں نے کرشنا بھابھی سے کہا'' کاش! میں ان سے مل پاتی۔ ان سے نہ ملنے کا مجھے بہت دکھ ہے۔''

کرشنا بھابھی نے مجھے یاد دلایا'' آپ کا جب بھی فون آتا تھا وہ آپ کو آنے کے لئے ضرور کہتے تھے۔ وہ ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ آپ آیئے اور میرے پاس ہی رہئے۔''

''جی ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ انہوں نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ'' آپ ویزے کی درخواست میں میرا نام بھی شامل کر لیں کہ مجھے ان سے ملنے جانا ہے۔''

بھابھی پال جی کا ذکر کرتے ہوئے بولیں اب تو وہ یہ کہنے لگے تھے کہ'' میں اب ایسی جگہ جانے والا ہوں جہاں میری سب سے ملاقات ہوگی۔''

''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ جوگندر پال جی اس دنیا سے رخصت ہونے والے ہیں تو میں جلد ویزے کی کوشش کرتی۔ مگر اب کیا ہوسکتا ہے۔ اب تو صرف دعا کر سکتے ہیں کہ ان کی روح کو سکون ملے۔ اور ہم سب کو یہ دکھ جھیلنے کی ہمت۔'' میں نے بے حد دکھ سے کہا۔

پھر میں نے کہا'' بھابھی آپ سے بہت لمبی گفتگو ہوگئی ہے آپ تھک گئی ہوں گی۔ پھر بات ہوگی۔ آپ اپنے آپ کو سنبھالئے۔''

☆

''ذاتِ مجرد''

عرفانِ خودی

عبداللہ جاوید
(کینیڈا)

مجرد 'میں' کا رشتہ اس سے ہے
جس نے کہا
تخلیق سے پہلے
''الست بربکم''

'مجرد میں' اسے ساجے ہے جو مالک ہے ہولا ہے
جو۔۔۔۔۔ ہر اک 'میں' کا خالق ہے
جلانے مارنے والا۔۔

مجرد 'میں' کا رشتہ اس سے ہے
جو 'ہے'
(وہ جس کے ماسوا، جو ہے نہیں ہے)
وہ ہے
کسی رشتے بنا، نسبت بنا، علت بنا

'نہیں' سے 'ہے' کی جانب گیان کے
رستے میں
پہلے لا ہے، لا کے بعد 'ہُو' ہے
لاموجود الا اللہ
لا الٰہ الاّ اللہ
'اللہ ہُو'

کبھی دیکھیں اتر کر 'میں' میں

اپنے 'میں' کے اندر
اور کبھی باطن کے باطن میں

کہا ہے کہنے والے نے
وہ جس نے نفس کو جانا
سو اس نے رب کو پہچانا

یہ سب آسان نہیں اتنا
یہی تو گیان کی منزل ہے
عرفانِ خودی کیا ہے۔؟
خود اپنا گیان ہے جو اس کی جانب
لے کے جاتا ہے
وہ جو ذاتِ مجرد ہے
'مجرد میں کی صورت میں

یہ سب اتنا آساں نہیں ہے
خودی کے گیان کی پہلی ہی منزل بھی نہیں آساں
کبھی 'میں' میں اتر کر دیکھئے
دیکھئے کہ آپ کے 'میں' میں
نہاں ہیں ان گنت 'تو'
ان گنت 'وہ'
ان گنت، ہم بھی۔۔!!

چوک تحریر

ڈاکٹر سید رضی محمد
(میرپورخاص)

میں چوک تحریر میں کھڑا فیصلے کے لمحات دیکھتا ہوں
یہ سرزمینِ پیغمبراں ہے جو زیرِ فرعون دبی ہوئی تھی
یہ وہ گھڑی ہے کہ جس کی روزِ اول سے سب نیک ہستیوں نے دعائیں کی تھی
اور آج جب وہ گھڑی نگاہوں کے سامنے ہے
بشر کی عظمت کے جتنے داعی رہے ہیں ان سے کی پاک روحیں یہاں جمع ہیں
کہیں پہ تائیدِ ایزدی ہے
کہیں پہ سایہ رسول کا ہے
کہیں پہ موسیٰ عصا اٹھائے کھڑے ہوئے ہیں
کہیں پہ عیسیٰ حواریوں کے حسین جھرمٹ میں جاگزیں ہیں
کہیں پہ چشمِ حسینی شفقت سے دیکھتی ہے
کہیں پہ اپنا علم اٹھائے وفائے عباس بھی کھڑی ہے

یہ ساعت فتحِ آدمی ہے
یہ لمحہ فتحِ آگہی ہے

تمام روئے زمیں پہ جتنی حکومتیں وجہِ ذلتِ آدمی رہی ہے
سمٹ رہی ہے
بشر کے تحقیر کے جو شوقین بادشاہ شیوخ تھے وہ
لرز رہے ہیں
تمام روندے ہوؤں کو فرعونِ وقت سے اپنے آنسوؤں کا حساب لینا جو آ گیا ہے
اسیرِ ظلم و ستم کو ظالم کماشتوں سے
جواب لینا جو آ گیا ہے
گلاب چہروں کو اپنے حصے کا چھینا جھپٹا
حساب لینا جو آ گیا ہے

○

اردو ہندی

ولی عالم شاہین
(کینیڈا)

موسم ہو اگر خراب ڈھال ہے یہ
چاہیں تو اتار دیں کہ شال ہے یہ
ہے رسمِ خطِ زباں کا دیگر احوال
یہ شال نہیں بدن کی کھال ہے یہ

حرفوں کی یہ قوسیں یہ صدائے مرغوب
اپنایئے جس رنگ کا چاہیں اسلوب
دائیں سے لکھی جائے کہ اوپر نیچے
ہوتی نہیں کچھ اس سے عبارت ناخوب

اک دوسرے کی کوئی بھی قاتل نہ قتیل
ہندی بھی حسیں ہے اور اردو بھی جمیل
کیوں ایک سے ہوں ساری زبانوں کے حروف
وحدت کی نہیں ہوتی رسمِ خط سے تشکیل

کچھ رشتہ کسی زباں کا مذہب سے نہیں
تائیدِ زباں صحیفۂ رب سے نہیں
لے اس کا مزہ جو بھی زباں اس کی ہے
یہ ذائقہ مخصوص کسی لب سے نہیں

تقسیم کا عنوان بنا ڈالا ہے
تفریق کی پہچان بنا ڈالا ہے
اردو کہ ہے زائیدہ و پروردۂ ہند
ہندو کو مسلمان بنا ڈالا ہے

○

سُنیئے

یوگیندر بہل تشنہ

(امریکہ)

اس سے قبل کہ تم
آگے کے سفر میں منہمک ہو جاؤ،
آپ جو کام،
آدھے، ادھورے چھوڑ گئے ہیں
وہ تو میں
جوں توں پورے کر ہی لوں گی
مگر یہ تو سوچو ذرا
یہ جو داغِ مفارقت دے گئے ہو تم
چلتے چلتے
اُس کا کیا حل کروں
تمہاری یادوں سے جو ہویدہ ہوں گے
اُن زخموں کا مداوا کیا ہوگا۔
سوچتی ہوں کہ اگر میں
اپنی زندگی
اپنی نظم ''حل'' کے سپرد کر دوں تو
زندگی
قدرے آسان ہو جائیگی
جب کبھی فرصت ملے تو
میرے خواب میں آؤ
تمہارا بھی وقت کٹے گا اور میرا بھی
جی بہلے گا
کوئی غمخوار ملا، کوئی رہبر ملا
کوئی ہمدرد ملا۔۔۔ بتانا ذرا
سُنیئے
اس سے قبل کہ تم،
آگے کے سفر میں منہمک ہو جاؤ۔۔۔!!!

○

گہری چپ کے گہرے گھاؤ

شہزاد نیرّ

(راولپنڈی)

گہری گھنی گھمبیر خموشی
گولی کی آواز کی صورت کانوں میں گھستی ہے
دل پر گہرا گھاؤ لگ جاتا ہے
مدھم لے کے گھایل انگ پہ تیز خلش کا رنگ چڑھاتی
دل کی دھڑکن
لال ملال کی گت پر گاتی
سُر کے سر پر پچھتاوے کی تال لگاتی
خاموشی کے گیت میں جلتی جاتی ہے
دور کہیں اندر کے گگن پر آگ کا گولا چلتا ہے
چپکے سے یوں خاموشی کے بین کا مرغولہ اٹھتا ہے
شرمندہ شرمندہ گال گلابی ہونے لگتے ہیں
کان ضمیر کی تیز تپش میں تپ جاتے ہیں

نگری گہری نیند میں گم ہے
کانوں کی گم صم گلیوں میں
اس کی آنکھوں کی چپ کا کہرام مچا ہے
میری بات کی تیز کٹار کا زخم اٹھا کر
چپکے سے اٹھ جانے والا
سوچوں پر ان گنت خراشیں چھوڑ گیا ہے
ضبط کے ظرف میں بھری ہوئی وہ گُپت آوازیں
بھیگی آنکھوں اور لرزتے ہونٹوں کی بےلفظ صدائیں
بھاری پتھر بن کر دل پر پڑی ہوئی ہیں

○

محبت نامہ

ڈاکٹر پنہاں

(امریکہ)

جانِ من
پرسشِ حال کاشکریہ
رسم ہے خیریت پوچھنا
اور جواباً یہ کہنا کہ سب خیر ہے
درحقیقت مگر حال کچھ اور ہے
یہ عجب دور ہے
ایسا لگتا ہے دنیا کو اب
شر سے ہے انسیت خیر سے بیر ہے
کوئی اپنا نہیں
اپنی ہستی بھی اب اجنبی غیر ہے
زندگی دشتِ ویران کی سیر ہے
ذہن سن قلب شل عقل گم
چاہے ہم ہوں کہ تم
اب تو سب کا یہی حال ہے
اپنے ہاتھوں میں اب کچھ نہیں
صرف نیزہ ہے اور ڈھال ہے
وقت کی یہ عجب چال ہے
اپنی دنیا ہوئی ایک دشتِ جنوں
قحطِ امن وسکوں
غرق اشکوں میں سب خشک وتر
آتشِ غم سے جھلسے ہوئے بحروبر

○

''راستوں کوجگمگانا ہے''

شگفتہ نازلی

(لاہور)

(آرمی پبلک سکول پشاور (اے پی ایس) کے ذہین
وفطین، ہونہار وجاں نثار طالب علموں کے لیے)

اگرچہ سال ہے گزرا مگر اب بھی یہ عالم ہے۔۔۔
کہ نہ تو سسکیاں تھمی ہیں نہ آنسو ہی رُکتے ہیں۔۔۔
بھُلائے سے نہیں بھُولیں، ہمیشہ یاد آتے ہیں۔۔۔
اور اُن معصوموں کی ہم یاد میں شمعیں جلاتے ہیں۔۔۔
مگر اِس مادرِ علمی سے یہ پیغام دینا ہے۔۔۔
بھلائی، آشتی اور اَمن کا پرچار کرنا ہے۔۔۔
جہادِ قلم سے ہم کو جہالت دُور کرنی ہے۔۔۔
دَر ودیوار کی تدریس سے تزئین کرنی ہے۔۔۔
جو فتنہ سر اُٹھائے گا، اُسے ہم نے مٹانا ہے۔۔۔
شجاعت اور ہمت سے سبق سب کو سکھانا ہے۔۔۔
تلافی سسکیوں کی اور مداوا سارے زخموں کا۔۔۔
ہمیں جہدِ مسلسل سے ہمیشہ کرتے رہنا ہے۔۔۔
ہر اِک بڑھتے قدم کے ساتھ، مثبت سوچ لے کے۔۔۔
اُداسی کی شمعوں کو، عزمِ روشن سے بدلنا ہے۔۔۔
ہمیں اِس درس گاہ کو سب سے آگے لے کے جانا ہے۔۔۔
ہمیں اس درس گاہ کے راستوں کو جگمگانا ہے۔۔۔!

○

حسرتِ دل

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

سلسلے توڑ گئے پیار کے ،جاتے جاتے
کیا بگڑتا جو وہ دو بول سناتے جاتے
ہم تو پہنچے تھے وہاں حسرتِ دل ساتھ لئے
اُس نے مُڑ کر بھی نہ دیکھا ہمیں، جاتے جاتے

رسمِ دنیا ہی اگر اُن کو نبھانی آتی
مُسکرا دیتے ہمیں دیکھ کے، جاتے جاتے
جن کے آ جانے سے ہم شاد ہوا کرتے تھے
وہ ہمیں چھوڑ گئے راہ میں ، جاتے جاتے

ہم نے سوچا تھا کہ وہ آن ملیں گے ہم سے
ہم رہے آس میں وہ چپ رہے، جاتے جاتے
دل نے چاہا تھا کہ رِم جھم میں ملیں گے اُن سے
آئی برسات تو وہ چھپ گئے، جاتے جاتے

لاتعلق رہے وہ ہم سے کئی برسوں تک
کیوں نہ اک بار چلے آئے وہ، جاتے جاتے
کیا زمانے سے ملا ترکِ تعلق کے سبب
چین اپنا بھی گنوا بیٹھے وہ، جاتے جاتے

ہم تو تھے مان گئے ساری خطائیں اپنی
درگذر کر ہی دیا کرتے ہیں، جاتے جاتے
کاش احساس مروّت میں ہماری خاطر
دو قدم چل کے پلٹ آتے وہ ، جاتے جاتے

جذبہ ایثار و محبت سے سکوں کا زم زم
ہائے اس راز کو پالیتے وہ ، جاتے جاتے
بے وفا چھوڑ گئے یادیں حسیں لمحوں کی
عُمر اِک چاہیے ان یادوں کو ، جاتے جاتے

ان کے جانے سے جو دِل ٹوٹ گیا ہے اپنا
کاش یہ بات سمجھ پاتے وہ ،جاتے جاتے
دل شکستہ پہ لئے ساری امنگوں کا ہجوم
ہم تو مر جائیں گے اس راہ میں ، جاتے جاتے

اب نہ وہ میں ہوں، نہ وہ دل نہ تمنا ہے ریاضؔ
ان نگاہوں سے نہ دیکھو مجھے ، جاتے جاتے

میری ماں۔۔۔فرخندہ شمیم

جب میں بالکل چھوٹی سی تھی
سبز فراک پہنتی تھی مَیں
ماں کہتی تھی
بیٹی! تیری ساری زیست ہری ہی گذرے
بھرا بھرا سا ہیروں والا
ایسا جیون۔۔۔جس پر کالی رات نہ اُترے
ماں کو سبزے سے اُلفت تھی
سبز رِبن سے میری چٹیا گُوندھا کرتی
میری آنکھیں دیکھا کرتی، کہتی رہتی
اِن آنکھوں کو چیل نہ کوئی دیکھنے پائے
کوئی وحشت بھی کھوج نہ پائے
میرا پیکر!
ماں کو بھی اچھا لگتا تھا
مجھے سجایا کرتی تھی وہ!!
مٹھی مٹھی اپنے ہاتھوں
مجھے نُمایاں کرتی تھی وہ
ماں کی چاہت ٹھنڈی ٹھنڈی مٹّی جیسی
اس میں اچھّی باتیں کرتا
نہ کوئی شعلہ۔۔۔نہ کوئی اگنی
بے حد کم گو ماں تھی میری
لیکن اُس کا آنکھ اشارہ، پلک سِتارہ
رب کا سایہ تھا کہ ماں تھی
نہیں پتا تھا!!

سردرُتوں میں، ماں نے جتنی نرم دُعائیں
میرے ماتھے
کو بخشی تھیں
اُن کا سورج جاگ اُٹھا تھا
مجھ میں پتّے پھُوٹ پڑے تھے
شبنم اِن پر رقص کناں تھی
اور شعور ذہانت بن کر
حرف حرف میں آ سمٹا تھا
ماں کی خواہش، میری بیٹی
وحشی راتوں میں نہ تڑپے
سُرخ چنار سی کِھلتی جائے

ایک صدی کا قصہ

مینا کماری

دیپک کنول (ممبئی، بھارت)

ہندی فلم انڈسٹری میں صرف دو ایسے اداکار گزرے ہیں جنہیں المیہ اداکار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ایک دلیپ کمار جنہیں Tragedy King یعنی شہنشاہ الم کے نام سے جانا جاتا ہے اور دوسری مینا کماری ہے جس نے Tragedy Queen یعنی ملکہ الم کے طور پر اپنی پہچان بنالی۔ اسکرین کے ان دو اداکاروں نے فلم بینوں کو جتنا رلایا ہے، شاید ہی کسی اور نے اُنہیں اتنا رلایا ہو۔ مینا کماری جسکا اصلی نام ماہ جبین بانو تھا یکم اگست 1932 کو علی بخش اور اقبال بیگم کے گھر میں پیدا ہوئی۔ یہ اُنکی تیسری اولاد تھی۔ اس سے پہلے اُنہوں نے دو بیٹیوں کو جنم دیا تھا۔ ایک کا نام خورشید اور دوسری کا نام مدھو تھا۔ وہ جب اس دنیا میں آئی تو اپنے ساتھ بدنصیبی لے کر آئی۔ اُسکی پیدائش کے وقت علی بخش کے مالی حالات اس قدر خستہ تھے کہ وہ ڈاکٹر کی فیس ادا نہ کرسکا۔ وہ ننھی ماہ جبین کو ایک مسلم یتیم خانے میں جاکر چھوڑ آیا۔ دو گھنٹے کے بعد اُسکے دل میں پدرانہ شفقت اور محبت جاگی۔ وہ یتیم خانے کی طرف بھاگا اور اپنی پھول جیسی بچی کو وہاں سے اُٹھا کر واپس گھر لے آیا۔

علی بخش جو کہ شیعہ مسلک سے تعلق رکھتا تھا، پارسی تھیٹر کا ایک اہم رکن تھا۔ وہ ہارمونیم بجایا کرتا تھا۔ بچوں کو موسیقی سکھاتا تھا اور کبھی کبھار شعر و شاعری بھی کیا کرتا تھا۔ اُسنے ''عید کا چاند'' فلم میں ایک چھوٹا سا رول بھی ادا کیا تھا۔ اُسنے کئی فلموں کا سنگیت بھی دیا جن میں ''شاہی لٹیرا'' قابل ذکر ہے۔ ماہ جبین کی ماں اقبال بیگم علی بخش کی دوسری بیوی تھی۔ وہ ایک اسٹیج ایکٹرس اور ڈانسر تھی۔ وہ کامنی نام سے اسٹیج پر کام کیا کرتی تھی۔ علی بخش سے اُسکی ملاقات پارسی تھیٹر میں ہی ہوئی۔ دونوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا اور اسطرح اقبال بیگم علی بخش کی زوجہ بن گئی۔

علی بخش خود ایک اداکار بننا چاہتا تھا۔ کافی جدوجہد کے باوجود اُسکی یہ حسرت پوری نہ ہوئی۔ اقبال بیگم ماہ جبین کو فلموں میں کام کرانے کی متمنی تھی۔ وہ اپنے شوہر سے کہتی تھی کہ وہ ماہ جبین کو اپنے ساتھ اسٹوڈیو لے جایا کرے۔ ننھی ماہ جبین کو فلموں میں کام کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ دوسرے بچوں کی طرح پڑھنا لکھنا چاہتی تھی مگر اُسکی ماں کی یہ ضد تھی کہ وہ فلموں میں کام کرے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب وہ محض سات سال کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ''جیلر'' کی فلم بندی کے دوران فلم یونٹ کو ایک سات سالہ بچی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اُنہوں نے اپنے رائٹر کمال امروہی سے کہا کہ وہ دادر جاکر ماسٹر علی بخش نام کے ایک آدمی سے ملے جسکی ایک بیٹی ہے جس کا نام ماہ جبین ہے اور یہ طے کرلے کہ کیا وہ لڑکی اس رول کے لئے موزوں ہے۔ کمال اپنے ڈائرکٹر کے حکم پر دادر چلا گیا اور علی بخش سے جاکر ملا۔ علی بخش اُن دنوں دادر کے علاقے کی ایک کھولی میں رہتا تھا۔ کمال صاحب نے جب علی بخش کو اپنے آنے کا مدعا بیان کیا تو وہ بیحد خوش ہوا اور اُسنے باہر جاکر اپنی بیٹی ماہ جبین کو آواز دی۔ وہ آواز سنتے ہی فوراً دوڑتی ہوئی کمرے میں آگئی۔ اُسے منہ دھونے کا بھی موقع نہ ملا جو کیلا کھانے سے گندا ہو چکا تھا۔ باپ نے بیٹی کو اس حلیے میں دیکھا تو اُسے ڈانٹ کر باہر بھگا دیا کہ وہ پہلے جاکر اپنا منہ دھوکر آجائے۔ کمال کو یہ چلبلی لڑکی پسند آگئی اور اُسنے ڈائرکٹر سے اس لڑکی کو اُس رول میں لینے کی سفارش کردی مگر اُسکی سفارش کے باوجود وہ رول کسی اور بچی کے حق میں چلا گیا۔ اُسکے بعد جب بھی کمال امروہی اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں سے گزرتے تھے تو علی بخش کی کھولی کی طرف اشارہ کرکے کہتے۔ اُس کھولی میں کل کی ایک کامیاب ہیروئن پروان چڑھ رہی ہے۔

علی بخش اور اقبال بیگم کی محنت رنگ لائی۔ اُسے سات سال کی عمر میں ایک فلم میں کام کرنے کا موقع ملا۔ اس فلم کا نام ''فرزند وطن'' تھا۔ یہ فلم 1939 میں ریلیز ہوئی۔ اس فلم کو وجے بٹ نے ڈائرکٹ کیا تھا۔ وجے بٹ نے ہی اُسکا نام بدل دیا اور اس فلم میں اُسے بے بی مینا کے نام سے پیش کیا گیا۔ اس فلم میں کام کرنے کے عوض اُسے پچیس روپے ملے جو علی بخش کے لئے کسی خزانے سے کم نہ تھے۔ اُن دنوں وہ کافی تنگی دستی کے دور سے گزر رہے تھے۔ اسی سال بے بی مینا کی ایک اور فلم ریلیز ہوئی جس کا نام ''لیدر فیس'' تھا۔ اس فلم کے فلمساز اور ہدایتکار بھی وجے بٹ ہی تھے۔ اس فلم کے مرکزی اداکار جے راج اور مہتاب تھے۔ یہ وہی مہتاب ہے جو بعد میں بیگم سہراب مودی بنی۔ اس فلم میں مینا نے جے راج کی بیٹی کا کردار ادا کیا تھا۔

1940 میں بے بی مینا کی دو فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ''پوجا'' اور ''ایک ہی بھول''۔ ''پوجا'' میں اُسکے ساتھی کلاکاروں میں سردار اختر اور ستارا دیوی تھی جب کہ ''ایک ہی بھول'' میں پنڈت جے راج اور مہتاب مرکزی کردار میں تھے۔ 1941 میں اُسکی تین فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ''نئی روشنی''، ''کسوٹی'' اور ''بانہیں''۔ 1942 میں ''غریب''، 1943 میں ''پرتگیا'' 1944 میں ''لال حویلی'' 1946 میں ''دنیا ایک سرائے'' اور ''بچوں کا کھیل'' 1947 میں ''پیا گھر آجا'' اور 1948 میں ''بچھڑے بالم'' بطور بال کلاکار اُسکی آخری فلم تھی۔ بے بی مینا نے عنفوان شباب میں قدم رکھا تھا۔ اب وہ بے بی مینا نہیں تھی بلکہ اُسکا نام مینا کماری تھا۔ جب کمال امروہی کو ''محل'' ڈائرکٹ کرنے کا موقع ملا تو ہیروئن کے رول کے لئے کسی نے مینا کماری کے نام کی سفارش کی۔ ماہ جبین اب مینا کماری بن چکی تھی۔ کمال امروہی نے مینا کماری کو لینے سے انکار کردیا جب کہ اُسنے ایک اور نوخیز لڑکی مدھوبالا کو اس رول کے لئے منتخب کرلیا۔ کمال امروہی کو یہ معلوم نہ تھا کہ جس لڑکی کو اُس نے رد کردیا ہے وہ کوئی اور نہیں بلکہ وہی ماہ جبین ہے جس کے بارے میں وہ پیش گوئی کرچکے تھے کہ وہ ایک دن بہت بڑی ہیروئن بن جائے گی۔ اس کے بعد

ایک دن وہ اشوک کمار سے ملنے فلمستان اسٹوڈیو چلا گیا جہاں اشوک کمار فلم ''تماشہ'' کی شوٹنگ کر رہا تھا۔اشوک کمار نے کمال امروہی کو ایک گول مٹول لڑکی سے ملایا۔یہ مینا کماری تھی۔کمال امروہی اُس دن بھی اُسے پہچان نہ پایا کہ یہ وہی ماہ جبین ہے جسے وہ دادر کی کھولی میں مل چکا تھا۔''محل''1949 میں ریلیز ہوئی۔اسکے ٹھیک ایک سال بعد یعنی 1950 میں ریلیز ہوئی دھارمک فلم ''شری گنیش مہما'' مینا کماری کی پہلی فلم تھی جسمیں اُسنے ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا۔اُسکے بعد تو فلموں کی جھڑی لگ گئی۔اسی سال مینا کماری کی تین اور فلمیں ریلیز ہوئیں جن کا نام ''مغرور''،''ہمارا گھر'' اور ''انمول رتن'' تھا۔1951 میں مینا کماری کی چار فلمیں ریلیز ہوئیں ''صنم''،''مدہوش''،''لکشمی نارائن'' اور ''ہنومان پاتل وجے''۔مینا کماری کی فلمیں تو اتر سے ریلیز ہو رہی تھیں مگر جس طرح کی کامیابی کی وہ متمنی تھی وہ اب تک اُسے مل نہیں پائی تھی۔جس طرح ''مدھوبالا'' کو ''محل'' سے کامیابی ملی تھی، مینا کماری اتنی ساری فلمیں کرنے کے باوجود ابھی تک اُس طرح کی کامیابی اور کامرانی سے ہمکنار نہیں ہو پائی تھی۔وجے بھٹ ''بیجو باورا'' بنانا چاہتے تھے۔ہیروئن کے رول کے لئے نمی سے رابطہ کیا گیا مگر نمی نے کام کرنے سے معذوری ظاہر کی۔مینا کماری وجے بھٹ کی ہی دریافت تھی۔قرعہ فال اُسکے حق میں گرا۔یہاں سے مینا کماری کی تقدیر نے ایسی کروٹ بدلی کہ جو درجنوں فلمیں نہیں کر سکیں وہ ایک فلم کر گئی۔''بیجو باورا'' نے کامیابی کی معراج کو چھو لیا۔مینا کماری کے نام کا ڈنکا چہار دام بجنے لگا۔اسی سال اُسکی دو اور فلمیں ریلیز ہوئیں۔''تماشہ'' اور ''الہ دین اور جادوئی چراغ''۔

اب بڑے بڑے ہدایت کاروں کی نظروں میں مینا کماری آ چکی تھی۔اشوک کمار جو کہ مینا کماری کی صلاحیتوں کا فلم ''تماشہ'' کے دوران ہی قائل ہو چکا تھا، جب اُسنے ''پرنیتا'' بنانے کا فیصلہ کیا تو اُنہوں نے اپنے ہدایت کار بمل رائے کو ہیروئن کے رول کے لئے مینا کماری کا نام تجویز کیا۔بمل رائے بھی مینا کماری کی اداکاری سے متاثر ہوا تھا اسلئے فلم ''پرنیتا'' میں اشوک کمار کے مدمقابل مینا کماری کو سائن کیا گیا۔''پرنیتا'' مینا کماری کی فلمی کیریر میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے اسی سال اُسکی پانچ اور فلمیں ریلیز ہوئیں۔''نولکھا ہار''،''فٹ پاتھ''،''دو بیگھا زمین''،''دانہ پانی'' اور ''دائرہ''۔فلم ''فٹ پاتھ'' میں وہ دلیپ کمار کے مدمقابل کام کر رہی تھی۔یہ وہ دور تھا جب دلیپ کمار کی توتی بولتی تھی۔''دو بیگھا زمین''، بمل رائے کی شہکار فلم تھی جسمیں مینا کماری نے ایک ٹھکرائن کا رول ادا کیا تھا۔''دائرہ'' کمال امروہی کی فلم تھی جسمیں مینا کماری نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔کمال امروہی اور مینا کماری 1950 میں ایک دوسرے کے قریب آ چکے تھے۔ہوا یوں کہ ''فلم کار پروڈکشن کمپنی'' نے فلم ''انارکلی'' کے لئے کمال امروہی کو سائن کیا۔اس فلم میں انارکلی کے رول کے لئے مدھوبالا کو منتخب کیا گیا۔اس سے پہلے کہ فلم سیٹ پر چلی جائے پرڈیوسر کا مدھوبالا کے باپ عطا اللہ خان سے کسی بات پر اختلاف پیدا ہوا۔بات اتنی بڑھ گئی کہ مدھوبالا نے یہ فلم چھوڑ دی۔کمال امروہی نے پرڈیوسر سے مینا کماری کا نام تجویز کیا۔فلمساز نے مینا کماری کو اس رول کے لئے سائن کیا۔قبل اسکے کہ شوٹنگ شروع ہو جائے مینا کماری پونا جاتے ہوئے ایک کار حادثے کا شکار ہو گئی۔وہ بری طرح سے گھائل ہو چکی تھی۔اُسے پونا کے ایک اسپتال میں بھرتی کیا گیا۔وہ پانچ مہینے تک اس اسپتال میں زیر علاج رہی۔کمال امروہی اُسے دیکھنے بمبئی سے پونا جاتا تھا۔مینا کماری کو لگ رہا تھا کہ کمال امروہی اب اُسے اپنی فلم میں نہیں لیں گے۔اُسکا یہ شک دور کرنے کے لئے ایک بار کمال امروہی نے اُسکی کلائی پر۔''میری انارکلی'' اور نیچے مینا کماری لکھ دیا۔یہیں سے دونوں پیار کے بندھن میں بندھ گئے۔مینا کماری رات دن کمال امروہی کے سپنے دیکھا کرتی تھی۔فروری 15 سن 1952 میں یہ دونوں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔اُس وقت مینا کماری کی عمر اُنیس سال اور کمال امروہی کی عمر چونتیس سال تھی۔مینا کماری کمال امروہی کے پیار میں اس حد تک اندھی ہو چکی تھی کہ نہ اُسے اپنے اور کمال امروہی کے بیچ عمر کا فرق نظر آیا اور نہ ہی اُسنے کمال امروہی کے ماضی میں جھانکنے کی کوشش کی۔کمال امروہی اس سے پہلے دو شادیاں کر چکے تھے۔یہ اُنکی تیسری شادی تھی۔

شادی کے بعد کمال امروہی نے مینا کماری کو لے کر ایک فلم ''دائرہ'' شروع کی۔اس فلم میں مینا کماری ایک ایسی لڑکی کا رول نبھا رہی تھی جسکی کم عمری میں ایک ادھیڑ عمر کے آدمی سے شادی ہو جاتی ہے جو تپ دق کا مریض ہے اور جو جسمانی طور پر نوجوان مینا کماری کو مطمئن نہیں کر پاتا ہے۔مینا کماری اپنے کردار میں اس حد تک ڈوب گئی کہ ایک دن اُسکی طبعیت اچانک خراب ہو گئی۔پتا چلا اُسے سچ مچ تپ دق ہو گئی ہے۔کافی دنوں تک علاج کرنے کے بعد وہ اس موذی مرض کے شکنجے سے باہر نکل آئی۔اس فلم کے ساتھ ہی کمال امروہی کے ذاتی بینر ''محل فلمز'' کی بنیاد پڑ گئی۔یہ فلم چل نہیں پائی۔کہا جاتا ہے کہ یہ فلم وقت سے پہلے بنائی گئی تھی اسلئے یہ چل نہیں پائی۔اُس زمانے میں ہر فلمی شائق اپنی ہیروئن کو ایک نوجوان ہیرو کی بانہوں میں ہی دیکھنا پسند کرتا تھا۔

مینا کماری اپنے عروج تک پہونچ چکی تھی۔بڑے بڑے بینر اُسے سائن کرنے کے لئے بے تاب رہتے تھے۔یہ وہ دور تھا جب سبھی ٹاپ کے ہیرو مینا کماری کے ساتھ کام کرنے کے خواہش مند تھے۔1954 میں اُسکی تین فلمیں ریلیز ہوئیں۔''الزام''،''چاندنی چوک'' اور ''بادبان''۔''چاندنی چوک'' بی آر چوپڑہ کے بینر تلے بننے والی فلم تھی جسمیں اُسکا ہیرو شیکھر تھا جب کہ فلم ''بادبان'' میں اُسنے ہندی فلموں کے خوبصورت ہیرو دیو آنند کے ساتھ کام کیا تھا۔1955 میں اُسکی چار فلمیں ریلیز ہوئیں۔''رخسانہ''،''بندش''،''آزاد'' اور ''عدل جہانگیر''۔''آزاد'' ایک ہلکی پھلکی کامیڈی تھی جو دلیپ کمار نے اپنے ڈاکٹر کے کہنے پر کی تھی کیونکہ وہ تناؤ کا شکار تھے اور اُنہیں لگ رہا تھا کہ المیہ رول کرتے کرتے کہیں انکا انجام بھی ایسا ہی دردناک نہ ہو۔دونوں المیہ رول کرنے میں ماہر تھے۔اب یہ دونوں ایک ہلکی پھلکی کامیڈی میں یکجا ہوئے تھے مگر ان دونوں نے اپنے اپنے رول اس خوبی اور نفاست کے ساتھ ادا کئے کہ فلم بین دانتوں تلے اُنگلی دبا کر رہ گئے فلم

بیحد کامیاب رہی''عدل جہانگیر''میں اُسنے سہراب مودی اور راجکمار کے ساتھ پہلی بار کام کیا۔1956 میں اُسکی ایک نہیں بلکہ چھ فلمیں ریلیز ہوئیں۔ان فلموں کے نام ہیں''شطرنج''''نیا انداز''''میم صاحب''''ہلاکو''''بندھن''اور''ایک ہی راستہ''۔ 1957 میں دو فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ''شاردا'' اور ''مس میری''۔1958 میں چار فلمیں''یہودی''''سویرا''''فرشتے''اور''سہارا''ریلیز ہوئیں۔1959 مینا کماری کا مصروف ترین سال رہا۔اس سال اُسکی ایک نہیں بلکہ آٹھ فلمیں ریلیز ہوئیں۔''شرارت''''سٹہ بازار''''مدھو''''جاگیر''''چراغ کہاں روشنی کہاں''''چار دل چار راہیں''''چاند''اور''آردانگنی''۔1960 میں''دل اپنا پریت پرائی''''کوہ نور''اور''بہانہ''۔ 1961 میں''زندگی اور خواب''''پیار کا ساگر''اور''بھابی کی چوڑیاں''۔1962 میں''صاحب بی بی اور غلام''''میں چپ رہوں گی''اور''آرتی''۔ 1963 میں''کنارے کنارے''''دل ایک مندر''اور ''اکیلے مت جائیو''۔1964 میں''سانجھ اور سویرا''''غزل''''چتر لیکھا''''بے نظیر''''اور''میں بھی لڑکی ہوں'' 1965 میں''پورنیا''''کاجل''''جادوئی انگوٹھی''اور''بھیگی رات''- 1966 میں''پنجرے کے پنچھی''اور''پھول اور پتھر''۔ 1967 میں''منجھلی دیدی''''نور جہاں'' ''چندن کا پلنا''اور''بہو بیگم''۔1968 میں''بہاروں کی منزل''اور''ابھیلاشا''- 1970 میں''سات پھیرے''اور''جواب''۔1971 میں''میرے اپنے''اور''دشمن''۔1972 میں ''پاکیزہ''اور''گومتی کے کنارے''۔

مینا کماری کو ازدواجی سکھ بہت کم ملا۔اُسنے کمال امروہی کو ٹوٹ کر چاہا۔بدلے میں اُسے زلت کے سوا کچھ نہ ملا۔کمال امروہی اُسکے کام میں بہت زیادہ دخل دینے لگے تھے جس کی وجہ سے مینا کماری کو کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔وہ اُسکی ایک ایک حرکت پر نظر رکھتے تھے۔اُنہوں نے اپنے سیکرٹری کو مینا کماری کے پیچھے جاسوس کی طرح لگا دیا تھا۔وہ کس سے ملتی ہے،کیا بات کرتی ہے وہ کمال امروہی کو پل پل کی خبر دیا کرتا تھا۔کمال امروہی کو مینا کماری پر اعتماد تھا ہی نہیں۔اُسنے اولاد کی خوشی سے اسلیئے بھی محروم رکھا کہ وہ سید نہیں تھی۔اپنی ممتا کی بھوک مٹانے کے لئے اُسنے کمال امروہی کے بیٹے تاجدار کو گود لیا اور اُسی کو سینے سے لگا کر اپنی پیاس مٹایا کرتی تھی۔ایک دن کیا ہوا کہ بمبئی کی ایک تقریب میں منتظم نے مینا کماری اور کمال امروہی کو مدعو کیا۔جب اُسنے کمال امروہی کو متعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ مینا کماری کے شوہر ہیں تو کمال امروہی کی انا کو ٹھیس پہونچی۔اُسنے اسے اپنی توہین سمجھا اور اُس تقریب سے اُٹھ کر چلے گئے۔اُس واقعے کے بعد دوبارہ اُس نے کسی بھی تقریب میں مینا کماری کے ساتھ شرکت نہ کی۔اس قدر انا پرست تھے کمال صاحب۔

مینا کماری اور کمال امروہی کے مابین کسی نہ کسی بات کو لے کے روز بحث و تکرار ہوتی تھی۔مینا کماری کے لئے سکون عنقا ہو چکا تھا۔خوشی جیسے اُسکی زندگی سے روٹھ کر چلی گئی تھی۔ان گھریلو جھگڑوں سے وہ ہر دم تناؤ میں رہتی تھی۔اُسکی صحت بگڑنے لگی۔وہ بے خوابی کا شکار ہونے لگی۔وہ رات بھر انگاروں پر لوٹتی رہتی تھی۔ایک پل کے لئے بھی اُسکی آنکھیں بند نہیں ہوتی تھیں۔دن میں بھی وہ کام کے ساتھ مصروف رہنے کے باعث آرام کے لئے وقت نکال نہیں پاتی تھی۔نتیجہ یہ نکلا کہ مسلسل بے خوابی اُسکی صحت پر منفی اثر ڈالنے لگی۔اُسنے اپنے معالج سے رجوع کیا۔اُسنے اُسے نیند کی گولیاں دینے کی بجائے رات کو ایک پیگ برانڈی لینے کا مشورہ دیا۔وہ کمال امروہی سے چھپا کر سونے سے پہلے برانڈی کا ایک پیگ لیا کرتی تھی۔اپنی برانڈی وہ غسل خانے میں ڈیٹول کی بوتل میں ڈال کر پی جاتی تھی۔ایک دن کمال امروہی کو شک ہو گیا۔اُسنے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔اسکے بعد اُسنے غسل خانے میں کسی قسم کی بوتل رکھنے سے منع کر دیا۔

مینا کماری قفس میں قید ایک مینا کی طرح تھی جسکے پر کاٹے گئے تھے۔وہ عزت اور آزادی سے جینا چاہتی تھی مگر اُسکی آزادی سلب کی گئی تھی۔وہ حکم کی غلام بن کر رہ گئی تھی۔کمال امروہی نے اُسکی زندگی اجیرن کر کے رکھ دی تھی۔ایک شام دونوں میں کسی بات کو لے کر جھگڑا ہوا۔بات اتنی بڑھی کہ کمال امروہی نے طیش میں آ کر مینا کماری کو ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کیا اور اُسکے بعد تین بار طلاق کہہ کر اُسے اپنی زندگی سے الگ کر دیا۔مینا کماری کے سر پر گویا آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔وہ کمال امروہی کی زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکل گئی۔

1960 میں ان دونوں کے بیچ طلاق ہو گئی۔اس صدمے کے بعد مینا کماری اندر سے ٹوٹ کر رہ گئی۔اُسنے شراب کا سہارا لیا۔وہ اپنے غم مٹانے کے لئے پہلے ایک دو پیگ پی لیا کرتی تھی بڑھتے بڑھتے وہ ایک بوتل تک پہونچ گئی۔اسی بیچ فلم''چندن کا پالنا''میں اُسکی ملاقات ایک نو وارد ایکٹر سے ہوئی جس کا نام دھرمیندر تھا۔وہ اس فلم کا ہیرو تھا۔دھرمیندر نے فلم نگری میں ابھی تک کوئی خاص مقام نہیں بنایا تھا۔وہ کامیابی پانے کے لئے ہاتھ پاوں مار رہا تھا۔جیسا کہ فلم انڈسٹری کا چلن ہے کہ جب تک ایک اداکار کا نام نہ ہو جائے سبھی اُسے پاپوش پر مارتے ہیں۔فلم''چندن کا پالنا''کی شوٹنگ کے دوران مینا کماری نے محسوس کیا کہ دھرمیندر کے تئیں یونٹ کا برتاؤ ٹھیک نہیں ہے تو ایک دن اُسنے سب کو ڈانٹا اور اُنہیں تنبیہ کی کہ وہ دھرمیندر کے ساتھ ڈھنگ سے پیش آئیں۔بس پھر کیا تھا،دھرمیندر مینا کماری کی خوشنودی حاصل کرنے میں جٹ گیا۔مینا کماری کو یہ معصوم اور بھولی بالی صورت والا نوجوان اتنا بھا گیا کہ وہ نہ صرف اُسکا حوصلہ بڑھاتی رہی بلکہ کئی فلمسازوں سے بھی اُسکی سفارش کرنے لگی۔جب او پی رلہن فلم''پھول اور پتھر''بنانے کا پلان بنا رہا تھا تو اُسنے مرکزی کردار کے لئے مینا کماری سے رجوع کیا۔

مینا کماری نے ایک بیوہ کا رول کرنے سے منع کر دیا۔بعد میں جب اُسے پتا چلا کہ دھرمیندر اس فلم میں کام کرنے والا ہے تو اُسنے دھرمیندر کی خاطر اس فلم میں کام کرنے کیلئے رضامندی ظاہر کی۔اس فلم میں اُسنے ایک بیوہ کا رول اتنی خوبی سے ادا کیا تھا کہ 1967 میں اُسے اس فلم کے لئے فلم فیئر ایوارڈ سے نواز اگیا۔یہ فلم اُس دور کی سب سے بڑی ہٹ تھی جس نے دھرمیندر کو اسٹار بنا دیا۔

جب گورودت نے فلم ''صاحب بی بی اور غلام'' بنانے کا فیصلہ کیا تو چھوٹی بہو کے رول کے لئے اُنکی پہلی پسند مینا کماری تھی۔ وحیدہ رحمان جو گورو دت کی جان من تھی، وہ یہ رول کرنے کے لئے ضد کرنے لگی مگر گورودت اپنے فیصلے پر اڑے رہے۔ یہ کردار جیسے مینا کماری کی اپنی زندگی کا عکاس تھا۔ اس کردار میں چھوٹی بہو اپنے شوہر کی بے رخی اور بے توجہی کا شکار ہے۔ وہ اپنے غم غلط کرنے کے لئے شراب کا سہارا لیتی ہے۔ مینا کماری نے اس رول میں ایسی جان ڈال دی تھی کہ ایک فرضی کردار حقیقی بن گیا تھا۔ مینا کماری کی فطری اداکاری نے اس کردار کو جاوداں کر دیا تھا۔ ہر فریم میں مینا کماری کی محرومیوں اور ناکامیوں کا عکس نظر آتا تھا۔ وہ چھوٹی بہو نہیں بلکہ مینا کماری تھی اور ٹھاکر رحمان نہیں بلکہ کمال امروہی تھا۔ اس فلم کے لئے مینا کماری کو 1963 میں فلم فیئر ایوارڈ ملا تھا۔

مینا کماری کی زندگی درد و الم کا ایک نہ ختم ہونے والا افسانہ ہے۔ اُسے خوب شہرت ملی، دولت ملی، عزت ملی مگر من کا سکون اور دل کی خوشی نہ ملی۔ وہ ایک بنجر زمین کی طرح مسرت اور شادمانی کی ایک ایک بوند کے لئے ترستی رہی۔ لوگوں نے اُسے خوشی نہیں دی بلکہ اُسے آنسو دیئے۔ فلم ''پاکیزہ'' کا یہ گانا ''انہی لوگوں نے چھینا ہے ڈوپٹہ میرا'' اُسکی زندگی پر صادق آتا ہے کہ کس طرح لوگوں نے اپنے مفاد کے لئے اُسے استعمال کیا۔ وہ چاہے کمال امروہی ہو، دھرمیندر رہو یا گلزار۔ سبھی اُس سے کسی نہ کسی طرح فیض یاب ہوتے رہے۔

کمال امروہی نے فلم ''دائرہ'' کے بعد ''پاکیزہ'' بنانے کا اعلان کیا تھا۔ 1960 میں شروع ہوئی یہ فلم چند ریلیں بننے کے بعد ڈبے میں بند ہوگئی۔ مینا کماری اور کمال امروہی ایک دوسرے سے الگ ہو چکے تھے اور انکے رشتوں میں اتنی کڑوہٹ در آئی تھی کہ دونوں ایک دوسرے کا نام لینے کے بھی روادار نہ تھے۔ اُنکی اس تلخی کی ذد میں ''پاکیزہ'' آ گئی تھی جس کے اب مکمل ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ نرگس اور مینا کماری کے رشتے بڑے ہی دوستانہ تھے۔ ایک دن اُنہوں نے ''پاکیزہ'' کے رشز دیکھے۔ اُنہوں نے مینا کماری کو اس بات کے لئے منا لیا کہ وہ اس فلم کو مکمل کرنے میں تعاون دے۔ مینا کماری نے سنیل دت اور نرگس کی بات مان لی اور ''پاکیزہ'' کی شوٹنگ کرنے پر رضامند ہوگئی۔ حالانکہ وہ اُن دنوں کافی بیمار رہتی تھی پھر بھی اُسنے شوٹنگ میں حصہ لیا۔ اسکی بیشتر شوٹنگ ''کمالستان اسٹوڈیو میں ہوئی۔ بجز اپنی علالت کے اُسنے سبھی کتھک ناچ خود ادا کئے سوائے آخری ڈانس کے جس میں مشہور ڈانسر پدما کھنہ کو اُسکا باڈی ڈبل بنا کے وہ گانا مکمل کیا گیا۔ اس فلم کو مکمل ہونے میں سولہ سال لگ گئے۔ یہ فلم جب 1972 میں ریلیز ہوئی تو پہلے ہفتے میں یہ بھیڑ جٹانے میں ناکام رہی۔ فلمی نقادوں نے اسے فلاپ قرار دیا۔ دو ہفتے بعد یعنی 31 مارچ 1972 کو جب مینا کماری کا cirrhosis liver کی وجہ سے انتقال ہوا تو اُسکی موت فلم کے لئے وردان ثابت ہوئی۔ یہ فلم ایسی چل پڑی کہ فلمی نقاد انگشت بدنداں ہو کر رہ گئے۔ ''پاکیزہ'' ایسی چلی کہ اسنے بزنس کے سارے اگلے پچھلے ریکارڈ توڑ ڈالے۔

مینا کماری کو مرتے دم تک اس بات کا ملال رہا کہ کمال امروہی نے اُسکے ساتھ وفا نہ کی۔ وہ اُن لوگوں کو بھی کوستی رہی جنھوں نے اُسکا گھر توڑا۔ وہ بار بار کہتی تھی کہ اللہ اُن سب لوگوں کو دیکھ لے گا جنھوں نے اُسکا گھر توڑا۔ اُسنے اپنے درد کے فسانے اشعار میں ڈھال کر دنیا کے سامنے پیش کئے۔

تم کیا کرو گے سن کے میری کہانی
بے لطف زندگی کے قصے ہیں پھیکے پھیکے

یا

طلاق تو دے رہے ہو نظر قہر کے ساتھ
جوانی بھی میری لوٹا دو مہر کے ساتھ

Being myself

People around the world asked me to change,
Why? I know I'm different and a little bit strange.
I would laugh out as much I can in happiness,
Live carefree and give wings to my restlessness.
I wasn't born to be slave of anyone's rules,
I was born a lion not someone in the group of mules.
Never want to regret on any mistake of mine,
Like a star in dark night I want to shine.
This who I am and I love to flaunt it ,
Sorry if in your ideal image I do not fit.

Sariyu Passi
Chandigarh, India

''دھرتی دامان''

ٹُٹ پَینا منٹو

حنیف باوا (جھنگ)

ٹُٹ پَینا منٹو
جد سچ بولے
جھوٹھ دے متھے تے
گوڑے پھکے
وَٹ پے جاون
منٹو،ٹُٹ پَینا منٹو
جدوی
اکھراں دیاں......
تِکھیاں نوکاں دے نَل
دیوآں رنگے
اُچے قداں والے
گھراں دیاں دہلیزاں دِتے
بدبو بھنے
پَھٹ پھرولے
تاں
وڈیاں ناساں والے
اپنے مُکھ نوں
رُوں دے وانگوں گولے
ہتھاں دے نَل
انج پَے ڈھکدے
جیویں......
ایہہ سارے پھٹ
تے پھٹاں چوں نِکلیا سارا گند
اوس ولوں نہ آیا ہووے
ٹُٹ پَینے منٹو دے
قلم دی تِکھی نوک چوں جد
''ٹھنڈا گوشت''
دھاہاں مار کے نکلے
''کالی شلوار'' دے
بخیے ادھڑے
تاں
عدالتاں دے ٹَل
انج پَے کھڑکن
جیویں......
عدل دے تیڑوں
دھوتی لہہ گئی ہووے
پر کی کریئے
انج کرن تے
بڑا ای روکیا ٹوکیا اونوں
پر اوہ نہیں منیا
اوہ نہیں مُڑیا
منٹو......
ٹُٹ پَینا منٹو......
جو ہویا

رس رابطے

جستجو،ترتیب،تدوین

وجیہہ الوقار (راولپنڈی)

گلزار بھائی،آداب۔

آپ کی محبت کے ثبوت میں چہارسو دستیاب ہوا جس سے ہم بھی خوش وقت ہوئے اور احباب بھی حظ اٹھا رہے ہیں۔سوال جہاں تک اس شمارے کی بابت رائے کا ہے تو ہم قطعی طور پر خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتے نہ ہمیں کبھی اپنے منہ میاں مٹھو بننے کا شوق رہا ہے۔ یہ استحقاق قارئینِ چہارسو کا ہے جسے وہ اپنی مرضی ومنشا کے مطابق استعمال کرنے میں آزاد ہیں۔ایک بات البتہ ضرور کہنے والی ہے کہ آپ جس دیدہ وری اور عرق ریزی سے انڈو پاک کے اہلِ قلم کو یکجا کررہے ہیں اُس کے لیے آپ کو جتنی بھی دعائیں دی جائیں وہ کم ہیں۔کسی نے کیا خوب جملہ کہا ہے:

مغل بچے جس پہ مرتے ہیں اُسے مار رکھتے ہیں

آپ کی محبت نے ہمیں مارنے کی بہت کوشش کی مگر یاد رکھئے ہم آپ سے ملے بِنا مرنے والے نہیں۔

منوررانا (لکھنؤ،بھارت)

محترم گلزار جاوید بھائی،

ربّ کائنات کی تمام رحمتیں اور سلام۔

تازہ چہارسو ملا۔ارے اللہ اتنا کچھ۔منوررانا مجسم،معتبر براہِ راست میں۔صدیوں کا رشتہ میں جدید غزل کی آبرو ہیں۔داد کے لیے لفظ کم کم ہیں مگر عطیہ سکندرعلی نے ''مہاجرنامہ'' بھجوا کر آنکھوں کو کچھ زیادہ ہی نم کردیا۔پہلی مرتبہ زندگی میں جب اختر شیرانی کی نظم ''او دیس سے آنے والے بتا'' پڑھی تھی تو آنکھوں کی نمی اشک رواں میں ڈھلی تھی۔۔۔علاوہ ازیں اس شمارے میں حسن منظر کا ''ادھ کھلے پھولوں کا زمانہ'' اور آپ کا ''ہمیں دعاؤں میں یاد رکھئے'' یادگار ہیں۔رینو بہل کا ''ماں جایا'' اور دیپک کنول کا ''ایک صدی کا قصہ'' ہمیشہ کی طرح سدا بہار۔۔۔!البتہ وجیہہ الوقار کا مرتب ومدون ''رس رابطے'' نے مجھے دوبارہ تروتازہ کردیا۔

عبداللہ جاوید نے درست ہی لکھا ہے ''چہارسو پاکستان بھارت اور بیرون بھارت کے لکھنے پڑھنے والوں کی جو نمائندگی کرتا ہے شاید ہی کوئی دوسرا جریدہ اس کے مقابل ٹھہرے سکے۔'' واقعی لاہور سے لکھنؤ تک اور کینیڈا سے کوئٹہ تک،بمبئی سے برلن اور برمنگھم تک ہر جگہ اور ہر سطح کا لکھاری اور قاری اس کے ساتھ بندھا ہے۔میرے گمشدہ بھائی۔۔۔!

میرے لیے آپ کی محبت ہی کیا کم تھی کہ اب اس میں کیسا کیسا قدآور اور جیّد لفظ ومعنی کا شناور اپنا سینہ کھولے دریائے محبت میں مجھے ڈبو رہا ہے۔میرے پاس آپ کی شکرگزاری کے لیے ہی لفظ نہیں تھے کہ اب اس میں کراچی سے حسن منظر صاحب اور غالب عرفان، یوایس اے سے یوگیندر بہل صاحب،شگفتہ نازلی صاحبہ لاہور سے ڈاکٹر ریاض احمد صاحب پشاور سے ہزارہ سے آصف ثاقب صاحب اور میرپورخاص سے میرے کرم فرما نوید سروش ان سب کی چھلکتی،مہکتی اور گرمجوش محبت کو کیسے سنبھالوں؟ اور نسیم سحر کے پیار کو کیونکر سمیٹوں؟ اس پہ پٹیالہ (بھارت) کے کرشن بھاوک صاحب کا اپنا انداز۔۔۔اپنی چاہت اپنی الفت۔

ان تمام حضرات نے میری خیرخواہی میں جن جذبات کا اظہار کیا ہے میری دعا ہے کہ ربّ قدیر ان کے درجات کو دنیا اور اس کے بعد بھی اونچا اور بلند وبالا اور آسودہ فرمائے۔

ایک وضاحت اور بھی میرے ذمے آن پڑی ہے۔ ڈاکٹریٹ کرنے کے باوجود میں نے خوشی سے خود کبھی ڈاکٹر نہیں لکھا۔(سوائے ڈاکٹریٹ کے تھیسس کے) ناول،فکشن،افسانے،ڈرامے کی کتاب پر ڈاکٹر کی نمائش موجود نہیں ہے اگر کسی پبلشر نے سرورق پر لکھ دیا بھی تو میں نے سرورق دوبارہ بنوایا اور ڈاکٹر لفظ کٹوا دیا۔میں سمجھتا ہوں تخلیقی انسان کو خود کو اپنے نام تک ہی محدود رکھنا چاہیے کوئی لاحقہ یا کوئی لقب مناسب نہیں۔کیا ڈاکٹر سعادت حسن منٹو،ڈاکٹر راجندرسنگھ بیدی اچھا لگے گا؟ مگر درست اور خیرخواہ ٹوکن آف Done کے لیے یہ سب کرتے ہیں۔ربِ عظیم آپ سب کو جیتا جاگتا اور چہکتا مہکتا رکھے۔

یونس جاوید (لاہور)

میرے گلزار، جیتے رہو۔

سمجھ نہیں آتا کہ تمہاری کس خوبی کو سراہوں۔جو کام بھی تم کرتے ہو اُس میں لگن،شوق اور محنت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔سب سے پہلے تو منوررانا صاحب کا انتخاب ازاں بعد اُن پر لکھے گئے مضامین اور رانا صاحب کی شعری و نثری تخلیقات کا خوبصورت انتخاب اور دلکش پیشکش نے مسحور کردیا۔منوررانا صرف شاعر نہیں ایک بیدار مغز انسان ہیں جو اپنے گردوپیش کی منظرکشی اس قدر دل سوزی سے کررہے ہیں کہ اُن کے کلام میں انیس اور دبیر کی جھلک نظر آتی ہے۔مہاجرنامہ تو اس قدر دل دوز تحریر ہے کہ قاری کا خود پر قابو رکھنا مشکل ہوجاتا ہے۔کون سا پہلو ہے جس کو رانا صاحب نے اُجاگر نہیں کیا۔میں اسے صرف مہاجر طبقے سے منسوب کرنے کے بجائے پورے برصغیر کا نوحہ کہوں تو غلط نہ ہوگا۔میری طرف سے منوررانا صاحب کو ڈھیر ساری دعائیں اور نیک تمنائیں ضرور پہنچایئے۔

شمارے کے دیگر مشمولات میں آسکر وائلڈ کی کہانی ''خوش باش شہزادہ''،جس کا ترجمہ فیروز عالم نے اس قدر خوبصورتی سے کیا ہے کہ اگر قاری کو نہ بتلایا جائے تو یہ طبع زاد کہانی لگتی ہے۔جناب تابش خانزادہ کے ناول کا باب بھی

قاری کی دلچسپی کا مرکز بنا رہتا ہے۔حسن منظر کی کہانی میں پریم چند اور علی عباس حسینی کا رنگ صاف دکھائی دیتا ہے مگر کہانی کو جس سُبک روی سے حسن منظر نے آگے بڑھایا ہے وہ اُن کا خاص وصف ہے۔شموئل احمد کی کہانی ''گھر واپسی'' سامنے نظر آنے والی حقیقت کا دلچسپ بیان ہے البتہ اس میں رومانس کا عنصر نہ ہوتا تو زیادہ بامقصد کہانی ہوتی۔سیمیں کرن صاحبہ کا نام میں نے پہلی مرتبہ پڑھا ہے۔ بڑے اہم مسئلے کو نہایت جرأت مندی سے تحریر کیا ہے جس کے لیے انہیں شاباش دیتا ہوں۔اور جہاں تک تمہاری کہانی ''دعاؤں میں یاد رکھیے'' کا تعلق ہے تو اُس کے بارے یہی کہوں گا کہ تم نے اردو کہانی کو جو نیا اسلوب محسوس کرنے کے ساتھ دکھانے کا عمل شروع کیا ہے یہ کہانی اُس کی بہترین مثال ہے۔مکالمے اور اشعار اتنے برمحل اور برجستہ ہیں کہ بے ساختہ لبوں پر تبسم پھیل جاتا ہے۔

اس بار محترمہ پروین شیر کی کمی کا شدت سے احساس ہوا۔اُمید ہے اگلے شمارے میں اس کی تلافی ضرور ہوگی البتہ عزیزہ رینو بہل نے ''ماں جایا'' لکھ کر خاکہ نگاری میں قدم رکھ دیا ہے۔''ماں جایا'' اس بات کا اعلان ہے کہ یہ پُرعزم لڑکی اس میدان میں بھی اپنا لوہا منوا کے رہے گی۔اس شمارے میں احباب کا کلام تو شامل نہیں البتہ ڈاکٹر ریاض احمد کی یومِ پاکستان دردمند دل کی سچی آواز ہے جس کے لیے ڈاکٹر صاحب کو مبارکباد دیجیے۔

یوگیندر بہل تشنہ (کینیڈا)

برادرم جاوید جی، آداب۔

چہارسو کا منور رانا نمبر ملا بہت بہت شکریہ۔ یہ نمبر واقعی قابلِ تحسین ہے اور اسے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ آپ نے اُن کے شایانِ شان نمبر نکالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور اس کی وساطت سے پاکستان کے قارئین کو بھی اُن کے بارے اچھی معلومات حاصل ہو جائیں گی، جنہیں اُن سے متعلق شاید زیادہ جانکاری نہیں ہے۔اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مستقبل میں اُن پر تحقیق کرنے والوں کے اس کا مطالعہ ناگزیر ہو جائے گا۔

نند کشور وکرم (دہلی، بھارت)

محترم گلزار صاحب، تسلیم و نیاز

منور رانا صاحب پر مشتمل چہارسو کا قرطاس اعزاز وصول ہوا۔اپنی کم علمی کا اعتراف کہ میں ان کے نام سے واقف نہیں تھا۔آپ نے جس طرح انکے متعلق معلومات جمع کی ہیں وہ پڑھ کر خود سے شرمندگی ہوئی کہ ایسے نامور، با صلاحیت اور ہمہ جہت شخصیت سے کیوں کر بے بہرہ تھا۔ان کے اعزازات کی فہرست دیکھ کر اندازہ ہوا کہ انکے فن اور شخصیت کو قبولیت عام و خاص حاصل ہوئی ہے۔ان سے ناواقفیت کی وجہ شاید یہ ہو کہ تقریباً چالیس سال سے ملک سے باہر ہوں۔ان پر لکھے گئے سارے ہی مضامین نہایت دل سے تخلیق کئے گئے ہیں جن میں مظفر حنفی، ڈاکٹر محبوب راہی، ظہیر غازی پوری و دیگر قلم کاروں نے ان کے فن کا معروضی احاطہ کیا ہے۔رانا صاحب کا ''بریلی سے کلکتہ تک'' بہت پسند آیا اور انکی طویل نظم مہاجر نامہ بھی خوب ہے مگر وہ لوگ جنکے آبا و اجداد نے پاکستان ہجرت کی وہ اس نئی مملکت سے اتنے مایوس نہیں ہیں جتنا انکا خیال ہے۔بہرحال ہر شخص کا اپنا اپنا نظریہ ہے۔رانا صاحب کا ''مسافر اتر گیا'' بہت ہی متاثر کن تھا۔

افسانوی سیکشن میں مجھے حسن منظر کا افسانہ ''ادھ کھلے پھولوں'' بہت پسند آیا۔اس قسم کے افسانے مجھے ہمیشہ جذباتی کر دیتے ہیں۔مگر جس تحریر کا میں خاص طور سے ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ مدیرِ چہارسو کا افسانہ ''ہمیں دعاؤں میں یاد رکھنا'' ہے سب سے اہم بات یہ کہ رسالہ ملنے پر میں نے اسے کھول کر صرف سرسری طور پر اس کے مشمولات دیکھنے کا ارادہ کیا تھا مگر جب اس کہانی کو شروع کیا تو اتنا محو ہوا کہ معلوم ہی نہ ہوا کب کہانی ختم ہوگئی۔اس قدر روانی تھی، اس قدر اختصار تھا، اتنی دلچسپ تھی کہ میں پڑھتا ہی چلا گیا۔بہت ہی دلچسپ زبان اور مکالمے تھے۔کسی بھی تحریر کی کامیابی اسی میں ہے کہ قاری اس سے چپک جائے۔یہی حال میرا ہوا،مبارک۔

شموئیل صاحب کی ''گھر واپسی'' کا طرزِ تحریر پسند آیا وہ بہت گہری اور ہندوستان کے موجودہ حالات کے تناظر میں ایک بھرپور کہانی ہے مگر مجھے یہ بات پسند نہیں آئی کہ جوگی ایک نسوانی حسن کے سحر میں گرفتار ہو کر مسلمان ہوگیا۔یعنی مسلمان ہونے کی بنیادی تحریک بالواسطہ طور پر جنسی تحریک تھی۔

پاکستان میں آج کل جو مسالک کی بنیاد پر تفرقہ اور نفرت پھیلائی جارہی ہے اس کے پس منظر میں سیمی کرن کی تحریر بھی برمحل ہے۔کئی سال بعد تابش خانزادہ، جنہوں نے مجھے چہارسو سے متعارف کروایا تھا، کی واپسی ہوئی۔انہوں نے اس ناول پر بڑی محنت اور تحقیق کی ہے دعا گو ہوں کہ قارئین اسے پسند فرمائیں گے۔ڈاکٹر ریاض احمد کا یادگاری مضمون، صفوت صاحب پر، ایک لاجواب تحریر ہے جس میں صفوت کے لئے انکا بے پناہ خلوص جھلکتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ کسی کے انتقال پر اتنا اچھا مضمون میں نے کم ہی دیکھا ہے۔یہیں یہ بھی لکھ دوں کہ یوم پاکستان پر ان کے قطعات بھی بہت خوب ہیں اور انہوں نے ہر اس پاکستانی کے دل کو چھولیا ہے جسے وطن سے محبت ہے اور یہ میرا مشاہدہ ہے کہ تمام تر منفی پروپیگنڈے اور حکومتی ٹولے کی بدعنوانیوں کے باوجود پاکستانی اپنے ملک سے بے پناہ، جی ہاں بے پناہ محبت کرتے ہیں۔شکریہ ریاض صاحب کہ ۲۳ مارچ کے موقعہ پر آپ نے ایک بار پھر ہمیں یہ یاد دلا دیا کہ ہم سب پاکستان ہی کی وجہ سے ہیں اور یہی ہماری پہچان ہے۔

اب کچھ اپنے موجودہ پروجیکٹ کے متعلق۔مجھے اس بات کا احساس ہے کہ اردو پڑھنے والے متوسط طبقے کی عالمی ادب تک رسائی کم ہے۔انگریزی کی کتابیں یا انکے اردو میں ترجمے آسانی سے دستیاب نہیں۔لائبریریوں کی کمی ہے اور غیر ملکی کتابیں مہنگی ہیں۔اگرچہ افسانوں کے شعبے میں عام لوگوں نے عالمی مشاہیر کا نام تو ضرور سنا ہوگا مگر زیادہ تر لوگ ان قلمکاروں کے فن سے ناواقف ہیں۔اس لئے میں نے گلزار صاحب کے مشورے سے عالمی ادب کے شاہکار

افسانوں کا ترجمہ شروع کیا ہے۔ یہ ذرا مشکل کام ہے اس لئے کہ کہانیوں کے انتخاب کے لئے نہ صرف کئی کہانیاں پڑھنی پڑتی ہیں بلکہ ان پر معتبر تنقید نگاروں کے تبصرے بھی پڑھنے ہوتے ہیں۔ خوش قسمتی سے ایسے ملک میں ہوں جہاں علم کی تشہیر اور معلومات کی دستیابی سوسائٹی کی پہلی ذمہ داری ہے اس لئے میرے لئے یہ کام آسان ہو گیا ہے۔ میں اپنے قارئین سے درخواست کرتا ہوں کہ ان تراجم کو غور سے پڑھیں اور اپنی رائے سے ضرور آگاہ کریں۔

جن افراد نے اس خاکسار کی گزشتہ کوششوں کو سراہا ہے ان کے لئے ممنون و مشکور ہوں۔

فیروز عالم (کیلیفورنیا)

برادرم گلزار جاوید جی، سلام مسنون۔

''چہار سُو'' کے شمارہ مارچ اپریل ۲۰۱۶ء میں شامل ''قرطاسِ اعزاز'' ہندوستان کے مشہور شاعر جناب منوّر رانا کے بارے میں ہے جن سے جدہ میں اور پھر کچھ دوسرے ممالک کے مشاعروں میں اتنی ملاقاتیں رہیں اور اُن کا کلام انہی کی زبانی اتنی مرتبہ سُنا کہ اب اُن کے بارے میں اتنی بہت سی اچھی اچھی تحریریں پڑھ کر وہ اپنے شعر پڑھنے کے مخصوص انداز سمیت سراپا بن کر میرے سامنے آ گئے۔ ان کی شاعری تو یقیناً خاصے کی چیز ہے ہی، مگر اُن کی نثر پڑھ کر تو مزید لطف آیا کہ یہ پہلو ملاقاتوں میں ہونے والی گفتگو میں اس انداز میں کبھی سامنے نہیں آیا تھا۔ ان کی شخصیت کے کئی روشن گوشے ''براہِ راست'' میں آپ کے سوالوں کی بدولت سامنے آئے ہیں جبکہ ان کی دبنگ اور بیباک تحریر کا اندازہ ان کے مضمون ''بریلی سے کلکتے تک'' پڑھ کر ہوا۔ اگر چہ ایک پاکستانی کی حیثیت سے مَیں ''مہاجر نامہ'' سے منتخب دیئے گئے کچھ اشعار سے متفق نہیں ہوں لیکن ظاہر ہے ادیب اور شاعر جو کچھ محسوس کرتا ہے اسے وہی کچھ بیان کرنے کا حق حاصل ہے۔ مجموعی طور پر منوّر رانا ایک بڑے شاعر اور بڑے انسان ہیں۔ اب میں کوشش میں ہوں کہ کسی طرح ان کے نثری مضامین کی کتاب ''سفید جنگلی کبوتر'' حاصل کر سکوں۔ معلوم نہیں آپ اِس سلسلے میں میری کچھ مدد فرما سکتے ہیں یا نہیں۔

افسانوں میں محترمہ سیمیں کرن کا افسانہ ''کتے بلّیوں کے پیچھے آتے ہیں'' علامتی انداز میں وہ سب کچھ کہہ گیا ہے جو براہِ راست کہنے میں خودکش دھاکے کا شکار ہونے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ افسانے میں ایک مسجد کا ذکر ہے جس کا نام مدنی مسجد ہے، مگر وہاں جو کچھ ہوتا ہے سراسر اسلامی تعلیمات کے خلاف ہوتا ہے۔ اللہ معاف فرمائے اب تو مدنی مسجد، مدنی چینل اور ایسے مقدس ناموں کے پردے میں عجیب عجیب تماشے ہو رہے ہیں۔ آج ہی ایسی ایک ''مذہبی تنظیم'' کا پیغام آیا ہے کہ انہوں نے شو بزنس سے وابستہ لوگوں کے جن بھوت نکالنے اور دیگر کئی اقسام کے روحانی علاج کے لئے ایک پروگرام ترتیب دیا ہے۔ ٹی وی پر اکثر تشریف لانے والے ایک مولانا کے ہاں سے غیر ملکی شراب کی بوتلیں بھی پکڑی گئیں اور موصوف ایک سفارتخانے کی تقریب میں ''ٹُن'' بھی پائے گئے۔

دوسرا افسانہ ''ہمیں دُعاؤں میں یاد رکھیے'' ہے جو آپ نے لکھا ہے۔ اس کا مکالماتی انداز لڑکے اور لڑکی کی کسی حد تک بے تکلفانہ گفتگو اچھی لگیں۔ اختتام ایک ڈرامائی موڑ پر لے آتا ہے جہاں وہ دونوں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ''نو مینز لینڈ'' میں ایک دوسرے سے ملنے کی بیتابی میں دوڑتے ہوئے سرحدی محافظوں کی گولیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ علامتی انداز میں اس افسانے کے موضوع کو ''امن کی آشا'' کے قتل سے بھی منسلک کیا جا سکتا ہے۔

جناب تابش خان زادہ کے ناول ''زہریلا انسان'' کے ایک باب نے تو اس مرتبہ حیرت زدہ کر دیا، تحریر کی دلکشی اور تجسس اپنی جگہ، سانپوں، سپیروں اور سانپ کے منکے کے بارے میں ایسی تفصیلات پہلے کبھی نظر سے نہیں گزری تھیں۔ جس مرحلے پر اس باب کا اختتام کیا گیا ہے اس پر قاری بے ساختہ اگلی قسط کا انتظار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

محترمہ حمیدہ معین رضوی نے ''تنقید کے حوالے سے کچھ حقائق'' پر جو فکر کشا مضمون تحریر فرمایا ہے اور تنقید کی جو تعریف لکھی ہے وہ لکھاریوں کے لئے بھی سوچ کے بہت سے دَر وَا کرتی ہے۔ تاہم لندن میں مقیم ہونے کی وجہ سے ان کے مضمون میں وہاں کے تنقید نگاروں کی صورتِ حال سے آگاہی زیادہ ہوتی ہے۔

نسیمِ سحر (راولپنڈی)

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

جناب حسن منظر نے آپ کا تازہ شمارہ ''چہار سُو'' مطالعے کے لیے مجھے دیا اس میں خاص طور پر منور رانا صاحب کا کلام اور انٹرویو نظر سے گزرا۔ محترم منور رانا بڑے شاعر ہی نہیں بلکہ بہت بڑے شاعر ہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ شاعر اپنی تعریف و توصیف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں لیکن اُن کی خود پسندی انہیں اس حد تک لے گئی کہ وہ اپنے آپ کو خدائے سخن میر تقی میر سے بھی آگے لے گئے۔

جسٹس حاذق الخیری (کراچی)

برادرم گلزار جاوید صاحب، مزاج گرامی قدر۔

''چہار سُو'' نظر نواز ہوا پڑھ کر احباب کے علمی کام کا اندازہ ہوا۔ منوّر رانا صاحب کمال کے آدمی ہیں، سید منور علی جو منور رانا ہو گئے بہت قادر الکلام شاعر اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں، مہاجر نامہ اور ماں کے حوالے سے اُن کی تخلیقات واقعی اہم ہیں۔ تصانیف، انعامات، تحقیق، شاعری، نثر سب کچھ لائق تحسین۔ اللہ کرے اُردو کے یہ محسنین زندہ و پائندہ رہیں۔ افسانے، انشائیہ سے رس رابطے تک پرچہ ایک مکمل جریدہ ادب ہے بلکہ مرقع اردو ہے۔

کرامت بخاری (لاہور)

مدیر محترم، سلام مسنون۔

مارچ اپریل کا قرطاس اعزاز بنام جناب منور رانا موصول ہوا جس کے مندرجات جامع و وقیع براہ راست، مختلف طرز نگارش کے مضامین و تاثرات

اورطویل نظم مہاجرنامہ کے انتخاب پرمشتمل ہے جو اسے اعزازات کی فہرست میں معتبر اضافے کا باعث بنارہے ہیں۔

ینکسٹرز کے قریبی مطالعے اور مشاہدے سے ترتیب پاتی ہوئی ٹیلیفونک/موبائل ٹاک،نوگوابریاپہ آ کر جس تلخ حقیقت سے دوچار ہوتی ہے اس سے قاری کی ذہنی کیفیت لاشعوری طور پرخوشگواریت سے افسردگی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور دُور کہیں ''دعاؤں میں یاد رکھئے'' کی بازگشت سنائی دینے لگتی ہے۔ اس تاثر کوفزوں کرنے کے لیے مرکزی کرداروں کے لب ولہجے پہ مضبوط گرفت اور برجستہ میر وغالب کے اشعار مکالماتی معنی خیزی کو اُبھارتے ہیں۔

آسکر وائلڈ کی کہانی ''خوش باش شہزادے'' سے بدصورت مجسمے تک حالات وواقعات کے کئی نشیب وفراز سے گزرتی ہے شہزادے کی نیکی، بھلائی اور اچھائی کی رسائی دوسروں تک ممکن بنانے کے لیے ہمدرد دوست وغمگسار فاختہ کی مخلصانہ پروازیں کہانی کو آگے بڑھاتی اور تکمیل خواہش کا وسیلہ بنتی ہیں۔آخر میں شہزادے کا دل کی گہرائیوں سے بنی نوع انسان کے دکھ درد دُور کرنے میں فاختہ کا حسنِ سلوک بارگاہِ ایزدی میں شرفِ قبولیت پاتا ہے جو اختتام کو ہمہ گیریت سے ہمکنار کرتا ہے۔

''منٹو'' کی پسندیدگی کے لیے شکریہ، شاید اُنہیں ہماری تعریف و توصیف سے کوئی سروکار نہ رہا ہو مگر کیا کیجیے کہ منٹو سے متعلق لکھ کے اپنے قلم پہ اعتبار وتفاخر بڑھ جاتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید صاحب اور پروفیسر زہیر کنجاہی صاحب کی رحلت ادبی سانحات ہیں، ربّ العزت ان کے درجات بلند فرمائے اور ہمیں اُن کے علمی و ادبی سرمائے سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)۔ چہارسو کے اوراق میں تادیراُن کی کمی محسوس ہوگی اور یاد کئے جاتے رہیں گے۔ڈاکٹر صاحب کے تعزیتی ریفرنس میں بیشتر اساتذہ واحباب نے اردو ادب کی تحریکیں،اوراردوادب کی مختصر تاریخ کا بالخصوص تذکرہ کیا اور طالب علموں کے لیے مفید ومعاون قرار دیا جبکہ اُن کی مختلف موضوعات پہ دیگر کئی کتب بھی سند کا درجہ رکھتی ہیں۔ڈاکٹر صاحب کے لیے خراج تحسین (قطعات):

تحقیق و تجزیہ ہو یا تنقید و تبصرہ
سب پہ محیط اُن کا قلم ہے یہاں وہاں
آئینہ ہو خطوط کا سورج ہو شام کا
قرطاسِ فن پہ ثبت مفاہیم کے جہاں!

تحریکیں ہوں ادب کی یا افسانے دیپی ہوں
علم وادب کی عید ہیں،آگے کہوں میں کیا
ہوں، چہرے محترم، کہ پرندہ سفر میں ہو،
انور ہیں اور سدید ہیں، آگے کہوں میں کیا!

شگفتہ نازلی (لاہور)

گلزار جاوید صاحب،السلام علیکم۔

اس بار''چہارسُو'' کا زیادہ انتظار کرنا پڑا مگر جب منظر عام پر آیا تو پڑھ کر دلی خوشی ہوئی۔ جناب منور رانا صاحب ایک جرأت مند شاعر اور ادیب ہیں اور 21 تصانیف 22 انعامات اور 13 اعزازات کی بنا پر نہ صرف برصغیر بلکہ دیگر ممالک میں بھی اردو کے حوالے سے نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ان کی نمایاں طویل نظم''مہاجرنامہ'' پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔اسی طرح ''یہاں ماں رہتی ہے'' بھی بہت متاثر کرنے والی نظم ہے۔آپ نے یہ شمارہ ان کے نام موسوم کر کے ایک قابل قدر کام کیا ہے۔

افسانوں میں''ہمیں دعاؤں میں یاد رکھئے'' آپ کا اپنا تحریر کردہ اور بولتا ہوا افسانہ جس میں اختتام اس طرح اچانک اور غیر متوقع ہے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔شموئل احمد کا افسانہ''گھر واپسی'' بھی دلت معاشرہ میں افسوس ناک حیثیت اور دوسری طرف''مساوات'' اور انسانی اقدار کے احترام کا نہایت متاثر کن منظر نامہ ہے۔رینو بہل کا خاکہ''ماں جایا'' بھی ایک بولتی ہوئی دلچسپ تحریر ہے جس میں اختتام دل کی دھڑکنوں کو تیز کر دیتا ہے۔ڈاکٹر فیروز عالم صاحب کا شکریہ کہ وہ غیر ملکی زبانوں کی دلچسپ اور مشہور تحریروں کا اردو میں ترجمہ کر کے قارئین کی دلچسپی کے لیے پیش کرتے ہیں جیسے اس دفعہ آسکر وائلڈ کا ''خوش باش شہزادہ'' اسی طرح پروین شیر صاحبہ کے دلچسپ مضامین یا سفرنامہ کے حوالے سے یوگیندر بہل تشنہ صاحب کی تحریر یا نظم قابل تعریف ہے۔دیگر مضامین اور نظمیں بھی معیاری ہیں۔اس انتھک اور کامیاب کاوش پر ہماری طرف سے مبارک باد وصول کیجیے۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

بھائی گلزار جاوید،السلام علیکم۔

''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ اپنے ادبی وقار کے ساتھ نظر نواز ہوا۔منور رانا کا گوشہ مرتب کر کے لگتا ہے آپ نے میرے دل کی آواز سُن لی۔ابھی میں ڈاکٹر یونس جاوید کے گوشے کی خوب صورتی اور معنویت کے حصار سے باہر نہیں آ سکا تھا کہ آپ نے ایک اور ادبی معرکہ سر کر لیا۔منور رانا صاحب سے ملنے کی خواہش کچھ برس پہلے حیدرآباد سندھ کے عالمی مشاعرے میں پوری ہوئی تھی اور اُن کے متعلق مفید معلومات چہارسو کے صفحات نے پہنچائی۔منور رانا کی غزل ہمارے عہد کے پسے ہوئے طبقے،رشتوں کی اہمیت،صاحبِ اختیار کی بے رحمی اور غریبوں کے استحصال کی حقیقی ترجمان ہے۔ بڑی منفرد اور گرفت میں لینے والی شاعری ہے۔روزمرہ میں استعمال ہونے والے لفظوں کو جس روانی اور فنی مہارت سے استعمال کیا ہے کمال کیا ہے۔''براہِ راست'' میں آپ کے اہم سوالات کے جوابات،رانا صاحب نے سچائی،سادگی،مسلم تہذیب اور ہندوستانی ثقافت کی پس منظر میں تفصیل سے دیے ہیں۔اُن کی نظم''مہاجرنامہ'' نظم کا اقتباس محترمہ عطیہ سکندر نے محنت سے انتخاب کیا ہے۔اس میں ہم پاکستانیوں (ہر طبقے) کے لیے

بہت سے سوالات ہیں اگر ملک کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات اچھے ہوتے تو ہم اس کا جواب دینے کے قابل تھے ابھی تو خاموشی بہتر ہے نظم میں ہوش بھی ہے اور جوش بھی، فنی نزاکتوں کے ساتھ ساتھ جذباتیت بھی ہے۔ منور رانا صاحب کی یادیں ''بریلی سے کلکتے تک'' ایک ستھری تہذیب اور مشرقی روایات سے مزّین تحریر ہے۔ مظفر حنفی، عرفان صدیقی، ڈاکٹر انور سدید مرحوم اور حقانی القاسمی کی تحریریں منور رانا کے فکر وفن کی اچھی تفہیم کرتی نظر آتی ہیں۔ یہ گوشہ بھی ماضی کے کئی اہل قلم کے گوشوں کی طرح یاد رکھے جانے کے قابل ہے۔

''ہمیں دعاؤں میں یاد رکھئے'' ایک ایسے افسانہ نگار کی تخلیق ہے جو بخوبی جانتا ہے کہ کس موضوع پر کس طرح اور کس سچویشن (کیفیت/صورت حال) پیش کرنے کے کیا تقاضے ہوتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے مکالموں اور ان کی کیفیت سے ظاہر کیا ہے کہ کردار بالمشافہ ملاقات نہیں کر رہے بلکہ جدید ایجادات کے ذرائع استعمال کر رہے۔ اختتام نے افسانے کو اہم بنا دیا کہ ''محبت'' سرحدوں میں بٹی نفرت اور پابندیوں کو قبول نہیں کرتی۔ سرحدیں تو پہچان کے لیے ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر فیروز عالم نے آسکر وائلڈ کی کہانی کا ترجمہ ''خوش باش شہزادے'' کے عنوان سے چہارسو کے قارئین کی نذر کیا ہے انتخاب اور ترجمے کی داد دینی پڑتی ہے۔ پاکستانی عوام اور دنیا میں پسے ہوئے لوگوں کو ایک ایسے ہی شہزادے اور وفادار چڑیا کی ضرورت ہے۔ تاریخ میں ایسے دردمند کردار ملتے ہیں جو اپنی ذمے داریوں کو محسوس کرتے ہیں اور اپنی رعایا اور دوسروں کے بارے میں سوچتے ہیں۔ ترجمے میں مردہ پرستی کے بجائے زندہ لوگوں کی خدمت اور اُنہی کے ساتھ جینے کو اولیت قرار دیا ہے۔

رینو بہل کا تحریر کردہ خاکہ (بقول مصنف) ''ماں جایا'' متاثر کن تحریر ہے جس میں رشتوں کا اعتبار اور انہی مستقل مزاجی سے نبھانے کا اعلیٰ پیغام ہے۔ اس خاکے میں افسانویت زیادہ آ گئی ہے مگر تحریر خوب ہے، واہ واہ۔ یوگیندر بہل تشنہ کی پروین شیر کے لیے نظم نے خاصا متاثر کیا۔ دیپک کنول صاحب ''ایک صدی کا قصہ'' میں اپنا رنگ جمائے ہوئے ہیں اس بار انہوں نے کراچی میں پیدا ہونے والی سادھنا کی ابتدائی زندگی، کامیابیاں، بیماری اور مشکل دنوں کو پیش کیا ہے۔ وجیہہ الوقار ''رس رابطے'' بڑی محنت سے ترتیب دیتے ہیں۔ عبداللہ جاوید، ڈاکٹر ریاض احمد، آصف ثاقب اور نسیم سحر کے خط اہم ہیں۔

نوید سروش (میر پور خاص)

گلزار بھائی، آداب۔

ہر بار کی طرح چہارسو کا تازہ شمارہ بھی اپنے ساتھ چاروں سمت سے ادب کی خوشبو سمیٹے موصول ہوا۔ منور رانا جنہیں جاننے اور اُن کی شاعری پڑھنے کی خواہش مدت سے تھی وہ آپ نے پوری کر دی۔ ''بریلی سے کلکتے تک'' اور ''براہِ راست'' نے اُن کی ذاتی اور ادبی زندگی کی بھرپور جانکاری فراہم کر دی۔ ایک بات بتایئے، آپ ہر بار نئے نئے سوالات کہاں سے ڈھونڈ کر لاتے ہو اور ہر بار انٹرویو میں دلچسپی کے ساتھ ساتھ ندرت کا بھی ذائقہ ملتا ہے۔ عطیہ سکندر نے ''مہاجر نامہ'' سے جو چُن چُن کر اشعار سمیٹے ہیں بہت خوب ہیں۔ نامی گرامی دانشوروں کے اُن پر لکھے مضمون اور ان کی غزلوں اور نظموں کا انتخاب بھی بہت خوب رہا۔ رانا صاحب کی شاعری نے سرشار کر دیا۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ اور سلامت رہے آپ اسی طرح خوشیاں بانٹتے رہیں۔

افسانے سبھی کمال کے ہیں۔ ''ادھ کھلے پھول کا زمانہ'' کچی عمر کی پیاری یادیں اپنے ساتھ لایا۔ ''کُتے بلیوں کے پیچھے آتے ہیں'' سیمیں کرن کا خوبصورت علامتی افسانہ ہے۔ مذہب کے ٹھیکیداروں کو بے نقاب کرنے کی اُن کی کوشش کامیاب رہی۔ ''گھر واپسی'' شموئل احمد کا افسانہ خوب ہے۔

''ہمیں دعاؤں میں یاد رکھئے'' افسانہ + ڈرامہ کہا جا سکتا ہے۔ گلزار جاوید صاحب کی یہ خاصیت ہے کہ وہ افسانہ پڑھاتے نہیں، فلم دکھاتے ہیں۔ افسانہ دلچسپ تھا مگر اختتام دردناک نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ایم رحمان صاحب کے اکثر افسانے مختلف رسالوں میں پڑھنے کو ملتے ہیں مگر انشائیہ پہلی بار پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ فیروز عالم صاحب خوب ترجمہ کر رہے ہیں افسانہ ''خوش باش شہزادہ'' بھی بہت خوب ہے۔ اچھا سلسلہ ہے اس طرح دوسری زبانوں کے ادبی جریدوں سے بھی اردو والوں کی آشنائی ہو جاتی ہے۔

تابش خانزادہ کے ناول ''زہریلا انسان'' کا پہلا باب بہت دلچسپ ہے جس طرح انہوں نے سانپوں کا نہ صرف ذکر کیا ہے بلکہ جو جانکاری دی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنہوں نے بہت گہرے مضمون پر مشاہدہ کیا ہے۔ اس دنیا سے جان پہچان کرا رہے ہیں جسے بہت کم لوگ اس طرح جانتے ہونگے۔ ایک کامیاب ناول وہ ہی ہے جسے اور آگے پڑھنے کا اشتیاق بنا رہے۔ اور اُن کا پہلا باب ختم ہوا اور اگلا باب پڑھنے کا اشتیاق بڑھ گیا۔

تشنہ صاحب کی نیک دعائیں پروین شیر کو حوصلہ ضرور دیں گی جو اُنہوں نے اپنی نظم میں اُنہیں دی ہیں۔ تنقید کے حوالے سے حمیدہ معین رضوی کا مضمون معلوماتی ہے۔ صفوت صاحب کی وفات کا پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے امان میں رکھے۔ ''ایک صدی کا قصہ'' ہر بار کی طرح دلچسپ ہے۔ سادھنا کے آخری دنوں میں گھر سے بے گھر ہونے کی کہانی تکلیف دہ ہے۔ عرش سے فرش کی کسی بھی فنکار کی یا یوں کہیے کسی بھی شخص کی داستان دکھ دیتی ہے۔

ڈاکٹر ریاض احمد نے وطن واپسی کے جذبات بہت خوب بیان کیے ہیں۔ رس رابطے تو ہمیشہ کی طرح دلچسپ ہوتے ہیں۔

رینو بہل (چندی گڑھ، بھارت)

مکرمی ومحترمی گلزار جاوید، السلام علیکم۔

چہارسو مارچ اپریل ۲۰۱۶ء باصرہ نواز ہوا۔ آپ کی معذرت پڑھ کر مجھے خود حیرت ہوئی مجھ سے کیسی آپ معذرت کر رہے ہیں یہ تو محترم پروفیسر کرشن بھاؤک سے کرنا چاہیے۔ جن کے خط کے نیچے اُن کا نام شائع نہیں ہو سکا۔ جس کی

وجہ سے اُن کا اور میرا خط خلط ملط ہوگیا۔ مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ ایک کشادہ دل انسان ہیں کسی کی دل آزادی آپ کو برداشت نہیں۔ چہارسو نے نکلتے سورج کی طرح ہر بار، بہت معتبر اور بہت ہی تازہ ہوتا ہے۔ ہر بار ایسی ادبی شخصیت کے نام قرطاس اعزاز ہوتا ہے جس کے علم وفن کے بارے میں اہلِ نقدونظر اچھی آراء رکھتے ہیں۔ اس مرتبہ اردو اور ہندی کے معروف شاعر اور نثر نگار منور رانا کو یہ اعزاز حاصل ہوا۔ اُن پر لکھنے والوں نے متفق ہوکر یہ تسلیم کیا کہ منور رانا ایک بے باک اور منفرد قلم کار کا نام ہے۔ اس مرتبہ چہارسو میں شائع ہونے والی شاعری پر تو منور رانا حاوی رہے اس لیے کسی اور شاعر کا شائع ہونا ممکن نہ ہوسکا۔ افسانوں میں یوں تو سبھی افسانے اچھے لگے مگر آپ کا افسانہ ''ہمیں دعاؤں میں یاد رکھئے'' عنوان اور طرزِ تحریر کے اعتبار سے ایک منفرد افسانہ کہلانے کا حقدار ہے۔

ابراہیم عدیل (جھنگ)

گلزار جاوید صاحب، دعائے صحت، عافیت وخیری۔

مارچ اپریل ۲۰۱۶ء کے شمارے میں خاصے کی چیز جناب منور رانا پر گوشہ ہے۔ کیا شخصیت ہے اُن کی اور کیا کلام! پڑھ کر لگا اُن سے ملاقات ہوگئی۔ یہ آپ کے انٹرویو کا کمال ہے۔ ایسا کلام میں نے نہیں پڑھا اور وہ بھی اس زبان میں جو ہماری روزمرہ کی زبان ہے، وہاں ابھی تک اُسی طرح کی زبان ہے جیسی ہم چھوڑ کر آئے تھے یہاں بھی ہے تو وہی، بس گدلی ہوگئی ہے۔

یہ زبان ان کی طویل نظم کی ہے اور غزل بھی اُس میں پوری طرح سما گئی ہے۔ جو میرے نزدیک مشکل کام تھا۔ اُن کی شخصیت کھلی شخصیت ہے، اس میں اینچ پینچ دکھائی نہیں دیتے ہیں۔ جو چاہتے ہیں کہہ ڈالتے ہیں لیکن بغیر دوسروں کا دل دکھائے۔ مہاجر نامہ تو یہاں کے کسی شاعر کو کہنا چاہیے تھا لیکن ہوا یہ کام اُن سے جو وہیں کے وہیں بیٹھے ہیں۔ کاش سرورق کی تصویر زیادہ روشن ہوتی۔ جی چاہتا ہے اُن کی ہندی کویتا بھی پڑھنے کو ملے۔ باوجود کینسر کے نرغے میں آجانے کے اک بھرپور جیون انہوں نے جیا ہے۔ اللہ انہیں خوش رکھے۔

حسن منظر (کراچی)

باغ تے فصلِ بہاراں پیارے گلزار جاوید، السلام علیکم۔

''چہارسو'' میں منور رانا کی شاعری اور ان کے نثری تشخص نے لطف دیا۔ ان کے ادبی مقام کا جائزہ حسن وخوبی سے لیا گیا ہے۔ ممکن ہے کچھ لوگوں کے نزدیک ان کی تغزلانہ اپج باعثِ حیرت ہو۔ اصل میں منور رانا نے غزل میں حیرت انگیز کامیابی سے امیجری کا برتاؤ روا رکھا ہے۔ آپ نے ہمت کی جو انہیں پاکستان میں اس خوبصورتی سے متعارف کرایا۔ رانا کا یہ شعر ان کے خاص شاعرانہ رویئے کی پہچان ہے۔

لکھی ہوئی ہے مقدر میں موت پانی کی
یہی سبب ہے کہ ہم کشتیوں میں رہنے لگے

عرفان صدیقی نے ان کی شاعری کا اپنے قرینے سے جائزہ لیا ہے آپ جانیں عرفان صدیقی کی شاعری بھی تصور اور تکلم کی شاعری ہے۔ ''ہمیں دعاؤں میں یاد رکھئے'' مزے کے ذائقے کی تحریر ہے یہ آپ کے گلزاری سٹائل میں فن کی جاوید نگاری ہے۔ نوید سروش اور نسیم سحر کی ادبی عظمت ہے کہ انہوں نے مجھے نوازا۔ نسیم سحر نے فی الواقع میرے ''مختلف نوعیت'' کے شعر کا حوالہ دیا مہربانی ان کی۔ اپنے پشاور کے ریاض احمد نے بھی مجھے پیار سے دیکھا۔ ان کا مضمون ''مکاں سے لامکاں'' دل کو لگا۔ پشاور ادبی دبستانوں میں اسم رکھتا ہے۔ دہلی، لکھنو، لاہور اور پشاور بڑے ادبی دبستان ہیں ان کی ''لہر بہر'' چہارسو اثر انداز ہوئی ہے۔

آصف ثاقب (بوئی، ہزارہ)

پیارے گلزار بھائی! آداب۔

مارچ۔اپریل ۲۰۱۶ء کا شمارہ ہمدست ہوکر فردوسِ نظر ہوا۔ طبیعت قدرے ناساز ہے لیکن چند قسطوں میں سارا پرچہ پڑھ ڈالا۔ منور رانا ایک منفرد لہجہ اور عصری حسّیت کے باوقار شاعر اور ادیب ہیں۔ ان کے کلام میں ذات اور کائنات دونوں کی عکاسی نمایاں طور پر سامنے آتی ہے اور سیدھے قاری یا سامع کے دل میں اُتر جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس وقت ملک کے مقبول ترین شاعر ہیں۔ بھارت و بیرون ملک کے مشاعروں میں ان کی شرکت مشاعرے کی کامیابی کی ضامن سمجھی جاتی ہے۔ آپ نے ان پر خصوصی شمارہ شائع فرما کر بہت نیک کام کیا ہے۔ ہاں اب کی بار کمپوزنگ کی اغلاط کچھ زیادہ ہی دَر آئی ہیں جو شاعری میں خصوصاً زیادہ اکھرتی ہیں۔ کاش میں آپ کے پاس ہوتا تو کچھ آپ کی معاونت کرسکتا۔

افسانے سبھی اچھے ہیں لیکن انسانی نفسیات کی عکاس دو خوبصورت کہانیاں ''ادھ کھلے پھولوں کا زمانہ'' (حسن منظر صاحب) اور ''ماں جایا'' (ڈاکٹر رینو بہل) میری نظر میں حاصلِ شمارہ ہیں۔ اس کے علاوہ شموئل احمد صاحب نے ''گھر واپسی'' میں ملک کی موجودہ سیاسی صورت حال کی جس بیباکانہ انداز میں منظر کشی کی ہے وہ یقیناً لائقِ تحسین ہے۔ تابش خانزادہ صاحب کے ناول ''زہریلا انسان'' کا باب بھی ایک جداگانہ انداز کا حامل ہے جو قاری کی دلچسپی کو آخر تک برقرار رکھتا ہے۔ اور ''ہمیں دعاؤں میں یاد رکھئے'' میں تو آپ کا منفرد اندازِ بیاں ہمیشہ کی طرح بے حد دلکش ہے۔

اپنے وقت کی مقبول ترین اداکارہ سادھنا سے متعلق دیپک کنول صاحب کی تحریر کا آخری حصہ پڑھ کر آنکھیں نم ہوگئیں۔ افسوس ہے کہ کیریئر کے اچھے دنوں میں سادھنا اور آر۔کے۔ نیرّ اپنا گھر خریدنے اور آخری عمر کے لیے کچھ رقم پس انداز کرنے کی بجائے اور پیسہ کمانے کی ہوڑ میں لگے رہے اور اپنا سب کچھ گنوا بیٹھے۔ آج کل کے فنکار اس معاملے میں بہت چست وچالاک ہیں۔

مہندر پرتاپ چاند (انبالہ، بھارت)

گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

مارچ۔اپریل کے شمارے میں ''قرطاسِ اعزاز'' کا قرعہ فال منور رانا کے نام نکلا تو موصوف آپ کے حواس خمسہ پر اس حد تک چھا گئے کہ ''چہارسو'' کے

کل ۷۶ صفحات پر قابض ہو گئے اور شاعری کے سارے صفحات (چہار کی زندگی میں پہلی بار) قربان کر دئے گئے۔ یہی نہیں یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ پسِ ورق جو عموماً صاحب اعزاز کی تاریخی تصاویر یا خاندانی تصاویر سے مزین ہوتا ہے وہ بھی اُن کے مقرر کردہ عکاس کی کاریگری کا ایسا نمونہ بن کر اُبھرا کہ ہر دیکھنے والا اُسے کسی بہت بڑے نابغہ مفکر کے روپے میں دیکھے اور دیکھتا رہ جائے! اس عنایت خسروانہ پر آپ کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے لیکن فہرست (متاع چہارسو) میں سرورق اور پس ورق کے سامنے شعیب حیدر زیدی کا نام دیکھ کر میں الجھن میں پڑ گیا کہ یہ تصویر کہیں زیدی صاحب کی تو نہیں کیونکہ میں نے ابھی تک منور رانا کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا جرم نہیں کیا تھا پھر محّی نجیب عمر سے تصدیق چاہی تو معلوم ہوا کہ وہ بھی منور رانا ہیں جنہیں وہ کسی عالمی مشاعرہ میں دیکھ چکے ہیں چلئے! مان لیتے ہیں کہ وہ ایک نامور مقبول شاعر ہیں اور ''مشاعرہ دیکھنے'' کے شوقین انہیں جانتے ہیں لیکن براہِ راست میں ہر دوسرے یا تیسرے سوال کے جواب میں اپنا کوئی نہ کوئی شعر پیش کر دینا کیا اُن کی کسی نفسیاتی گرہ کا شاخسانہ تو نہیں؟ کہ وہ بہر حال ذاتی تشہیر کا کوئی موقع تک ضائع نہیں کرنا چاہتے؟ کُل ۷۶ صفحات پر بکھری اُن کی شاعری کی تعریف وتوصیف جس میں بڑے بڑے زعمائے ادب کی گراں قدر آرا موجود ہیں سے بھلا مجھ جیسا ہیچ مداں کیسے انکار کی جرأت کرے مگر میں صرف اتنا کہنا چاہوں گا کہ ''ماں'' کی عقیدت میں کہے گئے اُن کے سینکڑوں اشعار کے سامنے ہمارے یہاں کے شاعر عباس تابشؔ کا یہ شعر یقیناً بھاری پڑے گا:

ایک مدت سے مری ماں نہیں سوئی تابشؔ
میں نے اک بار کہا تھا، مجھے ڈر لگتا ہے

دیپک کنول نے اس بار ''سادھنا'' کے بارے میں لکھا ہے اور اُن کی خوبصورتی کے ساتھ اُن کی منفرد اداکاری کی جس طرح تعریف کی ہے اس میں ذرہ برابر بھی مبالغہ نہیں بر سبیل تذکرہ اُن کا بالوں کا اسٹائل اُس زمانے میں اتنا مقبول ہوا کہ میری بڑی بیٹی (جواب ماشاءاللہ دادی/ نانی بن چکی ہیں) سادھنا کی مقبولیت کے زمانے میں صرف دو سال کی تھی، کو بھی میری بہنوں نے ''سادھنا کٹ'' بالوں میں کئی سال تک سجائے رکھا تھا۔

غالب عرفان (کراچی)

بھائی جان، السلام علیکم۔

ادھر کئی دنوں سے کمر کے درد سے پریشان ہوں اس لیے کام سے بھی رخصت لے رکھی ہے۔ چہارسو کا منور رانا نمبر واقعی بہت خوب، اچھا اور معیاری ہے۔ رانا صاحب ہمارے عہد کے ایک بہت مقبول اور اہم شاعر ہیں۔ اُن کی غزلیں سماج میں موجود رشتوں کا وہ گلدستہ ہیں جو زندگی کو مہکائے رکھتی ہیں۔ آپ نے رانا صاحب پر یہ خاص نمبر شائع کر کے بہت اچھا کام کیا اس پر آپ کو جس قدر داد دی جائے کم ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ یہ خاص نمبر ادبی حلقوں میں بہت پسند کیا جائے گا۔

پرویز مظفر (یو۔کے)

پیارے گلزار جاوید بھائی، السلام علیکم۔

اس بار ''چہارسو'' کی محفل میں محترم منور رانا صاحب رونق افروز ہیں۔ منور رانا صاحب عام فہم الفاظ میں نہایت روانی کے ساتھ روز مرہ واقعات انسانی روابط وسم ورواج، نیز قومی مزاج اور کلچر کی عکاسی کرتے ہوئے تلخ ترین واقعات کو نظم کرنے کی اعلیٰ ترین اہلیت رکھتے ہیں۔ اُن کے مطالعہ کے دوران مجھے اپنا ایک شعر یاد آیا۔

سیدھے سادے لفظوں میں تلخ وشیریں کہنا سیکھ
زیادہ گہری بات نہ کر کم کم لوگ سیانے ہیں

چنانچہ بقول انور سدید صاحب کے وہ قافیہ اور ردیف کی غلامی کرنے والے مشاعرہ باز شاعروں کی طرح مصرعہ ثانی سے مصرعہ اولا کی طرف سفر نہیں کرتے بلکہ شائدان پر پورا شعر اترتا ہے۔ اور واقعی دورانِ مطالعہ جابجا ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔

یاوا گوئی، غیر ضروری مبالغہ آرائی، اور مرصع کاری سے پاک آسان اور عام زبان میں حقیقی اور با مقصد شاعری اُن کا طرۂ امتیاز ہے۔ بے شک منور رانا صاحب زمانہ حال کے نمائندہ اور زندہ رہنے والے شاعر ہیں۔ میں ان کی عمدہ شاعری پر خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے جناب گلزار جاوید صاحب کا بھی بے حد ممنون ہوں جو قارئین کے لیے ایسا بیش قیمت ہیرا ڈھونڈ کر لائے۔ نیز براہِ راست میں آپ کے سوالات کسی بھی شخصیت کا نہ صرف احاطہ کرتے ہیں بلکہ اُسے ریزہ ریزہ کر کے سمجھنے میں بڑے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ سو اس طرح شاعری سے ہٹ کر بھی اُس کی سماجی، معاشی حیثیت نیز ماضی وحال میں اس کی طرزِ زندگی، سوچ وفکر سے بھی مکمل آگاہی ہوتی ہے۔

سوان کے تفصیلی تعارف کے علاوہ پرچے کا دیگر مواد بھی خوب تھا۔ رینو بہل کا خاکہ ''ماں جایا'' اور آپ کا افسانہ ''ہمیں دعاؤں میں یاد رکھئے'' بے حد پسند آیا۔ ایک صدی کا قصہ اپنا معیار اور دلچسپی قائم رکھے ہوئے۔ میں سب سے پہلے اسی کا مطالعہ کرتا ہوں۔

سلیم ناز (کراچی)

یہ وفا!

یہ وفا! اور مہکتے ہوئے پھولوں کی طرف
آؤ چلتے ہیں ذرا دیر بَبولوں کی طرف
ایک جھونکا تھا ذرا تیز ہوا کا، بخُدا
جتنے خاشاک تھے دیکھے ہیں بگُولوں کی طرف

(اکرم کنجاہی)

اقبال۔۔۔دیدۂ بینائے قوم

یہ مقالات ۱۹۹۷ء کے اواخر سے ۲۰۱۴ء تک کے عرصے کو محیط ہیں اور ان میں فکر اقبال کی متعدد قابلِ ذکر جہات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میرا ایقان ہے کہ اقبال نہ صرف عالم اسلام کے اتحاد، ارتقاء اور نشاۃ ثانیہ کے ضامن ہیں بلکہ ان کا آفاقی پیغام اپنے اندر اقوام عالم کی تقدیروں کو بدلنے کی غیر معمولی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ اقبال نے جن ابدی، فکری اور روحانی سرچشموں سے حیات افروز تصورات کشید کیے ہیں، وہ زندگی اور زمانے کی پے در پے گردشوں کے باوجود کبھی دھندلا نہیں پائیں گے اور اربابِ فکر و دانش ان سے مدتوں فیض یاب ہوتے اور حیاتِ تازہ پاتے رہیں گے۔ نہ صرف لوحِ شاعری پر لکھی اقبال کی تحریریں ہمیشہ بہار رہیں گی بلکہ ان کی متعدد نثری تحریروں کا جوبن بھی بہت حد تک ''دامنِ دل می کشد'' کی برہان مہیّا کرتا رہے گا۔

......تحسین فراقی

اشاعت: ۲۰۱۵ء، قیمت: ۳۵۰ روپے، دستیابی: پورب اکادمی، اسلام آباد۔

...... ادب اور سماجی شعور ......

جمال نقوی ایک کمٹیڈ، ہول ٹائم ادیب و شاعر ہیں۔ شعر و ادب ہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ترقی پسند ادب اور ترقی پسند تحریک ان کی فکر کا محور مرکز ہے۔ کئی دہائیوں سے کراچی میں رہ رہے ہیں۔ دنیا کے کئی ممالک کی سیر کر چکے ہیں لیکن اچھی بات یہ ہے کہ ان کے اندر کی لکھنوی تہذیب ابھی بھی زندہ ہے ان کے اخلاقی و تہذیبی رویوں میں ان کے علمی و ادبی نظریوں میں بھی۔ فی زمانہ اب اسے فضول کی شے سمجھا جانے لگا ہے لیکن یہ جمال نقوی کی فکر و فطرت میں شامل ہو گیا ہے۔ مابعد جدیدیت اور صارفیت کے اس ماحول میں جہاں سب کچھ سود و زیاں کے حوالے ہو گیا ہے۔ انسانیت صارفیت کا شکار ہو گئی ہے ایسے میں جمال نقوی جیسے شخص و شاعر ادیب و ناقد کا دم غنیمت ہے کہ وہ مسلسل بے غرض، بے لوث شعر و ادب کی خدمت کرتے چلے جا رہے ہیں۔ میں ان کے اس خلوص، محبت اور محنت کی قدر کرتا ہوں اور انہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

......پروفیسر علی احمد فاطمی

اشاعت: ۲۰۱۵ء، قیمت: ۲۰۰، دستیابی: ادارہ تزئین دانش، کراچی۔

...... چھیڑ چھاڑ ......

میری دانست میں ایک اچھا مزاحیہ شعر وہ ہے جس میں حسنِ خیال بھی ہو، حسنِ بیاں بھی ہو اور ''جوازِ مسکان'' بھی ہو۔ جبران صاحب بنیادی طور پر سنجیدہ اور پختہ شاعر ہیں۔ چناں چہ جب ان کے کلام میں فنی پختگی کے ساتھ ساتھ شگفتگی کا عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے تو پھر ایک ایسا اسلوب ابھرتا ہے جو اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔۔۔۔عزیز جبران انصاری کی شاعری کی بنیاد کھوکھلے قہقہوں پر نہیں بلکہ سماج کے سُلگتے ہوئے مسائل پر ہے۔ جبھی ان کے ہاں مزاح سے زیادہ طنز کا عنصر نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ متبسم نظموں، نمکین غزلوں اور چونکا دینے والے قطعات پر مشتمل یہ ایک ایسی کتاب ہے جس نے فکاہی ادب کے خزینے کو مزید ثروت مند کر دیا ہے۔

......ایس ایم معین قریشی

اشاعت: ۲۰۱۶ء، قیمت: ۵۰۰ روپے، دستیابی: جبران اشاعت گھر، اردو بازار، کراچی۔

زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
SAARC Painting Exhibition